

شکریہ

شازیہ چوہدری



3	ٹکے دامتاشا	- 1
33	خوبصورت غلطی	- 2
67	تمہیں اپنا بنالیں	- 3
101	لو بہار آگئی	- 4
137	آگئے ہیں نکھار کے موسم	- 5
173	زندگی سوز و محبت کے سوا	- 6
215	کچھ رنگ نئے ہیں	- 7



ٹکے دامتاشا

آج اتنے طویل سالوں میں مددِ رخ اس طرح روئی تھی۔

نہ کوئی داویا، نہ دہائی۔

نہ ہی پلو پھیلا پھیلا کر بدعائیں

نہ اپنا ”صبر“ پڑنے کی نوید

آج تو سر پہ دوپٹہ بھی نہ بندھا تھا۔۔۔

روئی بھی باقاعدہ آنسوؤں کے ساتھ تھی ورنہ اس سے پہلے وہ رو تو رہی ہوتی لیکن چند ہی آنسو

نکل آنکھوں سے نکل کر چہرے کا رخ کرتے۔ جس کا سہ باب وہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر بہ خوبی کر لیتی تھی۔

یہ آج تو آنسوؤں کا سیل رواں تھا جو ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

شدت گرہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ گلابی چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ گزشتہ دو گھنٹوں سے ایک

انداز میں ٹپٹی، گرد و پیش سے بے خبر روئے جا رہی تھی۔

آج اسے کسی دکھاوے کی ضرورت نہ تھی، ورنہ مددِ رخ، ونا، اس کے بین، اس کا چلانا ایسا ہوتا

کہ اس پاس کی عورتیں، ہمیشہ ہی بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتی تھیں پر آج۔۔۔۔



بارہ سالہ ذیشان، سات سال کی صبا اور دو ماہ کی حنا۔ زندگی کتنی مکمل اور بھرپور لگ رہی تھی۔ آہستہ

ی سے بہاروں کی جانب جاتی ہوئی، ابھی کل ہی تو ظہیر حنا کو گود میں اٹھائے کہہ رہے تھے۔

”میری بیٹی بہت خوش قسمت ہے۔ جب سے آئی ہے۔ گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔ میری

تین سالوں کی رکی ہوئی ترتی ہو گئی۔ مکان کا مقدمہ بھی ہم جیت گئے۔“ وہ کتنی محبت بھری نظروں سے

ماننے سے وجود کو دیکھ رہے تھے۔

”رقیہ! بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ اب ان دو کمروں میں گزارا نہیں ہوگا۔“ وہ اب رقیہ کی طرف

بہہ تھے۔ ”ان گرمیوں میں آگے بیٹھک بنوا لیتے ہیں۔“ رقیہ کا جواب سنے بغیر وہ دوبارہ حنا کی طرف

بہہ ہو گئے تھے۔ تب تقدیر نزدیک ہی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

خالہ نے صبح اٹھ کر ذیشان اور صبا کو اسکول بھیج دیا۔ خود سبزی لینے چلی گئیں۔ واپس آئیں تو رات وہیں بیٹھی تھی۔ آنسوؤں کے مٹے مٹے نشان اس کے سانولے، کمزور سے چہرے پہ بہت نمایاں تھے۔ ایک خانماں برباد عورت کی مکمل تصویر لگ رہی تھیں۔ ان کا دل دہل سا گیا۔

”حد ہوگئی رقیہ! تم نے ابھی گھر تک سیٹھا شروع نہیں کیا اور دوپہر سر پر آگئی ہے۔“ ان کے ناراضے انداز پر رقیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کو کام میں مصروف کر کے وہ گھر چلی آئیں۔

آج ظہیر کا دسواں تھا۔ دن بھی اتنے طویل بھی ہو سکتے ہیں۔ رقیہ کو اندازہ نہ تھا۔ بیٹی کے کٹم شب و روز بھی اس نے گزارے تھے۔ لیکن ماں باپ اتنی کم سنی میں گزر گئے تھے کہ ان کی ٹھنڈی چھاؤ کا کچھ احساس نہ تھا۔ یہ یہاں تو چودہ سالہ رفاقت پل بھر میں ٹوٹ گئی تھی۔ ظہیر تو اس کی ذات کے موسم کا سا بھی تھا۔ بن گئے اس کے دل کی بات جاننے والا۔ وہ پہاڑ کی طرح کسی موسم کی سختی، زندگی کی کوئی شدت اس تک آنے ہی نہ دیتا تھا۔ وہ تو یہی سمجھ بیٹھی تھی کہ بس یوں ہی بہاروں کے سبک سنگ زندگی گزر جائے گی۔

دسویں کے بعد ظہیر کے آفس کے ایم۔ ڈی نے ذیشان کو پچاس ہزار کا چیک دیا جو کہ اس کے ساتھیوں نے اپنی مدد آپ کے تحت جمع کیے تھے اور عدت کے دوران ظہیر کی پوری تنخواہ دینے کا وعدہ کیا تھا اور بیس ہزار فرم نے اپنی طرف سے دیے تھے۔

اس رات بچوں کو سنانے کے بعد خالہ، رقیہ سے پوچھنے لگیں۔ ”اب کیا سوچا ہے زندگی کس طرح گزارنی ہے؟“

”خالہ! مجھے تو خود اس سوال کا جواب نہیں معلوم، میں خود سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی ہوں۔“ رقیہ آنسوؤں کے درمیان بولی۔

”بیٹا! ایک تو ان آنسوؤں کو اب آنکھوں کے اندر ہی ختم کر ڈالو۔ تمہارا سفر بہت مشکل ہے۔ سب کا نئے ہی کا نئے ہیں۔ تمہاری ہمت تمہاری زاد راہ ہے۔ جس سے تم نے اپنے مشکل تر سفر کو آسار کرنا ہے۔“ خالہ اب نیکی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھیں۔

”رقیہ! اس وقت تو تمہارے پاس رقم ہے پر اگر بیٹھ کر کھاؤ گی تو سال بھر بھی نہ چلیں گے۔ تعبہ تمہاری اتنی نہیں کہ کوئی ڈھنگ کی نوکری مل سکے پھر۔۔۔؟“ اب وہ رقیہ کی طرف متوجہ تھیں۔

”خالہ! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں اب گھر بیٹھ کر نہیں آ سکتی۔ لیکن ان الجھے ہوئے حالات کا کوئی سرا بھی ہاتھ نہیں لگ رہا۔ آپ کوئی مشورہ دیں۔“ رقیہ۔

سارا بوجھ خالہ پر ڈال دیا۔

”رقیہ بیٹا! پچھلے مگلے کی کچھ عورتیں بوتیک وغیرہ کے لیے کڑھائی اور سلائی کا کام کرتی ہیں معاوضہ بھی مناسب ہے۔ یہ دونوں ہنر تمہارے پاس ہیں۔ میں تمہیں کام لا دیا کروں گی۔ مجھے تو اس کے علاوہ اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آگے تمہاری مرضی۔“

”نہیں خالہ! مرضی والی عیاشی اب میری زندگی میں نہیں رہی۔ اب تو مجبوری ہے۔ آپ کل یہ کام مجھے لا دیں۔“ اور یوں تھوڑے دن بعد زندگی کی گاڑی چلنا شروع ہوگئی۔

شروع میں تو ہر ٹانگے پر ظہیر کی یاد آتی۔ دھاگوں کے رنگ ان ہی بہاروں میں لے جاتے۔

ابھیں گویا دھندلی ہی رہتیں۔ گھر میں بچوں کی مدھری چکار گونجا کرتی تھی پر اب ایک سانے کا راج آیا۔ خاموشی صرف حنا کے رونے کی آواز سے ٹوٹی۔ رقیہ سوچتی کہ ایک ظہیر کے جانے سے جیسے ”رعنائی“ ل، ہی زندگی میں نہ رہی ہو۔

صبا ہر شام اس جھولے کے پاس کھڑی ہو کر اس پر کتنی کتنی دیر ہاتھ پھیرتی رہتی مگر جھولا نہ جھولتی۔ عی جو رقیہ کہہ دیتی ”شان! بہن! جھولا جھلاؤ“ تو وہ بڑی شدت سے منع کرتی۔ پتا نہیں وہ جھولا اس دلی سی بچی کے لیے کتنی نا تمام خواہشوں اور وعدوں کا عکس بن گیا تھا۔

☆☆☆

چار ماہ بعد عدت ختم ہوگئی تو وہ خالہ کے ساتھ خود جا کر آرڈر کا کام لینے لگی۔ وہ اب کچھ حوصلہ کر رہی تھی۔ اس کو خالہ کا ساتھ بڑا غنیمت لگا کرتا تھا۔ وہ ان پر بوجھ نہ بننا چاہتی تھی مبادا خالہ اکتاہٹ نہ لیں۔

لیکن روز و شب کی اس مصروفیت میں اس کے پاس بچوں کے لیے وقت نہ رہتا۔ وہ منتظر رہتے کہ ب امی ہمارے پاس آ کر سوئیں گی۔ ہمیں کوئی کہانی سنائیں گی، ہم سے پوچھ کر کوئی اچھا سا کھانا منیں گی، یا پڑھائی میں کوئی مدد کریں گی لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوتا۔ وہ اسکول سے آتے تو رقیہ ان کا کھانا کر بوتیک جانے کو تیار ہوتی۔ ننھی حنا کو ان کے حوالے کرتی اور کپڑوں کا ڈھیر اٹھا کر چلی جاتی۔ وہ بون کھانا کھا کر برتن بھی دھو لیتے۔ بھی حنا کے ساتھ کھینچ لگ جاتے یا سو جاتے۔

رقیہ اکثر واپسی پر ہی گھر کا دروازہ کا سودا سلف بھی لے آتی۔ واپسی پر وہ اتنی تھکی ہوئی ہوتی کہ تے ہی سو جاتی۔ شام کو دوبارہ سلائی یا کڑھائی۔

جن بچوں کے لیے وہ دن رات محنت کر رہی تھی۔ ان پر ایک پیار بھری نظر ڈالنے کی، ان کے ماتھے بوسہ دینے کی فرصت عموماً اس وقت ملتی جب وہ سو چکے ہوتے۔ وہ ان کے کمزور ہوتے وجود، کملائے دئے چہرے دیکھتی تو بول جاتی۔ لیکن حالات کا گرداب جیسے اس کو گھماتے جا رہا تھا۔

”خالہ! میں کیا کروں۔ بچے بہت سہرے رہتے ہیں۔ باپ ویسے ہی خدا نے بلا لیا اور ماں سے جیتے محروم ہو گئے۔“ وہ سسک پڑی۔

”رقیہ بیٹے! میں آج یہی بات تم سے کرنے آئی تھی۔ ظاہر کہہ رہا تھا کہ اگر بھابھی گھر میں کاپیاں ملیں وغیرہ رکھ لیں۔ میں اردو بازار سے لا دیا کروں گا۔ اس میں بہت بچت ہے۔“

رقیہ نے انگلی ذن خالہ کو دس ہزار روپے بینک سے نکلوا کر دے دیے۔ ظاہر جب اسٹیشنری لے کر یا تو رقیہ اتنا ڈھیر دیکھ کر رول ہی گئی۔

”یا اللہ! میں کیوں کر بیچ پاؤں گی۔ میرے تو دس ہزار بھی گئے۔“ وہ یوں بھی بہت جلد ہمت رنے لگی تھی۔

”بھابھی! ادھر آئیں۔ ان کی قیمت سمجھ لیں۔“ ظاہر کی آواز پر وہ مرے مرے قدموں سے چلتے وئے آگے آئی۔ لیکن رقیہ کے وہ اندیشے، وہ سب خام خیال ہی رہے۔

ارد گرد پر جون کی دکانیں تو تھیں۔ اسٹیشنری کی نہیں۔ کچھ درمیانے طبقے کی اس آبادی میں خوف ندابھی موجود تھا۔ کہیں اور سے خریدنے کے بجائے رقیہ کو ترجیح دیتے۔

دوبہ بعد نئے تعلیمی سال کے شروع ہونے سے پہلے اس کو طاہر نے نزدیکی اسکولوں کے نصیب کے سبب لاویے تھے یہ کام رقیہ کی توقعات کے برعکس منافع بخش تھا۔ اب وہ سلائی کڑھائی کا کام بیچر کے اسکول جانے کے بعد ہی کرتی۔ بعد کا سارا وقت بچوں کے لیے تھا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں وہ دلچسپی لیتی۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر دیکھتی۔ وہ ظہیر کی کمی تو پوری نہیں کر سکتی تھی لیکن اس کی شدت کو کم کرنے کی ضرورت کو محسوس کرتی۔

زندگی قدرے ٹھہرے ہوئے انداز میں آگے بڑھنے لگی۔ رقیہ چونک گئی جب چھوٹی سی حناؤں کلاس میں آگئی۔ کتنا وقت گزر گیا۔ ابھی کل کی بات تھی جب وہ ظہیر اس آئین میں اپنے بچوں کو بڑا ہوتے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کتنے خواب مشترک تھے۔ وہ سال خوردہ سا چھوٹا، شکستہ سا اب بھی نیم پر لٹک رہا تھا۔ جس پر صبا دوبارہ کبھی نہیں بیٹھی۔ ہر اس کو چھو کر محسوس کرتی رہی۔ بارہ سالہ صبا کو وہ شفیق سا وجود، اب بھی اپنی تمام تر نرمیوں کے ساتھ دھندلا دھندلا سیایا ہوا تھا۔ اور اس سے کیا وہ نا تمام وعدہ۔ وہ بہت عرصہ اس شام کا انتظار کرتی رہی جس کا وعدہ اس کے ابو نے کیا تھا۔

ایک روز جب پیچھے اس کو لے کر نکلتے ہیں، وہ دوبارہ کبھی واپس نہیں آتے تو اس کا تنہا سا دل جیسے ڈوب سا گیا تھا۔ ”پیچھے! اگر انہوں نے کوئی وعدہ کیا ہو۔ اس کو پورا کرنے کے لیے بھی نہیں۔“ اس نے قدرے شکستگی کے عالم میں پوچھا تھا۔

”نہیں بیٹا!“ پیچھے اس کو ترحم آمیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”بہادر بچے کسی وعدے کا انتظار نہیں کرتے۔“

تب صبا بہت کوشش کے باوجود پیچھے کو بتا نہیں سکی کہ وہ تو بہت بزدل ہے۔ کتنے ہی آنسو اس کے اندر گرتے رہے۔ اسکول کا وہ دن اس کو بہت طویل لگا تھا۔ گھر آ کر وہ بہت روئی تھی۔ اسی طرح روتے روتے سو گئی۔ رقیہ کے بہت پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہ بتایا۔

شام تک اس کو تیز بخار چڑھ چکا تھا۔ حنا اس گھر کی رونق تھی۔ ہنسی مسکراتی ماں کی لاڈلی اور بھائی بہن کی پیاری۔ اس کی شرارتوں سے ان کے گھر کا سناٹا ٹوٹا۔ اس کی ہنسی کی جلتنگ سے اس اداس سے گھر میں زندگی کا نغمہ گونجتا۔ زندگی کے گرم سر دیکھتے۔ یہ چھوٹا سا گھر ان اب قدرے آسانیوں کی طرف آ گیا تھا۔ ایم۔ کام کرنے کے بعد فیضان کو بینک میں اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ یہ بھی اس کو سلیمہ خالہ کے بیٹے طاہر کی کوششوں سے ملی تھی۔

رقیہ اکثر سوچتی کہ اللہ نے سلیمہ خالہ کو اس لیے رحمت کا فرشتہ بنا دیا۔ زندگی کی جدوجہد میں ان کا وجود اس کے لیے ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ رہا۔ ہر کڑے وقت میں وہ اس کے ساتھ رہیں۔

جب وہ ہمت ہارتی تو سب سے پہلا ہاتھ جو اس کو مایوسی کی دلدل سے نکالنے آگے بڑھتا وہ ان ہی کا ہوتا۔

جس روز وہ رکشے میں زبردستی بٹھائی گئی تھی۔ اس روز اس نے گہرے جامنی اور زرد رنگ کا

ڈیٹان اب پچیس سال کا ہو چکا تھا۔ صاوشیا لوجی میں ماسٹرز کر رہی تھی اور حنا آٹھویں میں تھی ڈیٹان نے ملازمت ملتے ہی اپنی ماں سے سلائی کا کام بند کرنے کی درخواست کی تھی۔ رقیہ کے بالوں میں چاندی اتر آئی تھی، کل کی وہ لڑکی ایک بھاری بھر کم عورت کے روپ میں ڈھل چکی تھی ان میں اب خود بھی ہمت نہ تھی۔ زندگی کا سفر تنہا کوٹا کوٹا آسان کام نہ تھا۔ اس واڈی پُر خار نے ان کے روم روم کو تھکا ڈالا تھا۔ وہ بھی اب سستانا چاہتی تھیں۔

”خالہ! صبا کے ماسٹرز کرنے میں ابھی ڈیڑھ سال باقی ہے۔ میں ڈیٹان کی شادی کا سوچ رہی ہوں۔ مدت ہو گئی ہے ہمارے گھر سے خوشی کو رخصت ہوئے۔ شانی کی شادی سے ہمارے گھر میں بھی رونق ہو جائے گی۔“

یوں سلیمہ خالہ اور رقیہ ڈیٹان کے لیے اچھی لڑکی کی تلاش میں مدرخ کے گھر جا پہنچیں۔ مدرخ چاروں بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ خوب صورتی وہ بھی اتنی افراط میں۔ ہر بہن سراپا غزل۔ خود مدرخ سرقد، سبیل بدن، غنچہ وہن، خوب صورتی کے ہر استعارے پر پورا تری، وہ تو گویا رقیہ کے دل میں ہی بس گئی۔ خالہ کو البتہ اس گھرانے کے رنگ ڈھنگ اچھے نہ لگے۔

”اے لو۔ پتا بھی تھا، ہمارے آنے کا پر سارا سامان بازاری اور وہ بھی ٹھنڈا اٹھا۔“

”خالہ! یہ تو کوئی نقص نہ ہوا۔“

”اور جو میں بہانے سے ذرا گھر کے اندر گئی۔ تو بہت توبہ باورچی خانے میں ابھی تک ناشتے کے برتن بھی سڑ رہے تھے۔ کوڑے کی ٹوکری تو جیسے ابل رہی تھی۔ سارا گھر اوندھا پڑا تھا اور ماں بیٹیاں کیسے جگر جگر کر رہی تھیں۔ رقیہ بیٹا! اپنے ڈیٹان میں بھلائی کیا ہے۔ بانکا بھلا، کماد، میری ماں کوئی اور گھر دیکھ لیں گے۔“ خالہ گھر جانے کو اٹھ کھڑی ہوئیں۔

رقیہ یہ احوال سن کر کچھ مذہب میں پڑ گئی تھیں لیکن مدرخ کی بھولی بھالی، شوخ سی صورت دل سے نکل نہ رہی تھی۔ رقیہ کو لگ رہا تھا کہ مدرخ کے آجانے سے ان کے سنجیدہ سے بیٹے کی زندگی میں بہار آجائے گی۔ ان کا گھر سرج جائے گا۔

صبا اور حنا بھی بہت پرجوش تھیں۔ ایک طویل مدت بعد خوشی کی لہر ان کی زندگی میں دوڑ گئی تھی۔ ڈیٹان البتہ بہنوں سے پہلے اپنی شادی کے حق میں نہ تھا لیکن رقیہ نے اس کا ہر اعتراض مسترد کر دیا تھا۔ مدرخ کے سلسلے میں خالہ نے دوبارہ بھی رقیہ کو روکا لیکن مدرخ جیسے رقیہ کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ ایک شام وہ خالہ کو دوبارہ ساتھ لے کر رشتے کے لیے ہاں کرائیں۔

چند دن بعد ساوہی تقریب میں انہوں نے مدرخ کو ڈیٹان کے نام کی انگوٹھی پہنا دی۔ منگنی کے بعد تو ان لوگوں کی آمدورفت ایسے بڑھی کہ یہ لوگ بوکھلا ہی گئے۔ عموما نو بجے ہی آجاتے اور رات کا کھانا کھا کر واپس ہوتی مدرخ بھی اکثر ہی ساتھ ہوتی۔

”یہ تو مان ہی نہیں رہی تھی۔ زبردستی ساتھ لائی ہوں۔ چلتے چلتے ہاتھ پکڑ کر رکشے میں بٹھایا ہے۔“ صبا کو اکثر ان لوگوں کی وجہ سے یونیورسٹی سے چھٹی کرنا پڑتی۔ مدرخ کے آنے میں اس کو بھی زبردستی کا عنصر تو لگا ہی نہ تھا، بلکہ اس کے خیال میں تو وہ ذوق و شوق اور رغبت سے آتی تھی۔ جس روز وہ رکشے میں زبردستی بٹھائی گئی تھی۔ اس روز اس نے گہرے جامنی اور زرد رنگ کا

نہایت شوخ سوٹ پہن رکھا تھا۔ جوتوں میں بھی یہی دورنگ نمایاں تھے۔ کانوں میں جامنی رنگ کے آویزے اور بالوں میں زرد کلپ۔

”اس گرمی میں کمال ہمت ہے بھابھی نے اس طرح کی ڈرینگ کر رکھی ہے۔“ اس سے آگے کچھ اور سوچ نہ سکی۔ کمال یہ تھا کہ بہنوں میں سے کوئی تکلفاً بچن میں آکر جھانکتا بھی نہ تھا۔ پانی پی کر کسی بھی نزدیک جگہ گلاس رکھ دیتیں جیسے کسی پینک اسپاٹ پر آئی ہوں اور پھر از خود ہی مینو بھی بتا دیا جاتا۔

”بھئی۔ سبزی اکیلے مزائیں دیتی۔ کپڑوں میں ڈر اساقیہ بھون لیں بہن۔“

”آئی! اس روز آپ نے پودے کی چٹنی بہت اچھی بنائی تھی۔ آج بھی بنالیں۔“

اس بار وہ آئین تو صابون روٹی جا چکی تھی۔ رقیہ نے پہلے تو ٹھنڈے سے ان کی خاطر کی۔ پھر چائے اور بسکٹ وغیرہ بھی رکھ دیے۔ اب وہ سب فراغت سے بیٹھی تھیں۔ رقیہ سوچ رہی تھیں کہ کیا کریں۔ فریج میں آلو ٹیگن رکھے تھے۔ صبا کہہ کر گئی تھی کہ میں شام کو پکالوں گی۔ آپ آج آرام ہی کیجیے گا۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اب کیا کریں۔ آخر سوچ کر قیہ چڑھایا اور ساتھ ہی چاول چنے لگیں۔

دودن سے بخار تھا جس کی وجہ سے کچھ کمزوری سی محسوس ہو رہی تھی مہر رخ وغیرہ کو بتا بھی دیا تھا لیکن کوئی بچن میں آکر کھڑا بھی نہ ہوا۔ وہ چاول دم دے کر فارغ ہوئی تھی جب حنا اسکول سے آئی۔

یہ منظر دیکھ کر اس کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ ویسے بھی صبا اور ذیشان سے بالکل مختلف تھی۔ ماں کو اس نے زبردستی دوسرے کمرے میں لٹا دیا۔ خود سلا کاٹنے لگی۔ راستہ بنا کر مہر رخ کی چھوٹی بہن کو آواز دی۔

”سینین! ڈرا پلیر روٹی ڈال دو۔ مجھ میں تو اب ہمت نہیں ہے۔“

”اور آئی؟“

”ان کو دوبارہ بخار چڑھ گیا تھا۔ دوائی دے کر لٹایا ہے۔“

”لیکن مجھے تو روٹی پکانی نہیں آتی۔“

”اس دن تو آئی کہہ رہی تھیں کہ میری تو چاروں بیٹیاں ایسی روٹی پکاتی ہیں کہ جو دیکھتا ہے، وہ بس عیش عیش ہی کر اٹھتا ہے۔“

”ای تو بس۔“ سینین نے دانت کچکائے۔

اس گھرانے کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر رقیہ اب جی ہی جی میں ہولا کرتیں۔ کبھی دل میں آتا کہ یہ رشتہ ہی ختم کر ڈالیں۔ پر یہ شریفوں کا شیوہ نہ لگتا۔

آج کل گھر میں بھی کام شروع کر دیا ہوا تھا۔ مستری مزدور لگے تو گویا آسیب کی طرح چٹ ہی گئے۔ قریباً ڈیڑھ ماہ بعد کام مکمل ہوا تو صاف ستھرا گھر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ رقیہ کو ظہیر کی بات یاد آ رہی تھی۔ ان کی کتنی خواہش تھی گھر میں کنسرکشن کروانے کی۔

رقیہ نے بولے ہوئے شادی کی تیاری شروع کر دی تھی جب ایک ملازمہ رخ کا فون آیا۔

”آئی! بری کے کپڑے خریدنے جایا کریں تو مجھے ساتھ لے لیا کریں۔ اصل میں میری سلیکشن بہت اچھی ہے۔“ رقیہ نے صبا کو بتایا وہ بھی حیران ہو گئی۔

”ای پلیر! آپ بھابھی سے کہہ دیں۔ اپنی سلیکشن کے ہنر وہ جہیز کے کپڑوں پر آزمائیں۔ ہم نے بیٹی بکری نہیں بنوائی۔“ حنا غصے میں بولی تھی۔

خالہ کے مشورے پر انہوں نے مہر رخ کی والدہ سے کہہ دیا تھا کہ ہمارے ہاں بری لڑکی کی مرضی سے نہیں خریدتے۔ ایسا رواج ہی نہیں ہے۔

ایسے ہی آہستہ آہستہ وہ سردشام بھی آگئی جب مہر رخ ان کے آنگن میں دلہن بن کر اتری۔ خوشی، مسرت، نے بہت عرصے بعد ان کے گھر پہ دستک دی تھی۔ مہر رخ پر دلہن بن کر ایسا روپ آیا تھا کہ ہر ایک کی نگاہ میں ستائش تھی۔ سب ہی رقیہ کے انتخاب کو سراہ رہے تھے۔ ذیشان پہلی بار اس قدر خوش تھا۔ صبا اور حنا کے تو پاؤں زمین پر نہ پڑ رہے تھے۔ رقیہ بھی بہت خوش تھیں لیکن ظہیر کی یاد ان کو پریشان کیے ہوئے تھی۔

”آج اگر ظہیر بھی ہوتے تو کتنی مکمل خوش ہوتی وہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنا خوش ہوتے تھے۔ یہ تو ان کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوتی۔“ دھوپ چھاؤں کے اس امتزاج میں شادی، ولیمہ سب کچھ ہو گیا۔ شادی کا پہلا ہفتہ گزر گیا۔

مہر رخ بنی مون پر سنگاپور جانا چاہتی تھی۔ ذیشان حیران ہی رہ گیا۔

”مہر رخ! میں اتنا مہنگا ٹرپ کیسے انورڈ کر سکتا ہوں۔“

ذیشان کا یہ کہنا قیامت ہو گیا۔ مہر رخ جو بولنا شروع ہوئی تو چپ ہی نہ ہوئی۔ اپنے بڑے نصیبوں کو کوسا گیا۔ اپنی ماں کے لئے لیے جنہوں نے مل انورڈ کے رشتے مستر ذکر کے ذیشان جیسے ٹٹ پونچے کو پسند کر لیا۔ اب وہ بلند آواز سے رو رہی تھی۔ ذیشان افتاں و خیراں کھڑا کھڑا ہی رہ گیا۔ اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ وہ کبھی ایسے سین کا حصہ ہوگا۔ اب تک اس کا واسطہ جن خواتین سے پڑا تھا، ان میں کوئی بھی اس فطرت کی نہ تھی۔ اس نے سہولت سے مہر رخ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کو اب کچھ سناٹی نہ دے رہا تھا۔

ادھر وہ تینوں ماں بیٹیاں بھی پریشان تھیں۔ ان کے اوسان خطا ہوئے جارہے تھے۔ ان کے گھر میں پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ وہ تو سب ایک دوسرے سے بڑی نرمی اور سہولت سے بات چیت کرتے تھے۔ لڑائی کی تو کبھی نوبت ہی نہ آئی تھی۔

”امی! آپ بتا کریں۔ آخر کیا وجہ ہے کہیں بھائی نے تو کچھ کہہ نہیں دیا۔“

رقیہ کے تو اپنے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ مہر رخ نے قدموں سے گئیں۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ دستک دے کر اندر جانا ہی غضب ہو گیا۔ مہر رخ کی بکاس کارخ ان کی سمت ہو گیا۔

”کھا گئیں ماں بیٹیاں سب کچھ۔ اللہ کی مار ہو ان سب پر۔ اس وقت تو بڑی بینک نیجر کی ماں بنتی تھیں۔“ وہ اب رقیہ کو کوس رہی تھی۔ ذیشان کمرے سے جا چکا تھا۔

☆☆☆

اللہ اپنے بندوں کو ہر طرح سے آزماتا ہے۔ وہ کبھی کبھی اپنے بندوں کی آزمائش، مہر رخ کے ذریعے اللہ نے ان کو آزمایا تھا۔ ان کے صبر کو، ان کے ظرف کو، ان کے شکر کو۔ یہ تو بس اس آزمائش کی شروعات تھیں۔ ایک کے بعد دوسرا ڈرامہ۔ جس میں کبھی مہر رخ اکیلے ہوتی۔ کبھی اس کی مدد کے لیے اس کی ماں بہنیں موجود ہوتیں۔ ہاتھ مل کے پچھتاوے کا اظہار ہوتا کہ ہم نے تو صرف شرافت دیکھ کر ان کا لے پیلوں کو اپنی پھول جیسی بیٹی دے دی تھی پر دھوکا کھا گئے۔

صبا نے اسی تناؤ میں اپنے پیروں پر رقیہ نے اسٹیشنری کا کام دوبارہ شروع کر دیا تھا۔
 ”ماں بیٹیاں کھا گئیں مل کے، کسی کو ترس نہیں آتا کیلی جان پر۔“ یہ مددِ رخ کے مخصوص جملے تھے۔
 ویسے وہ شدید تھکن اور کمزوری نہ کہیں درد کی مرید تھی لیکن شائیک ایک ایسا جادوئی لفظ تھا جس
 سنتے ہی مددِ رخ لمحوں میں ہر بیماری بھول کر، لپک بھپک بازار سدھاری۔
 صبا کا دزلٹ آیا تو اس کی فرسٹ پوزیشن تھی۔
 ”بھئی ہم سے تو نہیں ہوتی ایسی پڑھائی نہ رنگ رہے نہ روپ۔“ یہ مددِ رخ کا اس کے رزلٹ پر
 تبصرہ تھا۔

صبا نے کئی جگہ ایلٹائی کیا ہوا تھا۔ شاندار تعلیمی ریکارڈ کی وجہ سے چند ماہ بعد ہی لیکچر رشپ مل گئی۔ یہ
 خیران سب کے لیے ان ٹھکن آلود فضا میں جیسے تازہ ہوا کا جھونکا تھا۔
 زندگی کے اس گھاؤ نے رقیہ کو بہت کم زور اور کم ہمت کر دیا تھا۔ ذیشان کو دیکھ کر اور بھی ہوا
 کرتیں۔ سدا کا سنجیدہ شانی اب ایک پریشان حال آدمی تھا۔ رقیہ نے بارہا اس کو علیحدہ گھر لینے کے لیے
 کہا تھا۔
 ”امی پلیز، میری بد قسمتی پر مہر نہ لگائیں۔ بڑھاپے میں آپ کو اور دو جوان بہنوں کو تنہا چھوڑ
 جاؤں، میری آخرت بھی خراب ہو جائے گی۔“ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ کہتا تو رقیہ پر چہرہ بدلتی۔
 ویسے بھی مددِ رخ کو شوہر کی کسی ذمہ داری سے کوئی غرض نہ تھی۔ اس کے تمام کام ابھی صبا اور حنا
 ہی کرتی تھیں۔

حنابھی اب فرسٹ ایئر میں تھی۔ رقیہ کا کتنا دل چاہتا تھا، اپنے پوتا پوتی گودوں کھلانے کو، پر وہاں
 کوئی آثار نہ تھے۔ نہ ہی ان میں ہمت تھی پوچھنے کی۔
 ان دنوں جب ذیشان اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کر چکا تھا۔ تقدیر ایک بار پھر اس پر
 مسکرا دی۔
 مددِ رخ نے اس کو ماں بننے کی نوید دی۔ ذیشان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوش ہو یا ماتم کرے۔
 یہ خبر سن کر اس نے طلاق کے کاغذات پھاڑ دیے۔ اس نے خود ہی سمجھتے ہوئے یہ خبر ماں کو دی کیونکہ اس کو
 معلوم تھا کہ مددِ رخ نے تو ایسا کوئی تکلف نہیں کرنا۔

☆☆☆

اس شام صبا کو دیکھنے کچھ لوگ آ رہے تھے۔ رقیہ کی کوئی جاننے والی یہ رشتہ لائی تھی۔ فیروز
 کڑھائی کے سوٹ میں صبا بہت اچھی لگ رہی تھی۔ لڑکے کی ماں اور بہنیں آئی تھیں۔
 سانولی سی صبا ان کو بہت پسند آئی تھی۔ جب بیل کی تیز آواز نے ان کو چونکا دیا۔ مددِ رخ کی ماں
 وراس کی چھوٹی بہن گل رخ تھیں۔

”بازار جانا تھا۔ سوچا مددِ رخ کو ساتھ لیتے چلیں۔“ وہ خود ہی صفائیاں دے رہی تھیں۔
 گل رخ نے سرخ اور سیاہ نیٹ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ کانوں میں سیاہ ٹکوں والی بالیاں اس کے
 سرخ و سفید چہرے پر خوب بیچ رہی تھیں۔ ایک ہاتھ میں سرخ اور دوسرے میں سیاہ جوڑیاں تھیں۔
 ”آئی! اگر آپ اتنی تیاری سے بازار جاتے ہیں تو شادی پہ تو غضب ہی ہوتا ہوگا۔“ حنا، سبز مومن

لائٹ کے سوٹ میں پھسی آئی سے کہہ رہی تھی۔
 ”اے! ہٹو! تمہارے تو میں منہ نہیں لگتی۔“ وہ واقعی حنا سے کتراتے تھیں۔ کچھ انہیں ڈرا بنگ روم
 میں پہنچنے کی جلدی تھی۔

ان کے قدم پڑنے کی دیر تھی جیسے ہر چیز بدل گئی، جیسے کسی پری نے اپنی جادوئی چھڑی گھما دی ہو۔
 ہنسی، مذاق، اونچے اونچے قہقہے، گل رخ کے ناز و انداز، جس کی ماں کا ان خواتین کے ساتھ بہنا پا، صبا
 بالکل پس منظر میں چلی گئی۔

اگلے ہفتے گل رخ کی اسی لڑکے سے ملگنی ہو گئی۔ ”ہیرا چھوڑ کر بھلا وہ کونکہ کیوں لیتے۔“ یہ مددِ رخ
 کا تبصرہ تھا جو اس نے صبا کے سامنے کیا تھا۔
 ”بھابھی! یہ ان کو بھی جلد پتا چل جائے گا کہ انہوں نے کونکہ چھوڑ کر کونکے کی پوری کان خرید لی
 ہے۔“ حنا چپ نہ رہ سکی۔

”اے! بالشت بھر کی چھو کری! اپنی حد میں رہا کر۔“ مددِ رخ تلملائی۔
 ”بھابھی! آپ بھی سن لیں۔ میں صبا نہیں ہوں۔ مجھے بگڑے ہوؤں کو ٹھیک کرنا بہت اچھی طرح
 آتا ہے۔“ حنا بے پناہ لڑائی کو شکر مارتے ہوئے گزرتی۔
 صبا کو بھی بھی حنا پر بہت رشک آتا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی اتنی ہی بہادر ہوتی کاش۔

☆☆☆

آج عکس اور نقش صبح سے ضد کر رہی تھیں کہ پایا کے ساتھ پارک جانا ہے، وادو کے ساتھ نہیں۔
 ذیشان پہلے تو ان کو ٹالتا رہا لیکن وہ نہ مانیں۔ آخر اپنی فائز بند کر کے وہ تیار ہو ہی گیا۔
 ”صبا!“ اس نے کایاں چپک کرٹی صبا کو آواز دی۔ ”چلو پارک تک چلتے ہیں۔“

صبا کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن ذیشان کو انکار بھی نہ کر سکی۔ دونوں بہن بھائی، بچپن کو لے کر چلے
 گئے۔ مددِ رخ کی سب سے چھوٹی بہن کی بیٹی کی سالگرہ تھی۔ وہ صبح سے وہیں گئی ہوئی تھی۔
 سلیمہ خالہ کو آتا دیکھ کر رقیہ ہولے سے مسکرا دیں۔

”رقیہ! اتنا وقت گزر گیا پر تمہاری بہو اور ان کی ماں کا کوئی شوق بھی کم نہ ہوا۔ ماشاء اللہ اب تو عکس
 بھی سات سال کی ہو گئی ہے پر نانی اماں کا الہڑپن برقرار ہے۔“
 رقیہ بس مسکرا دیں۔ ”خالہ! سدا بہار تو آپ بھی ہیں۔“
 ”حننا کا کوئی فون آیا؟“

”کل ہی آیا تھا۔ ٹھیک ہے، آپ کو سلام کہہ رہی تھی۔ خالہ سوچتی ہوں۔ صبا سے چھوٹی حنا، ایک
 بچے کی ماں بن گئی اور میری اتنے کنوں والی بیٹی، جانے کب اس کے مقدر کھلیں گے۔“

”رقیہ! اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ لیکن اپنی کسی جاننے والی کا ذکر کر رہی تھی۔ انشاء اللہ وہ
 لوگ اسی ہفتے آئیں گے۔“ خالہ کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئیں تو رقیہ وہیں بیٹھی اپنے خیالوں میں گم رہیں۔
 رخشندہ اپنے ڈاکٹر بھائی کا رشتہ حنا کے لیے لائی تھی۔ رخشندہ، حنا کی بچپن کی سہیلی تھی۔ پورا گھرانہ
 ہی بہت اچھا۔ ان لوگوں کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ مددِ رخ نے بہت زہرا لگا تھا۔

”نہ بھی۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تھا ”برڈھونڈنے کے لیے ہم سے تو نہیں جاتی دوستی۔“

”بھابھی! آپ کسی کو بھلا دوستی جیسا شرف بخش بھی کہاں سکتی ہیں۔“ حنا بھی تہیہ کر لیا تھا کہ مہ رخ کے آگے جب نہیں ہوتا۔

”اچھی پڑھائی ہے۔ ساتھ ساتھ خصم بھی ڈھونڈ لیا۔“

”عجوبہ! بھابھی! ہماری امی نے تو آپ کو ڈھونڈنے کے بعد توبہ کر لی ہے۔“

حنا کے لیے ایسا الزام بہت مشکل مرحلہ تھا۔ اس نے رقیہ کو انکار کرنے پر بہت زور دیا تھا لیکن صبا اور ذیشان نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔

عکس اور اس سے سال بھر چھوٹی نقش کی پیدائش پر رقیہ کا خیال تھا شاید بیٹیوں کی آمد مہ رخ کو بدل دے لیکن مہ رخ شاید ریت سے بنی ہوئی تھی اس پر کسی بات کا کسی نیکی کا کوئی اثر نہ تھا۔ جیسی خشک اور بخر تھی ویسی ہی رہی۔

عکس اور نقش اپنی ماں کی ہر خوب صورتی اپنے اندر سموئے ہوئے تھیں۔ نقش کی پیدائش پر شاید وہ پہلی بار اپنے رب کی شکر گزار ہوئی تھی کہ اس کی دونوں نیٹیاں دوھیال پر نہیں لگی تھیں۔

☆☆☆

جن لوگوں کا خالہ نے کہا تھا وہ اگلے ہی ہفتے آگئے۔ صباب اس نمائش پر یڈ سے تنگ آچکی تھی۔ لیکن ماں کو وہ انکار نہ کر سکی۔ ثاقب کے گھر والے اچھے لوگ تھے۔ شائستہ اور سنبھلے ہوئے لیکن وہاں سے ابھی تک مکمل خاموشی تھی۔

اس روز خالہ، ان کے گھر افناں و خیزاں داخل ہوئیں۔

”رقیہ تم تو بیٹی بھی رہو ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر۔ سب پتا لگا آئی ہوں۔ پوچھو اپنی بہو۔ سے، یہ ثاقب کے گھر کون سی آگ لگا کر آئی ہے۔ خدا کی مار ہو اس پر۔“ خالہ اب اونچا اونچا بول رہی تھیں۔ جو مہ رخ کی راجدھانی میں ممنوع تھا۔ (کسی اور کے لیے)

مہ رخ تن فن کرتی کمرے سے باہر نکلی۔ ”بہت برداشت کر لیا ہے بڑھیا تجھے، خبردار! جو میرے گھر قدم بھی رکھا۔ اپنے گھر کھانے کو نہیں ملتا۔“

خالہ کوئی جواب دینا ہی چاہتی تھیں جب رقیہ کے ہاتھ کے دباؤ نے ان کو خاموش کرادیا۔ سفید چہرے کے ساتھ رقیہ خطرناک حد تک بیمار لگ رہی تھیں۔

”مہ رخ ان لوگوں کا صبر تجھے لے ڈوے گا۔“ خالہ نے آنکلی سے کہا اور اٹھ آئیں۔

وقت کے قہال میں دن سکے بن کر گرتے رہے۔ شاہ خاور ہر روز اپنی روشنی سے دنیا کو منور کرتا۔ چاند ہر رات چپکے سے ان کے آگن میں جھانکتا، نیم پہ چڑیاں صبح شام ہر موسم میں اپنے رب کی شاخانی کرتیں۔

”کاش میری زندگی میں صبا اپنے گھر کی ہو جائے۔“ یہ رقیہ کی زندگی کی سب سے بڑی دعا بن گئی عکس اور نقش کے خوب صورت وجود میں صبا اور بھی دھندلا جاتی۔ وہ جاتے دسمبر کا کھراؤودون تھا صبح سے ایک بار بھی سورج کی کرنیں دھند کی دبیز چادر کو پار نہ کر سکی تھیں۔ رقیہ عصر پڑھ کر فارغ ہوئی

تھیں۔ سردی تھی کہ جوڑوں میں بیٹھی جا رہی تھی۔ صبا بچن میں چائے بنانے لگی تو رقیہ نے اس کو آواز دے کر پہلے ہیٹر جلانے کے لیے کہا اور پھر خود لحاف میں بیٹھ گئیں۔

ذیشان بینک کے کسی کام سے کراچی گیا ہوا تھا۔ اس نے کل شام واپس آنا تھا۔ مہ رخ اور بچیاں بھی اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی تھیں، انہوں نے بھی کل شام سے پہلے نہیں آنا تھا۔ تب ہی ڈور بیل کی تیز آواز نے جیسے ماحول کے ستارے کو توڑ دیا۔

”اللہ خیر کرے، اس کمر میں کون آگیا۔“ وہ چادر لپیٹ کر باہر آئیں صبا دروازہ کھول چکی تھی۔

☆☆☆

وجاہت عباس ابھی اٹھ کر گئے تھے کہ مہ رخ دوبارہ بولنا شروع ہو گئی تھی۔

”پہلے ساری عمر ماں بیٹیوں کو بٹھا کر کھلایا۔ اب ان کے ہوتے سوتوں کی بھی خدمتیں کر دو۔“ وہ جانے برتن دھو رہی تھی یا پتھر رہی تھی۔

”عکس، نقش! تمہارے ہاتھ تو نہیں ٹوٹے تم ہی ماں کا خیال کر لو۔“ مہ رخ کی زبان کسی کا لحاظ نہیں کرتی تھی۔

”امی پلیز! آپ نے برتن نہیں دھونے تو نہ دھوئیں یہ جاہلوں کی طرح واویلا تو نہ کریں۔ میری فریڈ ز آنے والی ہیں۔“ نقش تملاتے ہوئے اندر چلی گئی۔

عکس، نقش ہر لحاظ سے ماں کی کاپی تھیں۔ انہیں ماں سے زبان چلانے میں کوئی جھجک نہ تھی۔ البتہ اپنے باپ سے بہت محبت کرتی تھی۔

”پاپا! اگر آپ مسکرایا کریں تو بہت اچھے لگیں۔“ عکس اکثر کہتی تو ذیشان مسکرا دیتا۔

”نہیں ابو، آپ مسکراتے ہیں تو آپ کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔“

وہ دونوں اکثر کہتی تھیں ”ابو! زندگی آپ پر بہت نامہر بان رہی ہے۔“

اپنی دونوں پھوپھیوں اور دادی کا بھی لحاظ کر جاتی تھیں کچھ یہ بھی ان سے ہمیشہ ہی بڑی محبت سے پیش آتیں۔ حنا کے جو بھی اختلاف تھے وہ مہ رخ سے تھے۔ اپنی بیٹیوں میں تو اس کی جان تھی۔

اس کھراؤودون میں آنے والے مہمان، رقیہ کے لیے مژدہ جانفز اثابت ہوئے۔ اس روز صبا کی کو لیک شمرہ اپنے بھائی کے لیے صبا کا ہاتھ مانگنے آئی تھی۔ وجاہت عباس کی پہلی بیوی مٹے کی پیدائش پر زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔ جب تک دادی زندہ رہیں تو وجاہت کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن والدہ کے انتقال نے وجاہت کے لیے بہت سے مسائل کھڑے کر دیے تھے۔ وہ جس مسئلہ کو گزشتہ پانچ سال سے ٹال رہے تھے اب ٹالنا ممکن نہ رہا تھا۔ ان کی شخصیت اور دولت کی وجہ سے کئی گھر ان کے طالب تھے لیکن وجاہت ایسا رفق چاہتے تھے جو کہ عرو وجاہت کے لیے ماں بھی بن جائے۔

ایک سال اسی تنگ دود میں گزر گیا تھا۔ شمرہ کے لیے دو گھروں کی ذمہ داری سنبھالنا، نوکری کے ساتھ ساتھ نہایت مشکل تھا۔ بھائی کی اجازت زندگی بھی سامنے رہتی۔ تب ایک روز وہ بیٹھے بیٹھے چونک ہی پڑیں۔ صبا ان کی بڑی اچھی دوست تھی۔

”صبا! وہ کون سا محاورہ ہے بچہ نفل میں، ڈھنڈورا شہر میں۔“

صبا جو ابھی آکر بیٹھی تھی نا بچی کے عالم میں سر ہلا بیٹھی تھی۔

اگلے دن، سردی کی پردا کیے بغیر شمرہ صبا کے لیے دست طلب دراز کی پہنچ گئی تھی۔
رقیہ کے لیے تو یہ نوید بہاراں تھی۔ شمرہ کا گھر ان کا جانا پچھانا تھا۔ اس وقت تو شمرہ کو سوچ کر
جواب دینے کا کہہ دیا بعد کے مراحل بہت آسان تھے۔ شمرہ سے اس گھر کے حالات چھپے ہوئے نہ تھے۔
مدرخ سے سب کچھ چھپایا گیا تھا۔ بالائی بالا ڈیٹان نے سارے معاملات طے کر دیے تھے اور مدرخ
کو محض ایک ہفتے پہلے ہی شادی کا بتایا گیا۔

شمرہ نے جیز کے لیے بڑی شدت سے منع کیا تھا۔ لہذا صبا کو صرف زیورات کپڑے اور کیش
دیا گیا۔ مدرخ کو پہلے تو بہت تاڑ چڑھا لیکن ”دوہاجو“ سن کر کچھ ٹھنڈی پڑ گئی۔

”ہونہہ! ہوگا کوئی بڈھا، اس کا لی چیزیل کے لیے۔“ شادی کے دن پہلے تو شاندار بری اور بھاری
بھرم زیورات نے مدرخ کو پریشانی میں مبتلا کر دیا اور وجاہت عباس کو دیکھ کر تو مدرخ کے ضبط کا پیانا
لبریز ہو گیا۔

اونچے، لمبے سرخ و سفید وجاہت کہیں سے بھی ایک نیچے کے باپ نہ لگ رہے تھے۔
فیروزی لہنگے میں صبا آسمان سے اتری ہوئی حور لگ رہی تھی۔ مدرخ کا طرف اب مزید برداشت
کا تحمل نہ تھا۔

”بس بہت ہو گیا ڈیٹان! مجھے کسی نے صبح سے پانی بھی نہیں پوچھا۔“ مدرخ ڈیٹان پر برس
پڑی۔

”مدرخ! تمہارے گھر میں شادی ہے۔ تم خود میز بان ہو۔“

”میری ماں بہنوں کو کسی نے جو تے کی نوک پر نہیں رکھا۔“

”مدرخ! تم میز بان ہو۔ یہ تمہارا فرض تھا۔“ ڈیٹان رسائیت سے کہتے ہوئے آگے چلا آیا۔

مدرخ اسی وقت واپس گھر چلی آئی۔ اس نے عکس اور نقش کو البتہ نہیں کہا کیونکہ وہ اسی کی بیٹیاں
تھیں۔ منہ پھٹ اور بدتمیز۔ انہوں نے مدرخ کی ایک نہیں سنی تھی۔

رخصتی کے سسے، صبا خود تو روئی سب کو بھی رلا دیا۔

آج اس کو وہ مہربان سا وجود بہت یاد آیا تھا۔ جس کے نہ ہونے سے زندگی کے ساتھ ساتھ روح

بھی خار خار ہو گئی تھی۔ رقیہ البتہ ایک عجیب سی کیفیت میں تھیں۔ صبا کو وداع کر کے گویا وہ ظہیر کی نظروں

میں بھی سرخ رو ہوئی تھیں۔ ظہیر اگر ہوتے۔۔۔ تو شاید رقیہ کی ہر روز کی سوچ تھی۔

مدرخ، صبا کے دلیسے میں بھی نہ گئی تھی حالانکہ ڈیٹان اور رقیہ نے بہت اصرار کیا تھا۔

صبا کو بھابھی بنانے کا فیصلہ کتنا درست تھا۔ اس کا شمرہ کو تو خیر پہلے ہی سے احساس تھا۔ لیکن بہت

متاثر وجاہت اب اس قدر خوش تھے کہ خوشی ان کے روم روم سے ٹپکتی تھی۔ عمر قدرے بچکچا لیکن جلد ہی

صبا میں بچھڑی متانے اس کو بھی اسیر کر لیا۔

شادی کے دوسرے سال صبا کی گود میں علی آ گیا۔ بالکل عمر وجاہت جیسا۔۔۔

☆☆☆

عکس اور نقش کے رشتے بہت آتے تھے۔ عکس نور تھ ایز میں تھی جب عکس کے لیے خضر حیات کا
پروپوزل آیا۔

ایم۔ بی۔ اے۔۔۔ قابلیت کے ساتھ امپورٹ، ایکسپورٹ کا بزنس، بیوہ ماں اور ایک چھوٹی
بہن اور بھائی لیکن مدرخ کو اس فیملی کی جو چیز بہت اچھی لگی وہ تھے سب کے سانولے سلونے رنگ اور
رمیانی بی شخصیتیں۔ یہ لوگ میری عکس کے آگے اور بھی معمولی لگیں گے۔“ یہ مدرخ کے ذہن میں آنے والی پہلی
سوچ تھی۔ ”جیسے میری سسرال نے میرا دم بھرا دیسے ہی یہ لوگ عکس کا بھریں گے۔“
وہ لوگ تو پیام دے کر چلے گئے تھے لیکن مدرخ ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھی۔
ٹاٹ میں ٹٹل کا پیوند اگر لگے تو ٹاٹ اور بھی کم مایہ لگنے لگتا ہے۔

اس کے ذہن میں ایک بار بھی یہ خیال نہ آیا کہ جن نیک اور شریف لوگوں کی ہر نیکی کو وہ اپنے حسن
کا خراج سمجھتی آئی ہے۔ سہی ان سے تو پوچھ لیتی کہ وہ اس کے حسن کے کتنے تابع ہیں تو شاید اس پر اپنی بد
نسیبی پوری طرح واضح ہو جاتی۔

کاش ڈیٹان کبھی اس کو کہہ سکتا کہ ”ابتدائی چند دنوں کے علاوہ، ایک عمر گزر گئی مدرخ! میں نے تو
تمہارا چہرہ دیکھا ہی نہیں، تم نے کیا پہنا، تم پر کیسا لگا مجھے کچھ خبر نہیں۔ میرا تو سارا وہی ان صرف تمہاری
بد صورت زبان، گھٹیا ذہن اور تنگ دل میں ہی لگا رہا۔“

رقیہ، حنا اور صبا نہ جانے کتنی بار اس گھڑی کو پچھتاتی تھیں جب وہ مدرخ کی صورت کی اسیر ہوئی
تھیں۔ جب رقیہ نے خالہ کا مشورہ بھی نہ مانا تھا۔

یہ لوگ بالکل ایک آئیڈیل سسرال کے سانچے میں فٹ ہو رہے تھے۔ مدرخ نے کسی کی ایک نہ
سنی۔ عکس نے بہت مٹیں کیں کہ تم از کم اس کو گر بھویشن تو مکمل کر لینے دیں۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔

مدرخ کی مشاورت کے لیے اس کی بہنیں تھیں جو جہالت میں اس سے بھی آگے تھیں اور یوں
عکس، خضر حیات کے سنگ، آنکھوں میں پسینے سجائے، سسرال چلی آئی۔ زاوراہ کے طور اس کے پاس
پورھی دادی کی بیش بہا دعا میں تھیں۔ اپنے باپ کا دست شفقت تھا۔ اپنی پھوپھیوں کی نیک خواہشات
تھیں اور ان سب پر حاوی مدرخ کی کامیاب شادی شدہ زندگی کے تجربات تھے جو اس نے اپنی تربیت
کے زہریں دونوں بیٹیوں کے اندر اتار دیے تھے۔

☆☆☆

بہن مومن سے واپسی بھی ہو گئی۔ دعوتیں بھی ختم ہوئیں۔ کھیر پکوائی بھی ہو گئی لیکن عکس کا دلہنا پا برقرار
تھا۔ خضر اس کو جگا جگا کر تنگ آجاتا لیکن عکس اٹھ کر نہ دیتی۔ ماں، بہن کو ناشتے کا کہنا خود اسے عجیب
لگتا۔ لیکن ردا پہلے کی طرح ہر صبح اس کا ناشتا بنا کر رکھ دیتی۔ کالج جانے سے پہلے وہ جلدی جلدی کام نہ مٹا
ہی ہوتی، اماں، جی، ماسی سے صفائی کروا تیں تو خضر جانے کیوں جھل سا ہو جاتا۔ حالانکہ کسی نے بھی اس
کو کچھ نہ بتایا تھا۔

عکس بارہ بجے تیار ہو کر نہایت اہتمام سے ناشتا کرتی اس کے بعد فون سنہال لیتی۔ خضر کو اور اپنی
ل کو فون کرنے کے بعد بی۔ وی کا ریڈیو سنہال کر اس دل جمعی سے میٹھتی کہ دنیا مافیہا کی خبر نہ ہوتی۔
بلاکھاماں کی خواہش ہوتی کہ بہو کو کسی کام کے لیے کہہ دیں لیکن محویت کا وہ عالم کہ توڑتے ہوئے از
نود ہی جھجک جاتیں۔

فیملی کو ڈسکس نہ کرنا۔ تمہیں ان سے جو شکایت ہو وہ تم مجھ سے کہہ سکتی ہو۔“
”اور اگر کروں تو؟“

”عکس مجھے حد سے گزرنے پر مجبور نہ کرو۔“

گاڑی سے اتر کر عکس انتہائی غصے میں کمرے میں جانے لگی تھی۔

جب خضر حیات نے بڑی سختی سے اس کی کلائی پکڑی۔ ”چلو منہ سیدھا کرو۔ اماں جی کو سلا۔“
”آئیں وہ ہمارے انتظار میں جاگ رہی ہوں گی۔“

عکس تو سلام کرتے ہی واپس پلٹ گئی البتہ خضر کچھ دیر بعد اٹھا۔

”مجھ سے یہ امید قطعی نہ رکھنا کہ میں ان آنسوؤں سے مرعوب ہو جاؤں گا اور اپنے ناکردہ گناہ کی معافیاں تم سے مانگوں گا۔“ اس نے روئی ہوئی عکس کو مخاطب کر کے کمرے کی لائٹ آف کی کروٹ بدل کر فوراً ہی سو گیا۔

”یہ تعویذ تو الٹا ہی پڑ رہا ہے۔ صبح اٹھ کر چینی ضرور کھلاؤں گی۔“

عکس نے ٹائم پیس پر الارم لگایا کیونکہ صبح اٹھنے کی عادت نہ تھی۔ ناشتا بنا کر اس کے آگے رکھ دیا۔
چائے میں چینی ملا کر اس کو ملا دی اور جب تک چائے پی نہ لی عکس وہیں منڈلاتی رہی۔ چائے پی کر ڈاکٹر آفس گیا اور عکس دوبارہ لیٹ گئی۔

رات دیر سے سوئی تھی اور صبح جلدی اٹھی تھی، لہذا فوراً ہی آنکھ لگ گئی۔ یہ گیارہ بجے کا وقت، جب کسی نے اس کو جھٹکے سے اٹھایا۔

خضر حیات نہایت غصے سے گھور رہا تھا۔ اسے اس وقت گھر میں دیکھ کر عکس کے اوسان ہی ہو گئے۔

”مجھے ناشتا دے کر اس گھر میں تمہاری ہرزہ داری ختم ہو جاتی ہے۔“ وہ دھاڑا۔

”خضر! میں کام ختم کر کے اماں سے پوچھ کر لیٹی تھی۔“ عکس کو جھوٹ بولنے میں کوئی ہچکچاہٹ تھی۔

جواب میں خضر اس کو اسی طرح کھینچتا ہوا ڈائٹنگ ٹیبل پر لے آیا جہاں ابھی تک ناشتے کے برتن اسی طرح پڑے تھے۔ پھر چکن جو ناشتے اور رات کے برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ لی وی لاؤنج سکندر کا کمرہ چیز بے ترتیب پڑی تھی۔

”کون سا کام تم نے سمیٹا ہے؟“ وہ چیخ رہا تھا۔ ”تم نے از خود ہی سمجھ لیا ہوگا کہ تمہارے سو۔“

کے دوران اماں، ردا اور ماسی نے کام ختم کر لیا ہوگا۔ رات ہی طے ہو گیا تھا کہ امی اور ردا، سکندر ساتھ حیدر آباد خالہ کے گھر جائیں گی اور ماسی کی بیٹی بھی کل شام بتا گئی تھی کہ آج اس نے نہیں آنا اور سب کچھ اماں اور ردا پر ڈال کر اطمینان سے سو رہیں۔ میں اپنی فائل لینے گھر آیا تو سب دروازے کھلے تھے۔ مین گیٹ بھی بند نہیں تھا۔

عکس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ فوراً کون سا جھوٹ بولے۔ شرمندہ تو وہ قطعاً نہ تھی۔ کا جھوڑ کر سو جانا اور تھوڑا بہت جو ضروری ہو وہ کر لینا۔ اس کے میکے کا روٹین تھا۔

”عکس! کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ میں خضر حیات ہوں ذیشان ظہیر نہیں۔“ وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

”رات کو میرے کچھ دوست کھانے پہ آ رہے ہیں۔ ہر چیز گھر میں تیار کرنا اور ڈنر بہت عمدہ ہونا چاہیے۔“

”میکے بند کرلو۔ میں اب رات کو ہی آؤں گا۔“
”عکس نے گیٹ بند کیا اور لی وی لاؤنج میں بیٹھ گئی۔ خضر نے اس کو بولنے کا کوئی موقع ہی نہیں دیا۔ اپنی سنا کر چلا گیا تھا۔ یہ بھی عکس کے لیے بہتر ہی ہوا۔ لیکن کھانے کا مسئلہ ایک پہاڑ کی طرح اس کے منہ تھا۔

اس معاملے میں وہ اپنی ہمہ صفت موصوف ماں کی بھی کوئی مدد نہ لے سکتی تھی۔ کیونکہ کھانے پکانے اور بالکل کوری تھیں۔ ایک بچنے والا تھا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”صبا پھوپھو کو فون کرتی ہوں۔“ اس نے سوچا۔ ”لیکن وہ تو کالج میں ہوں گی۔“ خود ہی نفی کر

”دکوشش کرنے میں تو حرج نہیں۔“ مرنے مرنے قدموں سے فون کی طرف بڑھی۔ صبا کے نمبر یاد کیے۔ دوسری ہی بیل پر صبانے فون اٹھایا۔ صبا کی آواز سن کر اس میں جان پڑ گئی۔

”پھوپھو! پلیز میری، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔ آپ کو تو پتا ہے مجھے کوکنگ بالکل نہیں آتی۔“ عکس اب روہا سی ہو رہی تھی۔

”عکس! تم پریشان نہ ہو۔ میں آتی ہوں۔“ پندرہ منٹ میں صبا آ گئی تھی۔

”وجاہت گھر پر ہی تھے۔ اس لیے بچوں کا کوئی مسئلہ نہ ہوا۔“ وہ عکس کو بتا رہی تھی۔

”پھوپھو! انکل آپ کو باہر ہی سے جھوڑ کر چلے گئے۔ اندر لے آئیں۔“

”عکس میں تو اپنی گاڑی لالہ لائی ہوں۔ میں نے سوچا اگر کچھ لانا پڑا تو لے آؤں گی۔ اب بتاؤ۔۔۔“

مر میں کیا کیا ہے اور مارکیٹ سے کون سا سودا سلف آتا ہے۔“ صبا کو وقت کی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔

”پھوپھو! مجھے تو کچھ پتا نہیں کہ کون کون سی چیزیں گھر میں ہیں۔ دیکھنا پڑے گا۔“ عکس جھل سی

”عکس بالکل بھابھی کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔“ صبانے قدرے افسردگی سے سوچا۔ کچن کافی نڈی حالت میں تھا۔

”پھوپھو!“ عکس نے فریزر کھولا۔ ”چکن اور قیمہ دونوں ہیں۔ دودھ بھی فریزر میں ہے۔“ کسٹرو

لا موجود تھا۔ صبانے سب سے پہلے کسٹرو کے لیے دودھ گرم ہونے رکھا۔ عکس کو پھل کاٹنے پر لگا یا اور دیر تن دھونے لگی۔ کسٹرو بنا کر اس کو ڈائٹنگ ٹیبل پر ٹھنڈا ہونے رکھ دیا۔ اور کبابوں کے لیے قیمہ، مگر

ماچڑ ہادیا۔

”عکس! تم اب سلاڈ کاٹ لو۔“ اس نے چکن چڑھا تے ہوئے کہا۔ پانچ بجے تک صبا کباب، رمر، چکن کڑھائی اور کسٹرو بنا چکی تھی۔ پلاؤ کی تیاری تھی۔

”عکس! اب میں جاتی ہوں۔“ اس نے چکن کڑھائی کے لیے ہری مرچ کاٹتے ہوئے کہا۔

”چالو تو تم پکا لو گی نا! اگر ابھی پکا لیے تو ٹھنڈے ہو جائیں گے۔“

”بھپھو! آپ کھانا کھا کر جائیں نا۔“
 ”نہیں بیٹا! بہت دیر ہو جائے گی۔ سنو عکس! خضر کا دھیان رکھا کرو وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔“
 خضر دھڑکتے دل کے ساتھ ہی اپنے دوستوں کو لایا تھا۔ اس نے انہیں ہوں ڈنڈے کرانے کی پیشگی
 کی تھی لیکن انہوں نے بھی گویا بھی کے ہاتھ کا کھانا کھانے کی قسم کھائی تھی۔
 ”اچھا ہے۔“ خضر نے غی سے سوچا۔ ”کھا کے آئندہ تو نہیں کہیں گے۔“
 اس کی توقعات کے برعکس ڈرائنگ روم صاف تھا۔ دوستوں کو بٹھا کر اندر آیا تو عکس ٹیبل پر
 بیٹ کر رہی تھی۔

”عکس! کچھ بنایا بھی ہے یا نہیں۔“ وہ قدرے عجلت میں بولا۔

”سب کچھ تیار ہے۔ آپ فریش ہو جائیں۔“

”کچھ اور تو نہیں منگوانا۔“

”نہیں، ہر چیز تیار ہے۔“

دوستوں نے کھایا تو وہ انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ خضر سے تو مارے حیرت کے کھایا بھی نہ
 جا رہا تھا۔

”سنو! دوستوں کے جانے کے بعد اس نے کچن سمیٹی عکس سے کہا۔ ”تھک گئی ہوگی۔ صبح
 لیٹا۔“

پر عکس نے آج اپنا سکہ جمانا تھا لہذا برتن دھو کر اور کچن صاف کر کے ہی کمرے میں آئی۔

☆☆☆

کچھ دنوں کے تعلقات بہتر رہے لیکن پھر وہی کھچاؤ۔

عکس کے وہی رنگ ڈھنگ، ناز و انداز اور جھوٹ کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔

خضر کے گھر والوں نے عکس کو اس کے حال پہ چھوڑ دیا۔ توقعات کا دروازہ بند کر دینے کے بعد
 کو عکس سے کچھ شکایت نہ تھی۔ اور عکس یہ سمجھتی رہی ”آخر دب گئے۔ ہونہ! شکلیں اپنی دیکھتے نہیں؟
 اور۔“ وہ اکثر تحارت سے سوجتی۔

اس کو اب بھی مہ رخ کے تیرے ہدف نگوں پر بہت بھروسہ تھا۔ ساتھ ساتھ مختلف طرح کے تعویذ
 دھاگے بھی آزمائے جاتے۔ جن کے لیے وہ بھی تو خضر سے جھوٹ بول کر پیسے لیتی اور کبھی چپ چار
 اس کی جیب سے نکال لیتی۔

ان ہی بے زار سے دنوں میں عکس کو ماں کے رتبے پر سرفراز ہونے کی خوش خبری ملی تو خضر کچھ
 سا گیا۔

بہت سال پہلے حضرت علی کا قول پڑھا تھا کہ ”ایمان کے بعد، اچھی بیوی سب سے بڑی نعمت
 ہے۔“ اور آج جب عکس اس کی آئندہ نسل کی امین بننے جا رہی تھی تو قول آج بہت اچھی طرح سمجھ آ رہا
 آیا۔ اب بڑے پیار سے عکس کو سمجھانا شروع کیا۔ لیکن وہ عکس ہی کیا جو بات سمجھ جائے۔ اگر
 کچھ نرم پڑتی بھی تو ماں کا کچھ اس کو دوبارہ ریت میں تبدیل کر دیتا۔

”عکس، ایک بار جھک گئی تو تمام عمر جھک کر ہی رہنا پڑے گا۔ مجھے دیکھ۔ ذیشان کی مجال نہیں جو
 تھے ایک لفظ بھی کہہ سکے۔“
 اور یہ فلسفہ عکس کو کوئی نہیں سمجھا سکتا تھا کہ جو جھکے نہ اسے ٹوٹ جانا پڑتا ہے۔

ردا کے سسرال والے شادی کا تقاضا کر رہے تھے اور فرحت چاہتی تھیں کہ ساتھ ہی وہ سکندر کے
 رض سے سبک دوش ہو جائیں۔

”ردا، دعا کیا کرو، سکندر کے لیے کوئی نیک شریف لڑکی مل جائے۔“ وہ اکثر کہا کرتیں۔

فرحت خود بھی اللہ سے یہ التجا کرتیں۔ خضر کی مشکل زندگی خود ان کے لیے امتحان بنی ہوئی تھی۔
 کتنے کتنے دن گزر جاتے۔ عکس ان میں سے کسی کو مخاطب نہ کرتی۔ گھر میں اس کا قیام ایک مہمان کی مانند
 نا۔ کون آرہا ہے۔ کیا پکنا ہے، صفائی، دھلائی کسی چیز سے کوئی غرض نہ تھی۔ خضر اپنے کپڑے دھو بی سے
 جھلاتا تھا۔ ردا کے بے حد اصرار پر بھی وہ دھو بی کو ہی دے آتا تھا۔ عکس اپنے کپڑے خود دھو لیتی تھی۔ بیڈ
 نیٹس اور تولیوں کے لیے عکس، مینے کے اواخر میں ایک بار مشین لگا لیتی تھی۔

عکس، صرف ایک چیز میں مہ رخ سے مختلف تھی۔ مہ رخ کو اتنے سال گزرنے کے باوجود بھی
 ذیشان سے محبت نہ تھی۔ وہ اب بھی ذیشان کا، اس کی ہر چیز کا بڑی شد و مد سے مذاق اڑاتی تھی۔ اتنے
 برسوں کی رفاقت کے باوجود اس کے خیر دل میں محبت کی کوئی کوئیل نہ بھوٹی تھی۔ ذیشان اس کی
 راجدھانی تھی جس کو وہ بہت آسانی سے پا مال کر لیتی تھی کیونکہ وہ اس راجدھانی کی ملکہ تھی۔

”ارے! یہ ہم ہی ہیں جو بناہ گئے۔“ وہ اکثر ترنگ میں آکر یہ دعا بھی کرتی تھی۔

لیکن عکس اس جگہ اپنی ماں کا کوئی رنگ نہیں لے سکی۔ اس کو خضر سے بہت محبت تھی۔ وہ اس کی
 محبت میں سہا پادوبی ہوتی تھی۔

جب بھی اس کے تنہالی میں محفل جمتی جس میں اپنے علاوہ دنیا کے ہر فرد کا مذاق اڑایا جاتا۔ بہت
 سے نیک شریف لوگوں کے نیچے ایسے ادھیڑے جاتے۔ لیکن عکس، وہاں پر کسی کو اجازت نہ دیتی کہ مذاق
 کا کوئی لفظ بھی خضر حیات کی ذات تک آپہنچے۔

☆☆☆

اس روز خضر کی خالہ آئی ہوئی تھیں۔ ردا کی بات ان کے ہاں طے تھی۔ ردا بھی بی۔ اے کر کے
 فارغ تھی۔ خالہ اب شادی کی تاریخ طے کرنا چاہ رہی تھیں۔

”آپا! بس کچھ دن اور ٹھہر جائیں۔ ردا کو بیاہ دیا تو اس گھر کا کیا ہوگا۔ سکندر کے لیے کوئی اچھی سی
 لڑکی دیکھ لینے دیں۔ بس پھر سکندر کی بھی ساتھ ہی کر دوں گی۔“

خضر وہیں بیٹھا تھا۔ خالہ بھی چپ ہو گئیں۔ بہن کی مجبوریاں بھی نظر آرہی تھیں۔ خضر خود کو مجرم سا
 محسوس کرنے لگا۔

ای کتنی آس سے عکس کو بیاہ کر لائی تھیں۔ بیوی کی ایک طویل اور صبر آزمائش کاٹی تھی۔
 ”اب تو دین کو گھر سوئپ کر دو کام کرنے ہیں، آرام اور عبادت۔“ وہ اکثر کہا کرتیں۔ لیکن عکس
 کے حوالے سے دیکھا گیا یہ خواب ریت کا گھر وندہ ثابت ہوا۔

شادی کے دو سال پورے ہو چکے تھے۔ لیکن اس کی بے نیازی ہنوز تھی۔ اس کے دل میں اس گھر
ساز نند اور دیور کے لیے محبت کی رقم بھی موجود نہ تھی۔
”عکس تو ہمارے لیے نیکر ثابت ہوئی۔ نہ پھل نہ سایہ۔“ یہ خضر کی اب ہر دقت کی سوچ تھی۔
خضر کو اب ذیشان کے روپ میں اپنا مستقبل نظر آتا تھا۔ اجڑا اور دیران۔ ایک پریشان حال خضر
جس کا دنیا کی کسی خوشی سے کوئی لیما دینا نہیں تھا۔

☆☆☆

اس روز ذیشان کے گھر دعوت تھی اس کی ترقی کے سلسلے میں۔ خضر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن ذیشان
اور رقیہ نے خود اصرار کیا تھا لہذا وہ مجبور ہو گیا۔ ان دونوں کی وہ بہت عزت کرتا تھا۔ عکس تو صبح سے ہی چلا
گئی تھی وہ البتہ شام ڈھلے پہنچا۔ گھر کے دیگر افراد میں سے تو کوئی جانے کو مانا ہی نہیں۔
عکس کی خال میں مح اپنے بچوں موجود تھیں اور اس کی دونوں پھوپھیاں بھی موجود تھیں اپنی فیملی
سمیت۔ خضر کو قدرے خوشگواریت کا احساس ہوا۔ وجاہت سے مل کر اس کو ہمیشہ بہت اچھا لگتا تھا۔ از
کی شائستہ بیوی، مہذب بچے اس کو ہمیشہ رشک میں مبتلا کر دیتے تھے۔
”نقش! اس نے اپنی سالی کو بلایا۔“ ماشاء اللہ بڑی گید رنگ ہے لیکن دیکیں وغیرہ نظر نہیں
آ رہیں۔ خالی پانی پی کر جانا پڑے گا۔“ اس نے قدرے خوش گواریت سے کہا کیونکہ مہر رخ بھی بڑی
سہولت سے پی بھی گئی۔

”وہ خضر بھائی! آج کو کنگ حنا اور صبا پھپھو نے کی ہے۔ ابو کی خواہش تھی کہ۔۔۔“ اس نے
دھیمے سے اور قدرے شرارتی انداز میں کہا۔ ”بہت دن ہو گئے گھر کا بنا اچھا کھانا نہیں کھایا۔“
چونکہ یہ ان کی ذمہ داری تھی، لہذا مہر رخ اور فیملی از خود ہی مہمان خصوصی بن کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے
بیٹھے تھے۔

”ہونہ! خود ہی کریں بہت نیک پروین بنتی ہیں نا۔ دیکھ لیں گے کیسے پکتا ہے اتنا کھانا۔“ مہر رخ
اپنی بہن سے کہہ رہی تھی۔

صبا اور حنا بچن میں ہی تھیں۔ نقش نے البتہ برتن وغیرہ ضرور سیٹ کیے تھے۔ بریانی کو دم سے اتار
کر حنا نے توار کھ دیا اور روٹی پکانے لگی۔

بڑے بڑے دینگے بچن میں دھرے تھے۔ مٹن بریانی، چکن قورمہ، بیف کے پسندے، کوفتے،
ناش کی وال، رائیہ سلاوا اور ساتھ ساتھ گرم گرم روٹیاں۔ کھانا ایسا کہ بس کھاتے جاؤ۔ عکس کے تخیال کو نہ
چاہتے ہوئے بھی تعریف کرنا ہی پڑی۔ کھانے کے بعد برتن سمیٹ کر ماسی کو فوراً دھونے پر بھی لگا دیا۔
کھانے کے بعد خوشبودار قہو نے اس پر تکلف اور مزے دار دعوت کو جارحانہ لگا دے۔
صبا اور حنا بھی اب فراغت سے بیٹھ گئی تھیں۔ گو کہ بیٹھے ایک ہی جگہ تھے لیکن گھر پر علیحدہ تھے۔
عکس نقش اپنے تخیال کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔

”خضر! کتنا برا لگ رہا ہے آپ جب سے آئے ہیں۔ انگلو کے پاس ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ دا
خالو جان کئی بار آپ کا پوچھ چکے ہیں۔“ اس نے اپنے مسکین صورت خالو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔ ”عکس! میرے لیے یہ اطلاع ہے کہ تمہارے خالو کو ”پوچھنے“ جیسے آزادانہ فعل کی اجازت مل گئی
ہے اور باقی دادے تمہیں کب سے اچھے برے کی فکر ہونے لگی؟“ اس جواب پر عکس تن فن کرتی دوبارہ
ماں کے پیلو سے جا لگی۔

”اے نقش!“ اس کی خالہ گل رخ کی پاٹ دار آواز نے تمام تر حاضرین کو متوجہ کیا تھا۔ ”یہ کیسا میٹھا
سا پانی گھول کر میرے آگے رکھ دیا۔ بھی! بڑی کوشش کی پر اندر نہیں جا رہا۔ اٹھالے اس کپ کو یہاں
سے۔“ نقش نے مڑ کر کپ کو دیکھا۔

”افوہ خالہ! پورا کپ خالی کر دیا اور اب کہہ رہی ہیں کہ میرے اندر نہیں جا رہا۔ خالی کپ یہیں رکھ
دیں ٹبل پر۔“ نقش ان ہی کی بھانجی تھی لگی لپٹی رکھے بغیر دوسرے کو منہ پر سنانے والی۔
سب ہی کے چروں یہ مسکراہٹ دوڑ گئی تو گل رخ قدرے جھل سی ہو گئی۔

”مہر رخ نے ذرا تیز نہیں سکھائی اپنی بیٹیوں کو۔“ وہ اپنی دوسری بہن لالہ رخ۔ کرکان کے پاس
منہ کر کے جانے کون سے زمانے کے قصے لے بیٹھی۔

دس بجے کے قریب خضر نے جانے کی اجازت چاہی۔

”خضر! میں کل آ جاؤں گی۔“ عکس اٹھلاتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔ ”بہت تھک گئی ہوں۔“
”تھکن، بیٹھ بیٹھ کر۔۔۔ یہ کام تو تم نے گھر جا کر بھی کرنا ہے۔ چلو میرے ساتھ۔“ وہ قدرے
درشت سا ہو کر بولا تو عکس جھل سی ہو گئی۔

اسی وقت صبا وجاہت کے پاس چلی آئی۔ ”وجاہت! کل چھٹی ہے۔ بہت دنوں سے امی سے
ڈھنگ سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ حنا بھی رک رہی ہے اگر آپ۔۔۔“ اس کی بات پوری ہونے سے
پہلے ہی وجاہت بول اٹھے۔

”ارے بیگم! ہم سے کیا پوچھتی ہیں۔ ہم تو خادم ہیں، آپ صرف یہ کہیں کہ بندے کے لیے کیا حکم
ہے؟“ وہ شگفتہ سا ہو کر بولے تو صبا کے ساتھ ساتھ خضر بھی ہنس پڑا۔

”آپ گھر جائیں۔“ وہ کہہ کر چلی گئی اور عکس کے لیے یہ سب قیامت تھا۔ اس نے فوراً اپنی ماں کو
اطلاع دی۔

وہ فوراً ہی دوڑی چلی آئیں۔ ”غضب خدا کا، اب میری بیٹی کو سیکے رکھنے کے لیے دودھ نکلے کے
لوگوں کے سامنے ذلیل ہونا پڑے گا۔“ ان کی زبان سن کر صبا نے شکر ادا کیا کہ وجاہت جا چکے تھے۔ خضر
اپنی ساس کے تئیر دیکھ رہا تھا۔ ”دیکھو خضر! میری بیٹی بھاگ کر نہیں گئی تھی تمہارے ساتھ۔“ (اف وہی
گھٹیا سوچ) خضر نے ان کی جانب دیکھا۔ ”کہ تم اس کو یوں کانٹوں پر گھسیٹو، ایک رات رکھنے کی ہی
اجازت مانگی تھی نا اس نے اپنی مجبور ماں کے گھر۔ جواب میں میاں! تم نے اس کو کسی کھری کھری
سنا دیں، کان کھول کر سن لو۔ میری بیٹی بھاری نہیں ہے مجھ پر۔“

ذیشان جو ڈرائنگ روم میں تھا وہ بھی باہر برآمدے میں آ گیا۔ مہر رخ کی بہنیں اور ان کے بچے
بھی جو تماشا تھے۔ ان کے لیے یہ معمول تھا۔

”خدا خیر کرے آج خضر کے تیور کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔“ یہ صبا اور حنا کی سوچ تھی۔
 ”امی! آپ جائیں۔“ انہوں نے پریشان سی رقیہ کو کہا۔ ”عکس کو خضر کے ساتھ جانے کو کہیں۔“
 اس سے پہلے کہ رقیہ آگے آتیں خضر نے بڑی حقارت سے مدرخ کو مخاطب کیا۔
 ”خاتون! اگر میں آپ کی بیٹی کو کانٹوں پر گھسیٹتا ہوں تو آج سے آپ کو ہمیشہ کے لیے اجازت ہے اپنی بیٹی کو پھولوں والے راستوں پر چلانے کی۔ کاغذات آپ کو چند روز میں مل جائیں گے۔“ وہ کہہ کر رکا نہیں۔

وہ سب اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے۔ بات اتنی آگے بڑھ جائے گی، یہ کسی نے بھی نہیں سوچا تھا۔
 ماحول کے ستارے کو سب سے پہلے مدرخ نے توڑا۔

”ہونہ! ٹٹ پونجیا، دیکھ لوں گی۔“
 وہ عکس کو اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی تھی۔ باقی مہمان تھوڑی دیر بعد چلے گئے تھے۔ ذیشان اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے بیٹھا تھا عکس اب زار زار رو رہی تھی۔ مدرخ اور ٹٹ اس کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”جو کھٹ یہ پاک نہ رگزد وانی تو میرا نام بھی مدرخ نہیں۔“ خضر گھر پہنچ کر چپ چاپ اپنے کمرے میں آگیا۔ خلاف توقع وہ اپنے آپ کو کانٹوں پر سکون محسوس کر رہا تھا۔ ”شاید یہی نوشتہ نقدیر ہے۔“ سونے سے پہلے یہ اس کی آخری سوچ تھی۔

صبح اس کی جلدی آنکھ کھل گئی۔ چھٹی کی وجہ سے بستر چھوڑنے کا ارادہ نہیں بنا۔ اس نے اپنے پہلو میں خالی بستر دیکھ کر سوچا ضرور۔

”تو تمہاری واپسی ہوگئی عکس! وہ لمحہ آگیا جس کے آنے کا مجھے اب یقین ہو گیا تھا۔ لیکن عکس! تم جیسی خود پسند، بد تمیز عورتیں بس دور سے ہی اچھی لگتی ہیں لیکن گھر بسانے کے لیے نہیں ہوتیں، نہ ہی یہ خود غرض عورتیں اس قابل ہوتی ہیں کہ ایک نسل کی امین بن سکیں۔“ ایسی ہی ابھی سوچوں میں اس کی آنکھ دوبارہ لگ گئی۔ دوبارہ جاگا تو دن چڑھ آیا تھا۔ نہادھو کر وہ نیچے اترتا اور دالاؤنج میں اخبار پڑھ رہی تھی۔ امی جان کارپٹ پر چادر بچھائے سبزیاں کاٹ رہی تھیں اور سکندر ریوٹ پکڑے ٹی وی میں مگن تھا۔ آج خضر بہت عرصے بعد اپنے آپ کو اس منظر میں بالکل فٹ محسوس کر رہا تھا ورنہ عکس کی روش نے اس کو اپنے پیاروں کی نظروں میں جل سا کر دیا تھا۔ گوکہ کسی نے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا تھا لیکن خضر از خود ہی یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ بطور بڑے بیٹے اور بھائی، عکس کی وجہ سے بہت جگہ اپنے فرائض ادا کرنے میں ناکام رہا تھا۔ خالی پیسے دینے سے تو سارے حقوق ادا نہیں ہوتے۔

”وہ کارپٹ یہ ہی امی کے پاس بیٹھ گیا۔“ ردا! اس نے بہن کے ہاتھ سے اخبار لیا۔ ”چھٹی کے شایان شان زبردست سامنا تھا ہونا چاہیے۔“

اس کو بہت خوش گوار حیرت ہوئی کیونکہ خضر اب اکثر خود ہی ناشتا بنا لیتا تھا۔ وہ لاکھ کہتی لیکن وہ پیار سے ٹال دیتا۔ چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر انڈا التا، سلاٹس ٹوسٹر میں سیکنڈا اور وہیں کھڑے کھڑے کھا لیتا۔ چائے چھٹی والے دن کمرے میں، ورنہ کچن ٹبل پر ہی پی لیتا۔

تھوڑی ہی دیر میں ردا اس کی پسند کا ناشتا گرم گرم پراٹھے اور ہری مرچوں والا آلیٹ بنا لائی۔ چائے کی کردہ کارپٹ پر ہی نیم دراز ہو گیا۔

”حیرت ہے ابھی تک بھائی کو آواز نہیں دی بھابھی نے اور نہ ہی کمرے سے اٹھا پنچ کی آوازیں آ رہی ہیں۔“ ردا گوگلو کے عالم میں سوچ رہی تھی جب خضر نے اس کو مزید حیران کر دیا۔

”امی! آپ اور ردا تیار ہو جائیں آج چھٹی، چچا جان کے گھر گزرائیں گے۔ سکندر! تم گھر پر ہی ہو نا۔“ سکندر جو انتہائی محویت سے کرکٹ کا میچ دیکھ رہا تھا۔ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

”ردا! میں آدھ گھنٹے میں نیچے آ رہا ہوں۔ تم لوگ تیار ملنا۔“ وہ کہہ کر اوپر چلا گیا۔

”ردا بیٹے! یہ خضر کو کیا ہو گیا ہے اور بہو کیا سارا دن اوپر اکیلی رہے گی میں خضر کو کہہ نہ آؤں کہ اس کو بھی ساتھ لے لے۔“ وہ اٹھنے کو تھیں جب ردا نے ان کو دوبارہ بٹھا دیا۔

”انوہ! امی جان! آپ بھی کس دنیا میں بس رہی ہیں۔ دو سال میں ابھی آپ کی خوش فہمی باقی ہے۔ یہاں ابھی وہ ہنگامہ ہوگا کہ پورا محلہ سنے گا اور آج بد توں بعد جو بھائی مسکرارہے ہیں، ریلیکس ہیں۔ وہ اسی پریشان حال موڈ میں دوبارہ چلے جائیں گے۔“

”لیکن!“ وہ ابھی گوگلو کے عالم میں ہی تھیں جب سکندر بول اٹھا۔

”امی! اردا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ گھر آئی خوشی کو کیوں واپس کر رہی ہیں۔“

چچا کے گھرانے کے ساتھ ان کے تعلقات بہت خوش گوار تھے۔

چچا کے تو عزیز بھائی کے بیوی بچے تھے۔ لہذا چچا کے تینوں بیٹوں اور ان تینوں بہن بھائیوں کے مابین محبت، احترام، شرارت ہر طرح کا رشتہ تھا۔ خود بانو بھی سیدھے سبھاؤ کی، قاعدے قرینے والی خاتون تھیں۔

وہ سب ہی ان لوگوں کو خاص طور پر خضر کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے کیونکہ خضر نے تو اب ملنا جلتا قریباً چھوڑ ہی دیا تھا۔ ان سب کے بے حد منع کرنے کے باوجود سعیدہ نے چائے بنا ہی لی اور ساتھ میں گاجر کا حلوہ۔ لڑکوں نے تو پھر کرکٹ پیٹ سنبھالے اور وہ میچ جما کہ مغرب کے بعد ہی ختم ہوا۔ امی اور چچی آج کافی دنوں بعد اکٹھی ہوئی تھیں لہذا خاندان بھر کے حالات حاضرہ سے لے کر خضر کا اچانک یہاں آنا تک ہر چیز ہی زیر بحث رہی۔ چچا جان گاہے بگاہے اس محفل میں آتے جاتے رہے۔ ردا نے کچھ وقت تو چچا کی لائبریری میں گزرا اور پھر کچن کی راہ لی کیونکہ یہ ہمیشہ ہی ہوتا تھا کہ ردا کو دیکھ کر چچی پھر کچن میں قدم نہیں رکھتی تھیں اور نہ ہی کوئی مشورہ دیتی تھیں۔

”ارے بچے، اب خود ہی دیکھ اور پکا۔“

وہ بہت دنوں بعد ایک یادگار دن تھا۔ رات کو فرائیڈ چھٹی، مٹر پلاؤ، رائیہ سے خوب انصاف ہوا۔

رات گئے ان کی واپسی ہوئی تو ایک اچھے دن کی سرشاری ان پر طاری تھی۔

وہ لوگ بھی لاؤنج میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ سکندر نے ان کو چونکا دیا۔ ”بھابھی تو صبح سے ابھی تک

کمرے سے باہر ہی نہیں نکلیں۔ نہ ہی میری ہمت ہوئی کہ دروازہ بجا کر پوچھ سکوں۔“

وہ ماں بیٹی تو وہیں بیٹھی رہ گئیں۔ عکس کی ضدی اور خود سر طبیعت سے وہ باخوبی واقف تھیں۔ کہیں

اس نے غصے میں کوئی غلط حرکت ہی نہ کر ڈالی ہو۔

”ارے خضر! دیکھتے کیا ہو، اٹھو، بھونٹھک بھی ہے۔“ پریشانی نے ان کو بولا دیا تھا۔

”امی جان! اطمینان رکھیں وہ ٹھیک ہے۔ رات وہ اپنی ماں کے گھر سے ہی واپس نہیں آئی تھی۔ خضر کے سکون میں سرموق فرق نہ آیا تھا۔

”تو تم یہ بات صبح بھی تو بتا سکتے تھے۔“

”امی! اس میں چھپانے والی کوئی بات ہی نہیں، وہ اب ہمیشہ وہیں رہے گی۔“ خضر بڑے آرا سے اتنی بڑی بات کہہ گیا تھا۔

ردا جو سونے کے ارادے سے اپنے کمرے میں جا رہی تھی پھر دوبارہ بیٹھ گئی قدرے لائق سے بیٹھے ہوئے سکندر نے ٹپٹا کر بھائی اور پھر ماں کی جانب دیکھا جو مکمل حیرت اور صدمے کی حالت میں تھیں۔ ”خضر کیا کہہ رہا ہے تو؟“

”امی جان! آپ یقین کریں یہ فیصلہ میں نے وقتی اشتعال میں آکر نہیں کیا۔ میں بہت دنوں سے یہی سوچ رہا تھا۔ رات کی بات سے البتہ قدرے جلدی ضرور ہوگئی۔“ رات والی بات کی ان سب کو کوئی خبر نہ تھی تب خضر نے مختصر بتایا۔

”بیٹا! عکس ابھی بچی ہے آہستہ آہستہ سمجھ جاتی۔“

”جیسے اس کی والدہ سمجھ گئی ہیں۔“ خضر اب بہت تلخ ہو رہا تھا۔ ”میں نے عکس کو ہر طور سے سمجھایا۔ لیکن خود سری، ضد خونمائی اس کی تربیت کا حصہ ہے۔ وہ کسی طور اپنی روش سے ایک انچ بھی نہ سرکی۔ وہ ریت کی بنی ایک خوب صورت صورت ہے۔ جس پر کسی نرم جذبے کا اثر نہیں ہوتا۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ عکس میری آئندہ نسل کی امین نہیں بنی۔ ورنہ یہ فیصلہ کچھ دشوار ضرور ہوتا۔“

”لیکن خضر؟“ امی نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے بات سچ میں ہی کاٹ دی۔

”امی جان! سچ کہیں۔ ذیشان ظہیر کو دیکھ کر آپ کو نہیں لگتا کہ وہ آپ کے بیٹے کا مستقبل ہے۔“

خضر بہت مایوسی کے عالم میں یہ سب کہہ کر اوپر چلا گیا۔

وہ تینوں سکنتہ کے عالم میں وہیں بیٹھے رہے۔ ایک خوش گوار دن کا بہت تلخ انجام تھا۔

☆☆☆

مہ رخ کے کان پر جوں تک نہ رہتی تھی۔ عکس اگر رات کو پریشان تھی تو اب بہت پرسکون تھی۔ حنا اور صبا صبح ہی اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اس پوری صورت حال میں بولنے کا کوئی حق نہیں رکھتیں۔ صبا نے ہی حنا کو ڈراپ کرنا تھا۔ جب راستے میں حنا نے صبا سے کہا انہیں اپنے طور پر خضر کے گھر والوں سے رابطہ کرنا چاہیے۔ صبا خود بھی یہی کچھ سوچ رہی تھی۔

مہ رخ نے صبح ہی فون پر اپنی چھوٹی بہن کو مطلع کر دیا تھا اور خود اس کے گھر جانے کے لیے نکل رہی تھی۔ دونوں بہنوں کا ارادہ ایک بے حد مانے ہوئے عامل کے پاس جانے کا تھا۔ جس کی قابلیت کے چہ ان کے حلقے میں عام تھے۔

”عکس! میری بچی!“ مہ رخ نے گھر پہنچ کر چند بڑیاں اس کو تھمتے ہوئے کہا۔ ”جیسے میں کہوں دیے کرنا، نہ خضر نے تیرے سامنے ناک سے لکیریں کھینچیں تو میرا نام بھی مہ رخ نہیں۔“ عکس کے

چہرے پر بھی اب اطمینان ہی اطمینان تھا۔

ذیشان اور رقیہ کے لیے تو یہ سب کچھ قیامت تھا۔ رقیہ تو بے آواز روئے جا رہی تھیں۔

”یا اللہ! کوئی اور دن دکھانے سے پہلے مجھے اٹھالے۔“ آج سے پہلے رقیہ نے بھی بڑی سے بڑی پریشانی میں بھی موت کی آرزو نہ کی تھی۔

ذیشان نے بینک سے واپسی پر عکس کو اپنے کمرے میں بلایا۔ روٹھی روٹھی ہی عکس آکر چپ چاپ بیٹھ گئی۔

”عکس بیٹا! پھر کیا سوچا ہے تم نے۔ گھر بننے تو بہت مشکل سے ہیں لیکن ٹوٹنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔ میان بیوی کے درمیان اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے لیکن اس کو انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ اٹھو، میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔ وہ بھلے لوگ ہیں۔ کھلے دل سے خوش آمدید کہیں گے۔“

”عکس!“ وہ ابھی اپنی بات مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ مہ رخ ایک جھٹکے سے کمرے میں داخل ہوئی۔ کمر پر ہاتھ رکھے وہ بڑی خوشخوار نظروں سے ذیشان کو دیکھ رہی تھی۔

”ارے مہاں! بند کرو اپنی یہ پیاری۔ میری بیٹی کی درویشیاں تم پر بھاری پڑ گئیں۔“ اس کی بات سننے ہی خاموش بیٹھی عکس زور و شور سے رونے لگ گئی۔

”یہ لہیتیں کسی اور کو دینا۔ جب تمہیں اپنی اولاد کی پروا ہی نہیں تو کاہے کو اندھے کنویں میں دھکیلتے ہو۔ جن جتنوں سے مجھ دکھیااری نے انہیں پال لیا ہے ان ہی سے آئندہ بھی کوئی راہ ڈھونڈ لوں گی۔“ اب کے اس نے عکس کو کھینچ کر اپنے ساتھ کھڑا کر لیا۔

”ارے خدا کی مار ہو ان لوگوں پر۔ میرا صبر پڑے ان بد بختوں پر۔“

مہ رخ کا بے آنسوؤں کے رونا شروع ہو گیا تھا۔ گھر کے ستارے میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔ ذیشان چپ چاپ گھر سے باہر نکل گیا۔

”کاش میں بزدلی کی حد تک شریف نہ ہوتا۔“

”کاش میں اب بھی دوبارہ گھر نہ لوٹ پاؤں۔“ اس نے ایک آس بھری نظر آسمان پر ڈالی اور ہولے ہولے قدم اٹھانے لگا۔

مہ رخ کو اپنے عامل پر پورا یقین تھا، وہ عکس سے کہہ رہی تھی۔ ”بس چند روز کی بات ہے دیکھنا کیسے دم ملاتا آئے گا۔“ تب پوسٹ مین نے عکس کے نام کی رجسٹری حوالے کی۔

عکس تو خوف اور صدمے کے مارے بے ہوش ہی ہو گئی تھی۔ مہ رخ بھی حیرت زدہ تھی۔ نقش نے اس لفافے کو کھولا۔

اس کے بدترین اندیشوں میں بھی یہ کہیں نہ تھا لیکن عکس کو پہلی طلاق وصول ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی اس کے خرجے کا چیک تھا۔

خضر تو عکس کے روم روم میں بسا تھا۔ اس کی شوخیاں، شرارتیں، گستاخیاں، اس کی رفاقت۔ وہ تو خضر کے علاوہ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور اب بھی اس کا یہی خیال تھا کہ خضر اس کو مٹا کر لے جائے گا۔ لیکن یہ رجسٹری اس کے سارے خوابوں کو ریزہ ریزہ کر گئی تھی۔

اسی شام صبا، خضر کے گھر پہنچ گئی۔ وہ لوگ بھی بے حد پریشان تھے۔ ایسے فیصلے شریف لوگوں کو

ہمیشہ ہی ناگوار لگا کرتے تھے خواہ وہ بہوؤں کے لیے ہی کیوں نہ ہوں۔

”خضر!“ صبا نے اس سے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا عکس اتنی ہی مجرم تھی کہ ایک دم تم نے زندہ کا اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔ تم نے ایک بار بھی ہم میں سے کسی کا نہیں سوچا کہ ہمارے دل پر کیا گزرے گی۔ تمہاری بیوی بھی اور تم نے اس کو۔۔۔ اس کو کسی کینسر زدہ جیسے کی طرح خود سے علیحدہ کر دیا۔ ایسا کون جرم اس نے کیا جو ناقابل معافی ٹھہرا۔ خضر کیا عکس بد کردار تھی؟“ صبا نے جھنجھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آئی! میں جانتا ہوں کہ آپ سب کو میں ہی مجرم اور قصور دار لگ رہا ہوں۔ لیکن صرف ایک با میری جگہ خود کو رکھ کر سوچیے! پھر آپ کو لگے گا کہ میں نے جو کیا درست کیا۔ آپ کہہ رہی ہیں کہ وہ میرے وجود کا حصہ تھی۔ ہاں! ایک ہمیشہ دکھ دینے والا میرے وجود کا حصہ۔ وہ میری ریت تو کیا اپنی اس نے مجھے میرے دوسرے رشتوں سے بھی دور اور علیحدہ کر دیا۔ اس کی کوتاہیاں، بد کمیزیاں مجھے ہر ایک کی نظر میں اس طرح شرمندہ کرتی تھیں کہ میں نے اپنے رشتے داروں سے ملنا چھوڑ دیا۔ آئی! میاں بیوی کے رشتے میں تو بہت لطافت ہوتی ہے لیکن میرے لیے تو یہ ایک بدترین تجربہ تھا۔

میری ڈیوٹی صرف اس حد تک تھی کہ میں عکس کے حسن کو خراج تحسین پیش کرتا رہوں اور وہ مجھے بتاتی رہے کہ صرف میں ہی نہیں بلکہ ہم سب اس ڈیوٹی سے کس قدر کم تر رہے پر فائز، عام شکل و صورت والے انسان ہیں۔

وہ کبھی اگر پریشان ہوئی بھی تو جانتی ہیں کس بات پر کہ اگر ہمارے آنے والے بچے شکل و صورت میں اپنے خاندان میں چلے گئے تو کیا ہوگا؟ آپ پلیر ایک بار اس سے پوچھیے گا کہ میرے گھر والوں کے کس حق کو کس فرض کو اس نے ایک دن بھی ادا کیا ہو یا میرے لیے اس نے خوشی سے کبھی کوئی کام انجام دیا ہو اگر کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس نے اپنی طبیعت پر جبر کیا ہو۔“

اس شام صبا بہت دیر دہاں بیٹھی رہی۔ جانے سے پہلے بھی اس کو احساس تھا کہ ان اچھے لوگوں کو عکس اور مدرخ نے جی بھر کر ستایا ہوگا لیکن خضر اس حد تک بے زار ہو گیا ہے اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔ یہ ایک ہاری ہوئی بازی تھی۔ اس نے اب آخری بار عکس سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

عکس ایک تباہ حال عورت کی تصویر بنی کمرے میں بیٹھی تھی۔ مدرخ فون پر گرج برس رہی تھی اور کسی کو بتایا جا رہا تھا کہ خضر نے شرافت کا غلط فائدہ اٹھایا ہے اور اب وہ بھی اس گونا گوں بچے چوہا دیں گے۔ ”ارے پورے سات لاکھ روپے مہر لکھوایا تھا میں نے، ان ٹٹ پونجیوں کو پتا لگ جائے گا جب پیسے دینے پڑیں گے۔“

صبا عکس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی پھر ہولے سے اس سے پوچھا۔ ”میری جان! اب کیا ارادے ہیں۔ کچھ سوچا ہے تم نے؟“ عکس دوبارہ سے رونے لگی۔

”پھپھو! خضر تو مجھ سے بہت محبت کرتے تھے پھر میرے ساتھ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟“

”عکس! میں کل خضر سے مل گئی تھی۔ وہ اب بھی تم سے بہت محبت کرتا ہے لیکن تمہاری کچھ غلطیوں نے اس کو اس اقدام کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ خود اس کے گھر والے اس بات پر خضر سے بہت ناراض ہیں۔ تمہاری ساس نے تو کہا ہے کہ وہ گھر چھوڑ کر ہی چلی جائیں گی اگر خضر نے دوسری

طلاق بھی۔“

”ہونہہ! یہ سارا کیا دھم اس بڑھیا اور اس منحوس چڑیل کا ہے۔“ عکس کے منہ میں بالکل اپنی ماں کی زبان تھی۔ صبا نے قدرے سختی سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ اتنی بڑی شوگر کھا کر بھی وہ سنبھلی نہ تھی۔

”عکس! خضر کو تم سے یہی شکایت ہے کہ تم نے اس کے کسی رشتے، کسی خوشی، کسی غم کو کبھی نہیں اپنایا۔“

”میں کیا کرتی۔ ان لوگوں نے مجھے بھی اپنا سمجھایا نہیں۔“

”چلو مان لیا انہوں نے نہیں اپنایا۔ تم کوشش کرتیں، اپنا دل بڑا کرتیں، خضر سے محبت کے صدقے میں ہی ان لوگوں کی غلطیوں کو نظر انداز کرتیں۔ ان سے ٹھکنے ملنے کی کوشش کرتیں۔ تم تو خود دیاں پر سب سے بڑی مہمان بن کر رہ رہی تھیں۔ اس دد پھر جب تم نے دعوت کے لیے کھانا بنایا تھا، عکس! تمہیں کچن میں کسی مسالے، کسی برتن، کسی کینٹ کے بارے میں کچھ پتا نہ تھا۔“

عکس تھوڑی سی شرمندہ ہوئی۔ ”پھپھو! مجھے کھانا پکانے کا شوق ہی نہیں ہے۔“

”بیٹا! کھانا پکانا محض شوق نہیں، ضرورت ہے۔ جیسے سانس لینا، کیا تم یہ کہو گی کہ مجھے سانس لینے کا شوق نہیں۔ بلاوجہ کی مشقت لہذا میں سانس ہی نہیں لیتی۔ دیکھو عکس، میاں بیوی کا رشتہ بہت بڑی سانچھ ہے۔ ایسی سانچھ داری جو دنیا کے کسی اور رشتے میں نہیں ہوتی، تب ہی تو ہمارے مذہب میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔

بد قسمتی سے بہت سی عورتیں اس رشتے کو پانی پت کی جنگ سمجھ لیتی ہیں کہ جو جیتے گا اسی کو بادشاہی ملے گی۔ بیٹے! اس رشتے میں جو ہارتا ہے وہ فاتح ہوتا ہے۔ بس ایک بار اپنا آپ خضر کے آگے ہار کے تو دیکھو تم دیکھنا جیت تمہاری ہوگی۔

اس شرط پہ کھیلوں گی، پیار کی بازی جیتوں تو تجھے پاؤں، ہاروں تو پیا تیری

”عکس! ایک بات کہوں تم نے کبھی غور کیا۔ بھابھی اور بھائی کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ دونوں بلا ضرورت ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔ ان کے پاس ایک دوسرے سے شیر کرنے کے لیے کوئی جذبہ، کوئی لمحہ، کوئی موضوع نہیں ہے۔ وہ ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے قطبین کے فاصلے پر ہیں۔ عکس! تم نے بھائی سے زیادہ تنہا انسان دیکھا ہے۔ کبھی تم نے دیکھا کہ بھائی کی نظر جب بھابھی پر پڑتی ہے وہ کتنی خالی ہوتی ہے۔ اس نظر میں محبت کی کوئی جوت نہیں ہوتی، اس نظر میں کسی رفاقت کا کوئی بد ہم سادیا بھی روشن نہیں ہوتا۔

عکس! ایک بار ضرور سوچنا کیا مدرخ بھابھی دنیا کی سب سے ہاری ہوئی عورت نہیں ہیں۔“

مدرخ ایک جھٹکے سے کمرے میں داخل ہوئی۔ ”ادبی بی! جاؤ ہمیں نہ سمجھاؤ۔ اپنی راہ لگو۔“ اس نے صبا کو بہت حقارت سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بہت تم خضر کی سگی ہونا! جاؤ۔۔۔ اس سے کہو کہ ہمیں ایک ایک کر کے طلاق نہ بھیجے۔ اکٹھی دے۔ بڑا جگر ہے مدرخ کا اور ہاں ساتھ ہی مہر کی رقم بھی بھجوا دے۔ نہ عدت کے اگلے دن امریکہ پلٹ لڑکے سے عکس کی شادی کر دانی تو میرا نام بھی مدرخ

نہیں۔“ آپ کے اس نے اپنا ہاتھ منہ پر پھیرتے ہوئے کہا۔
 ”عکس! تم بھی اٹھ کے تیار ہو جاؤ۔ وہ لوگ آج شام کو آئیں گے۔“
 صبا تو صبا خود عکس بھی حیرت سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کمزوری اور جہالت کا مظاہرہ خود عکس کے
 وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

حیرت کے جھٹکے پر قابو پا کر عکس ایک جھٹکے سے اٹھی۔

”امی! آپ کی ہمت کیسے ہوئی اس سوچنے کی بھی۔ میں خضر کی بیوی ہوں اور آپ مجھے دیکھنے کے
 لیے لوگوں کو بلارہی ہیں، امی! مجھے بہت گھن آ رہی ہے آپ سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔ آپ مجھے
 بھی اپنی طرح سمجھتی ہیں نا کہ ایک مدت بعد بھی ابو کی محبت کی ایک رمت آپ کے دل میں نہیں ہے۔“
 اب عکس غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

”اتنے سالوں زندگی کی بساط پر اپنی مرضی کے مہرے چلا چلا کر اپنی بیٹی کو بھی ایک مہرہ ہی سمجھ بیٹھ
 ہیں جس کے ذریعے چند شریف اور اچھے لوگوں کے منہ پر آپ بدنامی کی کالک مل سکیں۔“ وہ بھی تو مرد رز
 کی بیٹی تھی۔ منہ پھٹ، بد لحاظ لیکن آگہی کے لمحے نے خوش قسمتی کے در اس کے لیے دائیہ تھے۔ یہاں و
 مردخ سے حیت لگی تھی۔

مردخ پہلے تو ششدر ہی رہ گئی تھی۔ اب ذرا سنبھل کر دوبارہ بولی۔ ”ہائے ہائے میری بچی! کہ
 اول فول بک رہی ہے۔ صبا! تجھ پر اللہ کی بار۔ کیا کر دیا تو نے میری بچی کو۔ ارے رقیہ بیگم، ارے
 فیشان۔“ وہ روایتی واویلا شروع کرنے کے لیے میدان میں آگئی تھی۔ عکس نے اس کو سختی سے روک دیا۔
 ”خبردار امی! جو اپنی گندی زبان سے ان اچھے لوگوں کا نام لیا۔ جن کی شرافت، نیکی کو آپ نے
 ایک تماشا بنائے رکھا اور از خود سمجھتی رہیں کہ آپ نے میلہ ٹوٹ لیا ہے۔ کاش امی! مجھے یہ بات پہلے سمجھ
 میں آ جاتی کہ لوگ آپ سے اور ہم سے کیوں گریز کرتے ہیں، وہ ہماری خوب صورتی سے جلنے نہیں بلکہ
 ہماری بدسیرتی سے خوف کھاتے ہیں۔ ہمارے خاندان کے، میری سسرال کے، ہمارے محلے کے، ہر جگہ
 کے لوگ آپ کی زبان میں ان کا لے پیلوں سے جھک کر ملتے ہیں۔“

میرا شوہر، صبا پھپھو کو ایک آئیڈیل عورت سمجھتا ہے امی!“ وہ اب ادنچا اونچا رو رہی تھی۔ ”آپ کی
 زندگی تو نکلے دامتا شا ہے آپ دنیا کی سب سے باری ہوئی تنہا اور بد صورت عورت ہیں۔“
 مردخ اب منہ کھولے اپنی بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تو راجدھانی کی ملکہ تھی۔ اس کے پاس پامالی کا ہر
 حق محفوظ تھا پھر اس کی بیٹی یہ کون سا آئینہ دکھا رہی تھی۔

”آپ اس دنیا میں اللہ کا امتحان ہیں جو وہ اپنے نیک بندہ سے لیتا ہے۔ امی! کاش ابو، خضر کی
 طرح کا کوئی فیصلہ کر لیتے تو آج ایسی برباد زندگی نہ گزار رہے ہوتے۔“

”پھپھو! وہ صبا کی طرف بولی۔“ آپ اور دادی، مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں۔ ان کو بتا آئیں کہ
 میری غلطیاں قابل معافی نہیں لیکن ان کے ظرف اعلیٰ ہیں، مجھے معاف کر دیں۔ مجھے اس تماشے کا حصہ
 نہیں بننا۔ میں نکلے کی عورت نہیں بننا چاہتی بلکہ محبتوں کو حیرت کرانمول ہونا چاہتی ہوں۔“

خوب صورت غلطی

”یہ کیا بات ہوئی میں لاہور میں رہتی ہوں اور جاب اسلام آباد میں ملی ہے۔“ مارہ نے
 بائنٹمنٹ لیٹرائی کو دکھاتے ہوئے تبصرہ کیا۔

”امی! میں رہوں گی کہاں؟“

”ارے بھئی! تمہارے بچا کا گھر جو ہے۔ تمہاری واوی اماں بھی ان ہی کے پاس رہتی ہیں۔“
 ”اگر وہاں میرا دل نہ لگا تو۔۔؟“ اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

”ضرور لگے گا۔ احمد، ارسل، ندا، ردا اور راجہ سب تمہارے کزن ہیں۔ دیکھنا وقت گزرنے کا پتا
 بھی نہیں چلے گا۔“

مارہ عدم دلچسپی سے جانے کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆

راولپنڈی اسٹیشن پر وہ بے زار سی کھڑی اپنے استقبال کے لیے آنے والے بندے کو ڈھونڈ رہی
 تھی۔

”مارہ! ارے بھئی ادھر دیکھو، میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں، شکر ہے تاپا ابو نے تمہاری فوٹو
 گراف پوسٹ کر دی تھی۔ لاؤ اپنا سامان دو۔“ مارہ نے چونک کر گردن موڑی۔

سیاہ جینز اور لائٹ بلو شرٹ میں بیوس گندی رنگت اور چمکتی سیاہ آنکھوں میں لا پرواہی اور بے
 نیازی کا تاثر لیے وہ نوجوان ارسل ہی ہو سکتا تھا۔

”السلام علیکم ارسل۔“ وہ شائستگی سے گویا ہوئی۔

ارسل کی آنکھوں میں حیرت اور دلچسپی ایک ساتھ جاگ پڑی۔

”واؤ۔۔۔“ اس کے ہونٹ دائرے میں تنچ گئے۔ ”تم نے بنا تعارف کے نام بوجھ لیا۔“
 ”آنا جانا بے شک لڑکپن میں ختم ہوا، مگر بچپن تو ہم سب کزنز کا اکٹھے گزرا تھا۔“ وہ سادگی سے
 سکرائی۔

”تاپا ابو لاہور جاب ملنے کے بعد بس لاہور کے ہی ہو کر رہ گئے۔ کبھی سال بعد چکر لگایا بھی تو
 کیلے، تانی جان بھی اکیلی ہی آئیں۔ کیونکہ کبھی تمہارے ایگزٹام ہو رہے ہوتے تھے تو کبھی تم اپنے کورسز

میں مصروف ہوتی تھیں اور کبھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی تھی۔“ ارسل نے شکایتی انداز میں کہ اس کا سامان لے کر اسٹیشن کے Exit گیٹ کی طرف روانہ ہوا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔
 ”تو آپ لوگوں نے کون سا چکر لگایا۔ بھولے بھٹکے چچی، چچا یا اجیہ آپنی چلی آتی تھیں سال سال اور کسی کو فرصت نہ مل سکی۔ تصویروں میں ہی دیکھتے رہے باقی کزنز کو۔۔۔“ وہ بھی صاف گوئی بولی۔ وہ لوگ اسٹیشن کے احاطے سے باہر آ چکے تھے۔ ارسل نے ایک ٹیکسی کا کرایہ طے کر کے کہا۔
 ”پاکستان ٹاؤن۔۔۔“

”یہ کون سا علاقہ ہے؟“ ماڑہ کو تعجب ہوا۔

اس کو جواب بھی اسی ایریے میں ملی تھی۔

”ابھی کچھ سال پہلے یہاں پلاٹ الاٹ کر کے آباد کاری شروع کی گئی ہے۔ سمجھ لو اسلام آباد، بنڈی دونوں کی آخری حدود میں آتا ہے۔ اسلام آباد ایئر پورٹ کی طرف جاتے ہوئے۔

بڑا خوب صورت، شاداب اور پرسکون علاقہ ہے۔ جب مکمل بن جائے گا تو بڑا وی آئی پی ریئر ایریا نظر آئے گا۔ فطرت کے نظاروں سے مالا مال ہے۔ پہاڑ اونچے نیچے سرسبز ٹیلے، فصلیں، وردہ کے جھنڈ اور خاموش ٹھنڈی فضا۔“

ارسل جانے کس جھونک میں تفصیل سے اپنے ایریے کے بارے میں بتاتا چلا گیا۔
 ”لیکن دادا جی کا گھر تو بنڈی میں تھا۔“ ماڑہ کا بچپن بنڈی میں ہی گزرا تھا۔ چھٹی کلاس میٹر جب اس کے والد کی لاہور ٹرانسفر ہوئی، وہیں پلاٹ لے کر گھر کی تعمیر شروع کرادی۔ گھر مکمل، سرکاری رہائش گاہ چھوڑ کر اپنے ذاتی گھر میں منتقل ہو گئے۔
 ”بنڈی والا مکان تو کب کا کب گیا۔“ وہ لاہور وائی سے بولا۔

”ان ہی پیسوں سے پاکستان ٹاؤن میں دس سرے کا پلاٹ لے کر گھر بنایا ہے۔ تین چار ہونچکے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے۔“

ماڑہ کی آنکھوں میں شدید تحیر اور نفوس ناک تاثر نمایاں ہو گیا۔ آبائی گھر بیچ دیا اور اب کو اس کا بھی نہ کی۔ نہ ان کے حصے کی رقم ادا کی۔ غالباً افضل پچانے یہ جواز جواب کے لیے سوچ رکھا ہوگا کہ بھائی کو اس رقم کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں اللہ نے ہمیشہ ترادے رکھا ہے۔ اتنی اچھی پوسٹ پر ہیں پھر ہی ایک بیٹی ہے۔ جب کہ میرا پورا کنبہ کھانے والا ہے۔ بیٹیاں بیٹے سب جوان ہیں۔ ان کی شادیاں اور دیگر اخراجات یہ دس لاکھ روپیہ شکیل بھائی تو بینک میں ہی رکھیں گے نا۔ ان کے لیے اضافی ہوگی جب کہ میں ان ہی پیسوں سے ڈبل اسٹوری گھر بنالوں گا، غالباً دادی نے بھی اپنا حصہ دے دیا تھا۔ چچا کی تو مومن ہوگی۔

آگے چل کر ٹیکسی ہائی وے چھوڑ کر دائیں طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی جہاں تیر بنا ”پاکستان ٹاؤن“ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ٹیکسی ایسی سڑک پر آ گئی جس کے ایک طرف مکانات کا سلسلہ تھا اور دوسری ط خالی پلاس، اونچے نیچے پتھر لے ٹیلے اور خورد و جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔

”بس یہیں روک دو بھائی۔“ ارسل کے اشارے پر ڈرائیور نے سبز شیڈ کے شیشوں والے ہلکے سبز گھری سبز ٹانگوں والے گھر کے آگے گاڑی روک دی۔

”وہ سامنے دیکھو۔“ ارسل نے کرایہ دے کر اترتے ہوئے ماڑہ کو متوجہ کیا۔

”یہ ابو کا آفس ہے۔ ابو پر اپنی ڈیلنگ کا کام کرتے ہیں، اس جگہ یہ کاروبار عروج پر ہے۔“ ذرا ایک چھوٹی سی دکان نما عمارت اکیلی کھڑی تھی، اس کی پیشانی پر ”پر اپری ایڈوائزر“ کا بورڈ لگا ہوا۔

وہ ارسل کی رہنمائی میں اندر آ گئی۔

ہر چیز موجود تھی مگر مناسب جگہ اور ترتیب کے لیے ترس رہی تھی، غالباً کسی کو اتنی فرصت یا توفیق نہ کہ ڈرائنگ روم یا لاونج اور سنگ روم کی آرائشی چیزوں کو ٹھکانے نہ رکھتا یا بکھرے کفن، صوفے اور کرسیوں پر پڑے الم نظم چیزوں کو ہٹا کر کسروں کی صفائی اور ترتیب کا خیال کرتا۔

مکینوں کی ذات اور طبیعت میں بھی وہی لا پرواہی اور بے ترتیبی پائی جاتی تھی ان سے مل کر اندازہ

☆ ☆ ☆

”ابن! یہ کیا ہنگامہ مچایا ہوا ہے تمہارے بچوں نے؟“

وادی اماں نے بہت تنگ آ کر یاسمین چچی سے شکایت کی تھی۔ چچی کا منہ بن گیا۔

”اماں! بچوں کی چھٹیاں ہیں۔ دو گھڑی تفریح کر کے خوش ہو لیتے ہیں۔ آپ تو بس ان کے پیچھے جاتی ہیں۔“

”اے، کیسے نہ پیچھے پڑوں، سارے جہاں کا لپا لپٹنگا دی والے کمرے میں جمع کیا ہوا ہے۔ پہلے پھاڑ میوزک پلچھلتے گھومتے ناچتے جیتے رہے، اب فلم لگا کے دیکھ رہے ہیں۔“

”تو کیا ہوا؟“ اجیہ آپنی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”آپ کا کمر تو ویسے بھی کافی دور ہے۔ وہاں تک نہیں جاتی۔“

”آواز جانے یا نہ جانے کی بات نہیں ہے لڑکی۔“ وادی سختی سے گھور کر بولیں۔

”یہ احمد تو بس انڈین فلموں کا چلتا پھرتا وزیر نشریات بن کے رہ گیا ہے۔ ادھر سے ندا اور ردا، بھلے سے دس سال پرانی فلم کے بارے میں پوچھ لو، فر فر اس کی کہانی سنا دیں گی۔“ وادی صوفے پر بیٹھ

”اے اپنے شوق کی بات ہے اماں۔“ چچی بے زاری سے بولیں۔

”اس گھر میں رہنے والوں کے تو سارے شوق ہی نرالے ہیں۔“ وادی حمل کر بولیں۔

”اماں! آپ کو میرے ہی بچوں میں سارے عیب نظر آتے ہیں۔ رانیہ کے بچے بھی تو ہر وقت سی لیسر اور وی سی آر سے چکے رہتے ہیں، جب آتے ہیں لی وی لاؤنج میں جم جاتے ہیں۔ بلکہ اسی کے مانے میرے بچوں کو یہ لت لگاتی ہے۔“ چچی نے وادی کی سب سے لاڈلی بیٹی رانیہ کا حوالہ دیا۔

وادی کو اپنی اکلوتی بیٹی سے بہت پیار تھا۔ اور چچی کو ہمیشہ سے پیار و محبت کے یہ مظاہرے کھلتے

”خیر، یہ بات تو غلط ہے۔“ وادی نے ناک سے مکھی اڑائی تھی گویا۔

”میری رانی کے بچے بڑے تیز دار اور ذہین ہیں۔ بالکل اپنی ماں پر گئے ہیں۔ صورت شکل بھی

اٹھ کر آصفہ کو ناشا لگانے کا کہنے لگیں۔

رانی کو بتادینا۔ اگلے جمعے کو اس کے ڈیڈی کی برسی ہے۔“ امی نے آہستگی سے احسن کو مخاطب کیا وہ بھلا کیسے بھول سکتی ہیں۔۔۔“ احسن نے گہری سانس لے کر سوچا تھا۔ آخری لمحوں میں موت نے ہوئے تو ڈیڈی نے انہیں پکارا تھا۔ انہیں دیکھنے کی تمنا کی تھی۔ اور وہ شادی کے کئی برس بعد پہلی آئی تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ ہاتھ پر مسٹ داج باندھتا ہوا آیا۔

اچھا! میں چلتا ہوں۔“ براؤن چیک کی شرٹ اور ڈارک براؤن پینٹ میں ملبوس اونچے لمبے مندار درجہ بیٹے کو دیکھ کر ان کے دل میں اندر تک ٹھنڈک اتر گئی۔

اچھا بیٹے اللہ کے سپرد! انہوں نے چاروں قل پڑھ کر اس پر پھونکے۔ محبت بھری نظروں سے نے جانے کی اجازت دی۔

☆☆☆

س کی جوائنٹنگ کا پہلا دن تھا۔

ایک پرائیویٹ کنسٹرکشن کمپنی میں بطور آرکیٹیکٹ مقرر ہوئی تھی۔ فی الحال اسے جو نیئر سیٹ ملی افس دیا ہی تھا جیسے کہ سب متول مالکان کا ہونا چاہیے۔ قیمتی فرنیچر وال ٹوال کارپینٹنگ پر بچھے لیے، شاہکار قسم کی پینٹنگز، ٹیس اور عمدہ الٹیشنری اور سینٹرلی ایریز کنڈیشنڈ ٹھنڈا بجستہ ماحول۔ ہاپنا اعتماد بحال کرنی چراسی کی رہنمائی میں اپنی سیٹ پر فروکش ہو گئی۔

نورڈی ویر بعد ایڈمن انچارج رحیم علی تشریف لے آئے۔

”آپ ہمارے ادارے کے سب سے سینئر اور ٹیلنٹڈ آرکیٹیکٹ احسن فاروقی کے انڈر کام کی اور اپنے معاملات کے لیے ان ہی کے آگے جوابدہ ہوں گی اس کے علاوہ آپ گائیڈنس کے اسے رجوع کر سکتی ہیں۔ وہ یقیناً آپ سے پورا تعاون کریں گے۔“

”احسن صاحب کو مطمئن کرنا آسان کام نہیں ہے بی بی۔“

انچارج صاحب کی روانگی کے بعد اس کی سیٹ کے عین مقابل بیٹھی سانولے رنگ اور دراز چوٹی ارٹ کی لڑکی نے اس پر اچھتی سی نظر ڈال کر مصروف سے انداز میں مطلع کیا۔

مازہ چوک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”دہ خا صے“ مشکل پسند“ واقع ہوئے ہیں۔“ مازہ نے محسوس کیا اس کا انداز دوستانہ تھا۔

”ہزار میں بیچ اور کیڑے نکالنے کے بعد وہ چیز کو“اوکے“ کرتے ہیں۔ میرا تو ہر وقت کا واسطہ رہتا ہے۔ اس لیے مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ اور نئے بندے کو تو وہ خون کے آنسو رلا دیتے

”مائی گاڈ۔۔۔“ مازہ حد درجہ پریشان ہو گئی۔

”ارے بھئی، اب ایسی خوف زدہ ہونے والی پتویشن بھی نہیں ہے، خاطر جمع رکھو اگر محنت اور ذمہ اس کے ساتھ کام کر دگی تو دنوں میں ان کے دل پر چڑھ جاؤ گی۔“

”جی! اس کی“ جی میں جی بھر کر اچھا شامل تھا۔

ایک سے بڑھ کر ایک اور بھولی بھالی، تمہاری اولاد تو رنج کے ڈھیٹ ہے۔ نہ کسی کی سنتی ہے نہ اور نہ کسی کے کہنے میں ہے۔ وہی کرتی ہے جو من میں ساتا ہے۔“

”خیر! دادی یہ تو شخص آپ کی اقربا پروری۔“ اجیہ آپی نے ناک چڑھائی۔

چچی دادی کی جانبدارانہ رائے پر جل جل بھن کر خاک ہو گئیں۔ مگر اپنی جلن جتانہ سکیں

☆☆☆

”احسن۔۔۔“

”جی امی۔۔۔“ وہ ہلکے براؤن شلوار قمیص میں سر پر تولیہ رگڑتا ہوا تھر روم سے برآمد ہوا تھا۔

”بیٹے! آفس جاتے ہوئے راستے میں اپنی بہن کی طرف سے ہوتے جانا۔ یہ گوشت چا

اور کچھ الیں رکھی ہیں میں نے تھیلے میں۔ یہ اسے دے دینا۔“

انہوں نے تھیلے کو سائیڈ بیسل پر رکھ دیا۔

”خواجہ اوزد حمت کر رہی ہیں۔ رانی آپ انہیں لیں گی، جانتی تو ہیں، آپ جب بھی کوئی چیز وہ مجھ پر شدید خفا ہوتی ہیں۔ وہ بھتی ہیں گویا ہم ترس کھا کر انہیں اور بچوں کو بھیک دے رہے ہیں احسن آہستگی سے گویا ہوا۔ امی کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”دو پاگل ہے، بے وقوف۔۔۔“ ان کی آنکھیں بھرا آئیں۔

”ماں باپ اپنے دل پتھر کر لیں تو پھر لوگ محبت اور معافی کے لیے کس رشتے کی مثالیں گے، پھر بھلے اس نے ہماری مرضی کے خلاف ضد کر کے پسند کی شادی کی ہے۔ لیکن اس کام نہیں ہے کہ اسے بہت بڑا ناقابل معافی جرم سمجھ کے انسانیت کے ناطے بھی اسے سہارا نہ دیا جائے وہ اپنے میاں کے ساتھ خوش حال اور خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوتی تو ہم اپنی خفگی کو جواز بنا خیال کرتے مگر اب مصیبت میں کسی کو تنہا چھوڑنا اور وہ بھی اتنے قریبی رشتے کو اپنے بس کی ہے۔“ انہیں کچھ برس پہلے کے اپنے ہی کہے ہوئے الفاظ یاد آ گئے۔

”ہم تمہاری ضد پر تمہاری مرضی کے شخص سے شادی تو ضرور کر رہے ہیں، لیکن اس کے تمہارا کوئی واسطہ، تعلق نہیں رہے گا۔“

لیکن رانی کے حالات دیکھ کر زیادہ عرصے تک اس سے لاتعلقی اور بے گانہ نہیں رہ سکی تھیں ”میں تو پہلے بھی آپ سے یہی کہتا رہا ہوں کہ رانی آپ اپنے گھر کے دروازے بند نہ کر سہوا۔ اس وقت وہ کراسس سے گزر رہی ہیں اور ایسی صورت حال میں انہیں کسی اپنے کی ضرورت ہے۔ وہ لا لکھ خود دار سہی مگر بچوں کی ضروریات آڑے آ جاتی ہیں۔ دونوں میاں یہ مسائل سے عہدہ برآ ہونے اور ان سے نکلنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں مگر۔۔۔“ احسن بانہ چھوڑ کر گہرا سانس لے کر کچھ سوچنے لگا۔

”اس بد نصیب پر تو آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔“ امی نے آہ بھری۔

”امی جلدی سے ناشا لگوا دیجیے۔ مجھے آفس سے دیر ہو جائے گی۔“ احسن نے وارڈر

استری شدہ پینٹ شرٹ برآمد کی۔ وہ ماں کو رنجیدہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے بات بدل گیا۔

”میرا مطلب ہے ان کی پسندیدہ ورکر بن جاؤ گی۔“
وہ کھل کر مسکرائی۔ مارہ کی سانس میں سانس واپس آئی۔

عجیب طرح کا مزاج پایا تھا اس لڑکی نے۔ بے تکلف سا، چونکا دینے والا اور بے پروا سا۔
بہر حال اس کی وجہ سے خاصی ڈھارس ہوئی تھی اس نے پنج بریک تک آفس کے بہت
اور کام کی نوعیت کے متعلق بتایا تھا نہیں بتایا تو اپنا نام۔
”تم نے ابھی تک اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔“
”میرا نام۔۔۔!“ وہ شرارت سے آنکھیں نچا کے کچھ سوچنے لگی۔ ”آں۔۔۔ آں۔۔۔“
”تیز بی بی۔“

”ہائیں۔۔۔“ مارہ ہنسی کی صورت دیکھنے لگی۔

”اچھا۔۔۔! پسند نہیں آیا چلو پھر کرسی یا میڈیم میئر بھی کہہ سکتی ہو۔“ وہ ہنس دی۔
”یہ کیا پہلیاں بھجوا رہی ہو۔ بتاؤ اسیدھی طرح۔“ مارہ نے دوستانہ حق جتاتے ہوئے
دیکھا۔ ”معزز اردو میں مبدولت کو شائستہ کہا جاتا ہے۔
”شائستہ اخلاق۔۔۔“ وہ شوشی سے کہہ کر مسکرائی۔
”بہت خوب۔۔۔“ مارہ کو ہنسی آنے لگی۔

”اچھا جس شائستہ اخلاق اب مجھے کچھ پیٹ پوجا کرائیں پہلے تو موصوفہ احسن صا
بارے میں بھیا تک ساخا کہ شیخ کے ڈرائی رہیں پھر کام کی تفصیلات سنا کر دہلادیا۔ اب چاہئے
رہ کر بالکل ہی فوت ہو جاؤں۔“ وہ سیٹ سے اٹھ گئی۔

”ویسے احسن صاحب ابھی تک تشریف نہیں لائے۔“

”تشریف تو ضرور لائے ہوں گے کہ نہایت بنگلہ کل واقع ہوئے ہیں البتہ تمہاری طلبی پڑ
پتا نہیں انہیں خبر بھی ہوئی ہے یا نہیں۔ بہر حال تھوڑی دیر میں کال کر لیں گے۔“
لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ سارا دن اسی طرح گزر گیا۔

اس نے چر اسی کے ذریعے پیغام بھجوایا تو پتا چلا وہ کسی اہم پروجیکٹ کے سلسلے میں ساء
باہر چلے گئے ہیں اور ممکن ہے شام تک نہ آئیں لہذا صبح اسے کال کریں گے۔
”لو جی تمہاری تو ہو گئی چھٹی۔“

شائستہ نے ہاتھ جھاڑے۔

”ارے نہیں یار! مجھے تو سخت پریشانی ہو رہی ہے۔ خدا جانے کس طرح پیش آئیں گے
تھا آج ہی یہ بوجھ سر سے اتر جاتا۔“ وہ الجھ کر بولی۔

”کم آن یار! اب وہ کوئی جن بھوت بھی نہیں ہیں۔“ شائستہ اس کے چہرے پر آتے جا
کو محفوظ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”چپ کرو تم۔۔۔“ مارہ نے خفا نظروں سے اسے دیکھا۔ ”پہلے دل دہلا دیا اب بات
ہو۔“ شائستہ ہنس دی۔ پھر اپنا بیک اٹھا کر کندھے سے لٹکایا۔ اور اسے اشارہ کیا۔
”اچھا چلو اٹھو، دین آئی ہے۔“

”کیا۔۔۔۔۔ ٹرانسپورٹ فری ہے کمپنی کی طرف سے۔“ وہ اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے
پوچھ رہی تھی۔
”نہیں، پانچ سو روپے کٹتے ہیں پے میں سے۔“
دونوں باتیں کرتی باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

”اجیہ آپ! کہاں جا رہی ہیں؟“ وہ شام کی چائے کے بعد اجیہ آپ! کو بیگ لے کر نکلتے دیکھ کر
پوچھنے لگی۔
”ڈراما رکیٹ تک جا رہی ہوں، موڈ ہے تو چلی چلو۔“

انہوں نے ایک طائرانہ نگاہ اس پر دوڑاتے ہوئے ازراہ موت پیش کش کی۔ جسے قبول کرنے
میں اس نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ فی الحال وہ صرف بوریت سے ہی شغل فرما رہی تھی۔
”آئی۔۔۔!“ مارہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔

”یہ جگہ خاصی ہنسنا اور خاموش سی ہے۔ کیا آپ لوگوں کو اس کیلئے باہر جاتے ہوئے ڈر نہیں لگتا۔“
”بھئی! اب تو عادت سی ہو گئی ہے۔“ اجیہ آپ! کا موڈ یقیناً خوش گوار تھا جو اس سے دلچسپی سے محو
گفتگو تھیں وگرنہ عام حالات میں وہ ساری دنیا سے خفا اور بے زار دکھائی دیتی تھیں۔

مارکیٹ بہت اچھی بنی ہوئی تھی۔ صاف ستھری، جدید طرز کی اور تمام تر ضروریات زندگی سے بھری
ہوئی۔ ”میں نے شاپنگ کی اتنی پرسکون اور بے آواز جگہ پہلی مرتبہ دیکھی ہے۔“ مارہ نے اظہار خیال
ضروری سمجھا۔

کشادہ سڑک کے کنارے ایک طرف مارکیٹ تھی اور دوسری طرف خوب صورت اور جدید طرز
تعمیر کے شاہکار بنگلے قطار میں بنے ہوئے تھے۔
اجیہ آپ! شاپنگ کرتی رہیں اور وہ دلچسپی سے شاپنگ سینٹر کے باہر کھڑی اطراف کے مناظر
کا جائزہ دیتی رہی۔

اجانک اس کی نظر سڑک کے پار بنے براؤن اور آف وائٹ کبی نیشن کے ماربل کے بنگلے سے نکلتی
نئی ماڈل کی کار پر پڑی۔

اس کو ڈرائیو کرنے والی شخصیت پہلی ہی نظر میں بڑی ہی متاثر کن اور باوقار دکھائی دے رہی تھی۔
سیاہ گھنے بالوں والا بھرپور توانا بازو اسٹیمرنگ ڈھیل کو حرکت دے رہا تھا۔ کلائی پر قیمتی گھڑی تھی جس کا
ڈائل دھوپ پڑنے سے دور سے ہی چمک رہا تھا۔

گاڑی گھر کی روش سے نکال کر اس نے روڈ کراس کر کے عین مارہ کے پاس لاکھڑی کی۔ وہ بے
اختیار و دو قدم اچھل کر پیچھے ہٹی۔

وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔
نوجوان کا چہرہ بلا کا سنجیدہ اور گھمبیر تھا۔ پھر وہ دروازہ بند کر کے شاپنگ سینٹر میں گھس گیا۔ مارہ
کی جان میں جان آئی۔ محض پانچ منٹ بعد وہ واپس آ گیا تھا۔

”اوہ۔۔۔“ اس کے ہونٹ بے اختیار سسک گئے۔ یہ تو وہی نوجوان تھا جسے کل مارکیٹ کے سامنے

یکھا تھا۔

”باقی کام آپ خود سمجھا دیجئے گا۔ میں چلتا ہوں۔“ سر ہاشمی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جی سر۔۔۔“ احسن احتراماً اٹھ اہو گیا۔

”ہاں تو بی بی! آپ کا پہلا میٹ یہ ہے کہ آپ ایک سنگل اسٹوری گھر کا نقشہ بنا کے دکھائیں۔

نام چار بجے آف ہوگا اور آپ کو کم از کم تین بجے تک کام مکمل کر کے ٹیبل پر رکھ دینا چاہیے۔“

وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے انداز میں سنجیدگی نمایاں تھی۔ احسن نے بغور اس کا جائزہ لیا۔

اس لڑکی کی آنکھوں میں کچھ کر دکھانے کی خواہش چمک رہی تھی۔ البتہ چہرے کے تاثرات سے

گھبراہٹ اور قدرے بے چینی مترشح تھی۔

”آپ میری بات سمجھ گئی ہیں؟“

احسن نے محسوس کیا کہ وہ اس کے یوں ٹھنکی باندھ کر دیکھنے سے پریشان ہو رہی ہے۔ لہذا نظریں

اپنے سامنے رکھی فائل پر جمادیں۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔ سمجھ گئی ہوں۔“

اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

وہ نیوی بلو پینٹ اور اسکاکی بلیو شرٹ میں چہرے پر تازہ شیو کی نیلا میٹیں لیے بہت تازہ دم لگ رہا

تھا۔ ”چلیں پھر کام شروع کریں۔“ احسن اسے یکسر نظر انداز کر کے فائل میں گم ہو گیا۔ وہ کمرے سے

نکل آئی۔

”کیوں۔۔۔ کیا پہلی ملاقات میں ہی جھجھکے چھڑا دیے صاحب بہادر نے۔“ شائستہ اس کی

حالت دیکھ کر ہنس دی تھی۔

”یہ بات نہیں ہے۔“ وہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

”اصل میں ایک توکل سے تم نے ڈراڈرا کے میرا خون خشک کر دیا تھا۔ اوپر سے جاتے ہی ان

کے کمرے میں بڑے سر سے سامنا ہو گیا پھر احسن صاحب نے چھوٹے ہی کام سوپ دیا۔ بس اسی لیے

نروس ہو گئی۔“

اس نے بڑی محنت سے کام مکمل کیا۔ اور آیت الکرسی کا ورد کرتی احسن کے کمرے میں داخل

ہوئی۔ ”گلد۔۔۔“ احسن نے وال کلاک دیکھ کر سناٹشی انداز میں سر ہلایا۔ ابھی صرف ڈھائی بجے تھے۔

مارہ نے خاموشی سے ورک شیٹ اس کے سامنے ٹیبل پر بچھا دی۔

جوں جوں احسن اسے دیکھتا گیا، اس کا موڈ آف ہوتا گیا۔ مارہ دم سادھے اس کا ردِ عمل اور

تاثرات نوٹ کر رہی تھی۔

”آپ نے تو کی پلان (Key Plan) ہی غلط بنایا ہے بی بی۔“ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”سائٹ (Site) کے لیفٹ رائٹ میں کیا ہے۔ اس کی کیا ڈائریکشن ہے کچھ بھی مینشن نہیں

کیا۔ آپ کو سائٹ کی لوکیشن اچھی طرح واضح کرنی چاہیے تھی کہ وہ کہاں واقع ہے اس کے ارد گرد کوئی

ایک اچھتی سی نگاہ اس پر ڈالی اور پھر گاڑی آگے بڑھالے گیا۔

کچھ دیر بعد اسی بنگلے سے تقریباً بیستیس سال کی حزن و ملال اور سنجیدگی کے تاثرات چہرے پر

ایک خوب صورت خاتون باہر نکلی وہ سڑک کے کنارے چلتے ہوئے دائیں طرف کے چوتھے بنگلے میں

کھس گئی۔ غالباً پڑوسیوں کے ہاں گئی تھی کسی کام سے۔

”ایکلی کھڑی بور ہوئی رہیں اندر آجائیں نا۔“ اجیہ آلی شاپنگ بیگز کے ساتھ برآمد ہوئیں۔

”وقت گزاری کے لیے ادھر بڑے اچھے نظارے دیکھنے کو مل گئے تھے۔ ویسے آپ کیا یہ ایریا بھی

پاکستان ناؤن ہے۔ بڑا شاندار اور جدید لک دے رہا ہے۔“

”ہمیں تو کو رنگ ناؤن ہے، یہاں بڑے بڑے ساہوکاروں کے بنگلے ہیں، اس علاقے کی

اسکیم بہت شاندار ہے۔ علاقہ اتنا پرسکون اور خوب صورت ہے کہ کنسٹرکشن کمپنی کے مالکان اور ورکرز نے

خود بھی جگہ لے کر اپنے بنگلے بنا لیے ہیں، اس علاقے میں تعمیرات کا کام بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔ اسی

لیے تو اب باقاعدہ کنسٹرکشن کمپنیاں بن گئی ہیں، وہ بہترین صلاحیتوں پر مشتمل آرکیٹیکٹ، سائٹ انجینئرز

اور بلڈرز کو ہائر کر رہے ہیں۔ تمہاری یہاں جاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ ویسے تمہارا آفس کس جگہ پر

ہے۔“ ”یہیں کہیں ہوگا، مجھے صحیح ایڈریس نہیں پتا۔ ارسل صبح چھوڑ کے آیا تھا، واپسی آفس ٹرانسپورٹ

سے ہوئی تھی۔“

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی پیدل چل رہی تھیں، تقریباً بارہ پندرہ منٹ بعد وہ پاکستان ناؤن پہنچ

چکی تھیں۔

☆☆☆

”مارہ! تمہیں سربلار ہے ہیں۔“ شائستہ ابھی ابھی کسی کمرے سے نکلی تھی اس کی پیشی کا وقت آ گیا

تھا۔

”کون احسن صاحب!؟“ اس کے سینے میں دھک دھک ہونے لگی۔

”ہاں سر بھی انہی کے کمرے میں ہیں۔ شاید وہ باقاعدہ طور پر احسن فاروقی سے تمہارا تعارف

کر دانا چاہتے ہیں۔“

وہ دھڑکتے دل سے دروازے پر احسن فاروقی کی نیم پلیٹ پڑھ کر دستک دینے لگی۔

”کم آن۔۔۔!“

بارعب آواز پر وہ اندر آ گئی۔ ادارے کے سربراہ سر ہاشمی، احسن سے کسی ضروری معاملے کو ڈسکشن

کر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر انہوں نے گفتگوروک دی۔ اس نے سلام کیا۔

”احسن! یہ ہیں آپ کے شعبے کی نئی ممبر، آرکیٹیکٹ مارہ ٹیل۔ یہ لاہور سے آئی ہیں۔ کام کے

سلسلے میں آپ انہیں گائیڈ کریں گے۔ ان کی سیٹ مس شائستہ کی سیٹ کے ساتھ ہے۔ عملی میدان میں یہ

ان کا پہلا قدم ہے۔“

سر ہاشمی دھیرے سے مسکرا دیے۔

”اور مس مارہ! یہ مسٹر احسن ہیں ہماری کمپنی کے مایہ ناز آرکیٹیکٹ اور اس شعبے کے ہیڈ۔۔۔ آپ

کا تمام تر واسطہ اور رابطہ انہی سے رہے گا۔“ مارہ نے نظر اٹھائی۔

سڑک، چوک گراؤنڈ یا عمارت ہے اور کون کون سی روڈ لنک کرتی ہے۔ انٹرنس کہاں کہاں سے ہو ہے۔“ اس کا لہجہ خشک تھا۔
 ”مارے گئے۔“ وہ ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے خاموشی سے سر جھکائے اسے سن رہی تھی
 ”اور فاؤنڈیشن ڈی ٹیل (Detail) میں اسکیل تو واضح ہی نہیں کیا کہ کون سا استعمال کیا ہے۔“

وہ بغور جائزہ لے رہا تھا۔

”ایلی وٹن البتہ قدرے بہتر ہے لیکن اس میں گراؤنڈ لیول اور پلاٹ لیول کے بارے میں
 مینشن نہیں کیا گیا۔ اور ہاں سیکشن K-K میں چھت کتنی موٹی ہوگی کوئی پتا نہیں ہے۔“
 وہ شرمندگی سے ہونٹ چبا رہی تھی۔

احسن کی ساری توجہ شیٹ پر تھی۔

”جی ایف پلان بہت عمدہ ہے لیکن اس میں آپ نے بیڈ کے ساتھ ایچ واش روم کے ایریے
 پیمائش نہیں لکھی کہ اس کی لمبائی چوڑائی کیا ہوگی۔ لاؤنج کی شیب عجیب سی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آ
 نے بیڈ روم کو گنجائش سے زیادہ کھلا کر دیا ہے۔ اسی لیے کچن اور لاؤنج دونوں تنگ ہو گئے ہیں۔“
 ”اف اللہ کتنی گہری نظر ہے۔“ وہ جل کر رہ گئی۔

”سائٹ پلاٹ کی پیمائش کا پتہ لکھا ہی نہیں۔ اس کے بغیر یہ قطعی بے کار ہے۔“ اس نے سائٹ
 پلاٹ پر کر اس لگا دیا۔

ماثرہ کو اس بے عزتی پر رونا آنے لگا۔

اب شیٹ کی سائیز پر بنے لمبے خانے میں لکھی تفصیلات اس کی مرکز نگاہ تھیں۔

”انسیم آف ایریا میں کل ایریا ہے پچاس ہزار مربع فٹ جس میں سے آپ نے اوپن ایریا
 ہے آٹھ ہزار مربع فٹ اور کورڈ ایریا بنے چالیس ہزار مربع فٹ۔ ذرا دونوں کو ٹوٹل کر کے بتائیے گا، با
 کا دو ہزار مربع فٹ کہاں گیا؟“

”میرے اللہ۔۔۔ اپنی ہی حماقتوں پر اسے چکر آنے لگے۔

احسن نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے شیٹ رول کر۔

لگا۔ ”کمال ہے، اگر کام ٹھیک نہ کیا ہو تو کیا یوں بدخواست ہو جاتے ہیں۔“

گہری سانس لے کر احسن نے سنجیدگی سے کہا۔

”دیکھیے ”ٹاپ“ پر کوئی یونہی نہیں پہنچ جاتا۔ پہلے وہ گرتا ہے بار بار گرتا ہے پھر اٹھتا ہے، ق
 درست کرتا ہے، سانس لیتا ہے، پیچھے تجربے کو سامنے رکھ کر اس غلطی کو دوبارہ نہ دہرانے کا عزم کرتا۔
 اور بہت جمع رکھتا ہے اور نشان امتیاز پر پہنچ ہی جاتا ہے۔ غلطیاں سب سے ہوتی ہیں، میں بھی یونہی یہا
 تک نہیں پہنچ گیا۔ آپ غلطیاں ضرور کیجیے لیکن ان کی اصلاح بھی کیجیے، انہیں دہرائیے نہیں اور جب ا
 کی تصحیح کی جائے تو اس کو فور سے سنبھال لیں۔“

”میں جاؤں اب۔“ وہ آنسو روک رہی تھی۔

”ہاں مگر ایک ”آخری“ غلطی بھی سنتی جائیے۔“ وہ مسکرا دیا۔

”آپ نے آرکیٹیکٹ کے سائن والا خانہ تو بنا دیا مگر ”اونز“ کے سائن والا خانہ نہیں بنایا۔“

”اف۔۔۔“ اس نے آنکھیں پتچ کر جھینپ کر اپنے سر پر ہاتھ مارا تھا۔

”آپ کو دوبارہ شکایت نہیں ہوگی۔“ وہ کہہ کر باہر آگئی۔

”او گئے۔“ وہ مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولا تھا۔

☆☆☆

چچی کے سب سے بڑے بیٹے خاور بھائی آئے ہوئے تھے، وہ جاب کی وجہ سے کراچی میں ہوتے
 تھے۔ چچی جان ان کی شادی کے لیے گزشتہ کئی سال سے لڑکیاں تلاش کر رہی تھیں مگر ابھی تک کوئی لڑکی
 ایسی ”دریافت“ نہیں ہوئی تھی جو ان کے ”اعلامعیار“ پر پوری اُترتی۔ اسی چکر میں عمر گزرتی جا رہی تھی۔
 ”کتنے دنوں کے لیے آئے ہو بھائی؟“ اجیہ آپنی قدرے دلچسپی سے پوچھنے لگیں۔

”ایک ہفتے کی چھٹیاں لی ہیں، ویسے کل یاریسوں میں مری نکل جاؤں گا۔“ وہ اندازاً تیس بتیس
 سال کے ہوں گے۔ چہرے پر عمر کے حساب سے چٹکی اور مزاج کے حساب سے کھر دراپن اور کرختگی
 نمایاں تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو کبھی اور کسی حال میں خوش نہیں ہوتے، اجیہ آپنی کی طرح۔
 ”کیوں بیٹے! اتنے مہینوں بعد گھر لوٹے ہو، کیا اپنوں میں بیٹھنے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تمہارا۔ ہم تو
 ترس گئے تھے تمہاری صورت کو۔“

”چھوڑیں امی!“ وہ بخئی سے گویا ہوئے۔ ”میں جانتا ہوں کہ کون کتنا میری وید کا طالب رہتا ہے۔
 یہاں سب اپنے حال میں مست ہیں، کوئی فرق نہیں پڑتا کسی کو اور یوں بھی یہاں رہ کر پورا ہفتہ بور
 ہونے کا میرا کوئی موڈ نہیں ہے۔“

وہ خاصی بے مروتی سے کہہ کر اوپر چلے گئے۔

چچی دل موسوس کر رہ گئیں۔

”دیکھ رہی ہیں آپ اپنے بڑے پوتے کے تیور۔ اجیہ تو اجیہ، اب خاور بھی مجھ سے ٹھیک طرح
 بات نہیں کرتا۔“

وہ ساس کے پاس بیٹھ کر دکھ سکھ کہنے لگیں۔

”قصورتہارا ہے ولہن!“ وادی اماں رساں سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

”بچوں کی عمریں دیکھو، ان کی خواہشات اور خواہاں کی کیا تعبیر دی ہے تم نے۔ گھر بٹھائے بوڑھا
 کر رہی ہو، زندگی کی چاشنی سے لطف اندوز ہونے والی گھڑیاں بے رس گزر جائیں تو روٹیوں میں خود بخود
 کڑواہٹ کھل جاتی ہے۔ کتنی بار کہا ہے کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر کم از کم خاور کی ولہن تو لے ہی آؤ۔ اگر اجیہ
 اور خاور دونوں کی آنکھیں ہو جائے تو اور بھی اچھا ہے۔“

”اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں اماں!“

ان کے پاس گھڑا گھڑا جواب تھا۔

”اپنے معیار کے گراف کو کچھ نیچے لاؤ ولہن! اللہ کو پسند نہیں ہے کہ اس کی مخلوق میں عیب نکال کر

اسے ذلیل درسا کیا جائے، اسے رد کیا جائے۔ ذرا حساب لگاؤ، خادر کے لیے کتنے گھروں کی لڑکیاں ٹھکرا چکی ہو۔ اس کی ناک چھوٹی، اس کی ناک بڑی، اس کے بال چھوٹے، اس کے بڑے، اس کا قد چھوٹا، اس کا لمبا، یہ امیر نہیں ہے، وہ بہت امیر ہیں، یہ جہیز کم دیں گے، وہ جہیز کے ساتھ گھر داماد بنانا چاہتے ہیں معاذ باللہ۔ دوسروں کی بیٹیوں کا تماشا لگاتے لگاتے اپنے گھر کو تماشا گاہ بناتی جا رہی ہو۔“
 دادی نے بے لاگ تبصرہ کیا جو ظاہر ہے چچی کو سخت ناگوار گزرا۔ وہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔
 ”ایک پسند تو آئی تھی برسوں پہلے۔ اسے آپ کے لاڈلے پوتے اسد صاحب لے اڑے۔“ چچی جل کر بولیں۔

دادی اماں کچھ خاموش ہی ہو گئیں۔

کچھ لمحے ماحول پر معنی خیز سکوت طاری رہا۔ سنگ روم کے ایک کونے میں گھسی پیپر شیٹ پر جھکی مائرہ کو یہ سکوت بہت محسوس ہوا۔

”خیر خادرمیاں کے لیے فاروقی صاحب نے انکار کر دیا تھا اور اسد کے لیے بھی نہیں مانے تھے۔ وہ تو ان کی بیٹی نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی تو بیٹی کی زندگی اور ضد کے لیے مجبور ہو گئے اور اسد سے بیاہ دیا مگر اس کے بعد کوئی تعلق بھی تو نہیں رکھا انہوں نے بیٹی سے۔“
 دادی اماں کا انداز بتاتا تھا کہ ان کے دل میں پوتے کے لیے نرم گوشہ بہر حال موجود ہے۔ مائرہ یکنخت کام چھوڑ کر اس داستان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”یہی تو رسوا کن حرکت تھی جس کے سبب اسے گھر سے باہر نکالا گیا۔“ چچی جج گئیں۔ ”جب خادر کے لیے انکار ہو چکا تھا تو اسد کو ان کی لڑکی پسند کرنے اور ہمیں بات کرنے کے لیے بھجوانے کی کوئی تیک نہیں بنتی تھی۔ سو تیلہ ہی سہی مگر خادر اس کا بھائی تھا، کچھ تو شرم کرتا۔ بھائی کی پسند کو اپنی پسند بنالیا۔ وہ تو فاروقی صاحب بیٹی کی زندگی بچانے کے لیے مجبوراً خود چل کر ہمارے ہاں آ گئے در نہ وہ بھی ایک عام سے صحافی کو کہاں قبول کرنے والے تھے۔“ وہ جیسے انکارے چبا رہی تھیں۔

”تم نے اور افضل نے بھی تو بے عزتی کی تھی فاروقی صاحب اور ان کی بیگم کی۔ اسد کا رشتہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسد نے اصرار کیا اور دھمکی دی کہ ہم نے شادی نہ کرائی تو وہ خود کر لے گا تو تم لوگوں نے اسے اس کی بڑھک سمجھا۔ جب وہ سچ بیاہ لایا تو اسے گھر سے نکال دیا۔ بعد میں برسوں تک خبر نہیں لی۔“

”ہم کیوں رکھتے ایسے ناخلف کو اپنے گھر میں۔“ چچی اپنی کدورت اور نفیض چھپانے لگی تھیں۔
 ”میرے بیٹے کا حق چھینا، اس کی جگہ خود دو دلہا بن بیٹھا ہماری بے عزتی کرائی۔ میں تو اسے کبھی معاف نہیں کر دوں گی، نہ میرے جیتے جی وہ اس گھر میں قدم رکھے گا، بس میں نے کہہ دیا ہے۔“
 چچی کی آنکھوں میں شعلے سے دھنکے لگے تھے۔

”یہ اسد صاحب کون ہیں؟“ مائرہ کا جھس آسمان کو چھونے لگا تھا، اس لیے موقع پاتے ہی روا سے پوچھ ڈالا۔

”ابو کی پہلی بیوی کے بیٹے ہیں۔“

”ادہ۔۔۔“ وہ یہ تو بہر حال جانتی تھی کہ چچا افضل کی پہلی شادی ڈیڑھ سال بعد ختم ہو گئی تھی، جب بیوی بچے کو جنم دیتے ہی چل بسی تھیں، یا سسین چچی سے ان کی دوسری شادی تھی۔
 ”یہ وہی روایتی سوتیلے پن کا جلا پاپا ہے یا سچ بچا اسد بھائی کی زیادتی ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔
 ”خیر مجھے کیا۔“ اس نے سر جھٹکا۔ دادی اور چچی کی باتوں کی روشنی میں اس کے دل میں اسد بھائی اور ان کی بیوی کا شیخ کچھ اچھا نہیں بناتا تھا۔

☆☆☆

وہ ارسل کے ساتھ اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں خریدنے کو رنگ ٹاؤن کی پرسکون مارکیٹ میں آئی تھی۔

”ارے۔۔۔ یہ تو وہی ہیں۔“ سیاہ شلوار قمیص میں دو سال کے جڑواں بچوں کو دونوں ہاتھ کی ایک انگلی پکڑائے وہ مارکیٹ کی طرف ہی آ رہی تھیں۔

”ارسل دیکھو، یہ بچے کتنے پیارے لگ رہے ہیں۔ دونوں بالکل ایک جیسے ہیں، کیسے پھول سے نکھرے ہیں۔“ وہ ایک جیسے سرخ ادنی کپڑوں میں ملبوس پیارے پیارے صحت مند بچوں پر مڑی۔
 ارسل نے گردن موڑ کر دیکھا اور پھر ٹھنک کر رک گیا۔

”السلام علیکم۔“ وہ خاتون قریب آئیں تو ارسل نے محاط سے انداز میں سلام کیا اور دلچسپی سے بچوں کو دیکھنے لگا۔

”ذلیکم السلام۔ ارسل کیا حال ہے تمہارا اور گھر میں تو سب ٹھیک ہیں نا۔“ خاتون بہت خوش اخلاقی اور اپنائیت سے ملیں۔ ارسل نے بچوں کو باری باری گود میں لیا۔ مائرہ نے محسوس کیا ان کی دھیمی مسکراہٹ میں ایک طرح کا سوز اور کرب شامل تھا۔

”اسد بھائی کیسے ہیں؟“ ارسل نے آہستگی سے پوچھا۔
 ”اللہ کا شکر ہے۔“ وہ ہنسنے والے انداز میں زبردستی مسکرائیں۔ مائرہ کو کھلندے ارسل کا ایک دم سنجیدہ ہو جانا سمجھ میں نہیں آیا۔

”آپ یہاں کو رنگ ٹاؤن کب آئیں؟“

”چھ سات ماہ ہو گئے ہیں۔“ انہوں نے ملائمت سے کہا۔
 ”افضل میں وہاں کرائے بہت زیادہ ہو گئے تھے جو موجودہ حالات میں انور ڈاہل نہیں تھے پھر انی اور بھائی بھی ادھر تھے، اس لیے ان کی قربت کی خاطر یہاں آ گئی۔“
 ”گھر کہاں پھلپھلایا ہے؟“ ارسل کی دلچسپی اور توجہ یقیناً ان کے لیے حیرت کا باعث تھی۔

”یہاں سے کچھ دور ایک سنگل پورشن والا چھوٹا سا گھر ہے۔“
 ”کیا نمبر ہے گھر کا؟“ اب کے وہ سچ سچ چکرا گئیں۔

”کیا تم آؤ گے اپنے بھائی سے ملنے؟“ ان کا لہجہ کا پٹنے لگا۔
 ”آجھی سکتا ہوں۔“ وہ دھیسے سے بولا۔ خاتون جیسے نہال ہو گئیں۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔“ خوشی اور جانے کس احساس سے ان کی آواز بھگ گئی۔

تھی۔

”یہ کون تھیں ارسل؟“ خاتون کے آگے بڑھ جانے پر مائرہ بے صبری سے پوچھنے لگی۔

”ہماری بھابھی!“ اس نے دھماکا کیا۔

”کیا مطلب؟“ وہ ہلکا گئی۔

”ہمارے سوتیلے اور سب سے بڑے بھائی اسد کی بیوی۔“

ارسل کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ لہجہ عجیب سی چھین اور سختی لیے ہوئے تھا۔

”وہی جس سے گھر والوں کو چھوڑ کر شادی کی تھی انہوں نے۔“

”ہاں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

”اسد بھائی کو ہر صورت میں وہیں کرنی تھی اور جلد ہی کرنی تھی کہ لڑکی والوں کو جو بادل ناخواستہ

راضی ہوئے تھے، یہی شرط تھی اور امی ابمان کر نہیں دے رہے تھے، مجبوراً خود ہی کر لی۔ امی نے اسے انا

کا مسئلہ بنالیا۔ ابو بھی اسد بھائی کو معاف کرنے پر تیار نہیں تھے کہ جس گھر سے خاور بھائی کے لیے انکار

ہوا تھا، وہاں دوسرے بیٹے کی بھی کیوں کریں۔ لہذا بھائی کو امی ابو کے حکم پر گھر چھوڑنا پڑا، ہمیشہ ہمیشہ

کے لیے۔“ ارسل کا لہجہ لاپرواہی لیے ہوئے تھا۔

”اوہ۔۔۔“ مائرہ نے ساری سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ”لیکن ان خاتون کو میں نے کچھ دن

پہلے وہ سامنے والے بنگلے سے لگتے دیکھا تھا۔“ وہ ارسل کے برابر چلتے ہوئے ابھی بھی مطمئن نہیں

ہو پارہی تھی۔

”وہ ان کی امی کا گھر ہے۔“ مائرہ کے قدیم ایک دم رک گئے۔

”کیا مطلب؟“ وہ بھونچکا کھڑی رہ گئی تھی۔

”مگر وہ تو احسن فاروقی کا گھر ہے، وہ جو آرمینینٹ ہیں۔“ شٹا کر پوچھ رہی تھی۔

”احسن، ان کے بھائی ہوتے ہیں۔“ ارسل کے اطمینان میں فرق نہیں آیا۔

”ارے۔“ اسے عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔

”اب تو رشتہ داری“ بھی نکل آئی ہے احسن صاحب۔“ وہ تصور کرتے ہوئے مسکرائی تھی۔

”بھلے، زبردستی کی سہی۔“

”ارسل!“ وہ کسی گہری سوچ میں گم اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

”بھابھی تو خاصی ناس لیڈی ہیں۔ میرا مطلب ہے چچی جان کی باتوں سے تو ان کا عجیب سا منہ

بنا تھا جیسے۔۔۔“ وہ رک گئی۔

”نہ صرف بھابھی بلکہ اسد بھائی بھی بہت اچھے بندے ہیں۔ انہوں نے منت سماجت، خوشامد

سب کر کے دیکھ لیا تھا مگر ابو اور امی اس شادی میں شریک ہونے پر تیار نہیں ہوئے۔ شادی کے بعد بھی

جب بھی ملے، انہوں نے ہمیشہ دوستی اور صلح کا ہاتھ بڑھایا مگر وہ بھی امی کی انا، غصہ اور ضد کی نذر ہو گیا۔

علاوہ ازیں خاور بھائی بھی یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ اسد بھائی اپنی بیوی کو لے کر گھر میں آئیں یا

رہیں۔“

لگتا تھا ارسل اس معاملے میں مکمل طور پر غیر جانبدار تھا، ورنہ گھر کے ہر شخص کو اس نے اسد کے

بھی دیکھا تھا۔

مائرہ نے رات کو بستر پر لیٹتے ہوئے دل ہی دل میں اسد بھائی کے گھر کا ایڈریس دہرایا۔

اسے حزن و ملال کی چادر میں لپیٹی اس ادا اس شہزادی کے دکھوں کو کھونسنے کا اشتیاق ہو چلا تھا۔

☆☆☆

ابھی احسن پہنچا ہی تھا کہ نیل ہوئی۔

”رانی آیا! آپ ٹھہریں، میں دیکھ لیتا ہوں۔“

بلکے آسمانی شلوار قمیص میں وہ بڑے غام سے چلیے میں تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔

”آپ کیا میرا پیچھا کرتے کرتے یہاں تک آئی ہیں بی بی؟“

وہ ہنر پرنت کے کاٹن کے اسٹالش سوٹ میں ملبوس مائرہ کو دیکھ کر متعجب ہوا۔

”نہیں احسن صاحب!“ وہ اسے یہاں پا کر شٹائی گئی تھی۔

”اھل میں۔۔۔ میں۔۔۔ بھابھی سے ملنے آئی ہوں۔“ وہ ہچکچائی۔

”کون بھابھی؟“ وہ حیران ہوا۔

”میرا مطلب ہے اسد بھائی کی مسز۔“ وہ تھوک نکل کر بولی۔

”مگر اسد صاحب سے آپ کا کیا تعلق ہے؟“ وہ دہلیز پر جم کے اٹھا۔

”وہ میرے چچا زاد بھائی ہیں۔“

”اوہ۔۔۔“ احسن کے تپتے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ”تشریف لائیے۔“ اس نے راستہ

ڈرایا۔

”السلام علیکم۔“ سامنے ہی ملگجے سے براؤن کپڑوں میں کچن میں مصروف عمل بھابھی نظر آ گئی

۔

”وعلیکم السلام۔“ اسے دیکھتے ہی انہوں نے سب کام چھوڑ دیے اور جوش و مسرت کے ساتھ اسے

رہنے آئیں۔

”کیا حال ہے تمہارا اور تم یہاں تک کیسے پہنچیں۔ تم یقیناً ارسل کی کوئی رشتہ دار ہو، ہے نا۔ میں

اس دن مارکیٹ میں تمہیں اس کے ساتھ دیکھا تھا۔“ وہ اس کے ہاتھ تھام کر پوچھ رہی تھیں۔

”جی۔“ وہ احسن کی طرف دیکھنے لگی۔

”یہ اسد بھائی کے تایا کی بیٹی ہیں۔“ احسن نے تعارف کرایا۔

”اسد بھائی کہاں ہیں؟“

”کون جانے، وہ کہاں ہیں۔“ بھابھی نے ایک سر داہ بھری۔

”کیا مطلب؟“ وہ خاک نہ چھی۔

”کچھ نہیں، تم یہ بتاؤ چائے پیو گی یا کولڈ ڈرنک۔ بے تکلفی سے بتاؤ۔ ایک مدت بعد تو اسد کا کوئی

ان آیا ہے اس گھر میں۔“ وہ ٹال گئیں۔

ماڑہ سکتے کے عالم میں ان کا پرسکون اور ٹھہرا ہوا انداز گفتگو نوٹ کر رہی تھی۔

”کیا اتنے حالات خراب ہو چکے ہیں۔“

”میں جاب کرنا چاہتی ہوں مگر بچے کس کے پاس چھوڑوں۔ امی اکیلی دودھ کو نہیں سنبھال سکتیں، ب دیکھو۔۔۔“ وہ ہنسنے لگی۔

وہ اسد سے ملی تو ان کی شخصیت کی سادگی، شفقت، اور خلوص سے از حد متاثر ہوئی۔

”بھلا اتنے پیارے اور سنبھلے ہوئے بندے کو کیا پڑی ہے کہ وہ جان بوجھ کر کسی کو ستائے۔“

اسے چچی کی لہجہ میں کوئی حقیقت نظر نہیں آئی تھی۔ احسن کو لڈو ٹکس لاکر دینے کے بعد چلا گیا تھا۔

☆☆☆

”مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے بزرگوار! ویسے پہچان تو لیا ہوگا۔ میں رابی آپا کا بھائی ہوں۔“ وہ شائستگی سے گویا ہوا۔ افضل چچا نے سر تاپا اسے دیکھا۔

اونچا لمبا کڑیل سراپا، وجیہہ، دو بروچرہ، پختہ و بلند ارادوں کی ترجمان پر تکمیل آئیں۔ وہ بڑی نظر میں اس نوجوان کی جادو اثر شخصیت سے متاثر ہو گئے تھے مگر جو خوبی تعارف مکمل ہوا، ان کے چہرے پر ناگواری کی لکیریں ہنسنے لگیں۔

”بیٹھو میاں!“ وہ گہری سانس لے کر اشارہ کرنے لگے۔ گھر آئے مہمان کی میزبانی تو بہر حال نبھائی تھی۔

”گزشتہ ساڑھے تین برس سے آپ کا بیٹا آپ کی نظروں سے اوجھل ہے، آپ اتنا عرصہ ان سے کیسے دور رہ پائے ہیں۔ بہر حال یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ میں یہ کہنے آیا تھا کہ بس بہت ہو گیا۔ ضد انہوں نے کی، انا کی دیواریں ہم نے کھڑی کر لیں، یوں رابطہ ٹوٹ گئے، رشتے پھوٹ گئے لیکن محترم! جو کچھ ہوا دونوں طرف سے ہوا۔ ایک دیوار ہم نے گرا دی ہے، دوسری آپ گراویں تاکہ انہیں مشترکہ طور پر قبول کر کے خاندان میں شامل کیا جائے۔ یقین کیجیے آپ کا بیٹا از حد تکلیف میں ہے۔ آپ کو یقیناً اطلاع پہنچی ہوگی، وہ جس طرح جی رہے ہیں، وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ انہیں اپنائیں۔ باپ کی چناہوں میں لے کر ان کا مکمل علاج کروائیں۔ آپ کے پاس اتنا کچھ ہے کہ آپ آپ کر سکتے ہیں۔ ان کے بچے آپ کی نسل، آپ کے وارث ہیں۔ اگر دیر ہوگئی تو خدا نا خواستہ آپ کا بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔“

اس کا لہجہ بلا کا درمند، تہذیب و شائستگی کا آئینہ دار تھا۔

چچا افضل کے چہرے سے کرب چھلکنے لگا۔ انہوں نے نچلا ہونٹ و انتوں تلے دبایا۔

”وہ آپ کی بہن کے گھر کی چھت ہے۔ آپ تو معافی تلالی کی سفارش کریں گے ہی۔ بات ساری یہ ہے میاں کہ اس نے نہ صرف باپ و دادا کی عزت اچھالی بلکہ خود سے شادی رچا کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سرنگوں کر دیا۔ ہماری اہمیت صفر برابر بھی نہ رہی اس کے نزدیک۔ آج مشکل میں اسے باپ اور گھریا وار رہا ہے۔“ چچی تلخ ہو گئیں۔

مگر ماڑہ کا تجسس حد سے سوا ہو گیا۔

”احسن! پلیز! کو لڈو ٹک لے آؤ گے کارز والی شاپ سے؟“

وہ جیسے بڑے تکلف اور قدرے شرمندگی سے بھائی کو کام کا کہہ رہی تھیں۔ ساتھ ہی انہوں نے الماری سے اپنا پرس نکالا۔

”جی ضرور، یہ رہنے دیجیے۔“ اس سے پہلے کہ وہ پرس کھولیں، احسن جا چکا تھا۔

”آپ کیوں خواہ مخواہ تکلف کر رہی ہیں بھابھی! میں تو بس آپ سے ملنے اور اسد بھائی کو دیکھ آئی تھی۔ کیا وہ کہیں جاب کرتے ہیں؟“

اسے جانے کیوں اسد سے ملنے کی بے چینی لاحق تھی۔

”شادی کے بعد دو سال تک باقاعدگی سے جاب کرتے رہے تھے مگر پھر وہ بیمار ہو گئے اور جا چھوڑنا پڑی۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔

”وہ کیا کام کرتے تھے؟“

”ایک اخبار میں ایگزیکٹو ایڈیٹر تھے۔ مالک نے سارا اخبار ان پر چھوڑ رکھا تھا۔“

”ایسی کون سی بیماری ہوگئی کہ انہیں نوکری چھوڑنا پڑی۔“

”ان کے دماغ میں ٹیومر ہے۔“ بھابھی کہتے ہوئے روویں۔ ماڑہ کے قدموں تلے سے ز نکل گئی۔

ہائے اللہ! اتنی خوب صورت اداس آنکھوں اور شہزادیوں کی سی آن بان والی عورت اور دودھ سے فرشتہ صفت بچوں کے سر کی چھت میں نقدیر نے کیسا بھیا تک شگاف کیا تھا۔

”ٹیومر زیادہ خطرناک تو نہیں ہے۔ نہ پھیلنے والا ہے لیکن وہ ایسی جگہ پر ہے کہ جب تکلیف ہے تو اسد دور کی شدت سے پاگل سے ہو جاتے ہیں۔ یہ دورہ آدھ پون گھنٹے کے دورانیے کا ہوتا ہے۔

اتنا شدید ہوتا ہے کہ بعد میں گھٹنوں ٹھہال اور نیم بے ہوش پڑے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی حالت ”وماغی نوکری“ (صحافت) تو نہیں نبھ سکتی تھی۔“

ماڑہ کا دل پھٹنے لگا۔

اس نے افسردگی و حزن کی تصویر بنی بھابھی کو دیکھا اور لب کاٹنے لگی۔

”اب وہ کیا کرتے ہیں؟“

”ٹیکسی لی تھی۔ ارادہ تو تھا کہ ڈرائیور کو دے دیں گے، وہ روز کے ڈھائی تین سو تیار ہے گا، گزرا چلتا رہے گا مگر ڈرائیور صاحب آئے دن نئے نئے فراڈ کرنے لگے۔ کبھی ایک ہزار چاہیے، گا کے انجن میں مسئلہ ہو گیا ہے، کبھی دو ہزار مانگ رہا ہے کہ تیسرا گیسٹر خراب ہے، اس کی گزاریاں ڈال ہیں، کبھی مارٹر ختم ہو گئے ہیں اور ساڑھے چار ہزار کے نئے منگوانے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اتنے ہم نے نہیں جتنے اوپر لگا دیے اور وہ سب پیسے وہ کھا گیا۔ اس دھوکا دہی کے بعد اسد خود ہی ٹیکسی چلانے ہیں۔ جب طبیعت سیٹ ہو، چلے جاتے ہیں۔“

انہوں نے آہستگی سے بتایا۔

”دیکھیے خاتون! اسد بھائی نے مجھے ہرگز نہیں بھیجا۔“ وہ بڑی مشکل سے ضبط کیے ہوئے تھا۔
 ”میں اپنے طور پر آپ کے اور ہمارے خاندان کے اس مشترکہ مسئلے کا مناسب اور معقول
 چاہتا ہوں۔ یہ باتوں کے مسئلے ان کی نسل تک تو نہیں چلانے ہیں، ہمیں کچھ سوچنا ہوگا۔“
 ”ہمیں کچھ نہیں سمجھنا سمجھانا۔“ چچی خنی سے بولیں۔
 ”وہ ٹیکسی چلا کر ہمارے پڑکھوں کی عزت خاک میں ملا رہا ہے، کسی کو منہ دکھانے کے قابل
 رہے ہم۔“

”محنت مزدوری کرنا کوئی عیب یا برائی تو نہیں ہے۔ مجھے تو اپنے بہنوئی کے اس فعل سے ا
 خاندان پر کوئی آج آتی محسوس نہیں ہوتی۔“ وہ رمان سے بولا۔ چچی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔
 ”آپ کی بات ہم نہیں کر رہے، اونچے خاندان میں ہر بات ”جائز“ بن جاتی ہے۔ ہم درمیا
 طبقے کے شریف اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، ہمارے ہاں یہ سب نہیں ہوتا۔“ انہوں نے
 لہجے میں کہا۔

ان کا خاندانی غرور و وقار اور دوسرے معنوں میں اسے ذلیل و رسوا کرنے کا انداز گویا کھلاوا
 مگر احسن اپنی ماں کی تربیت کی بدولت خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہا۔
 ”شرافت اور عزت و حرمت کسی خاص طبقے یا خاندان کے لیے مخصوص نہیں ہوا کرتی۔ م
 خاتون! وہ خشک انداز میں گویا ہوا۔
 چچی نے سی ان سی کر دی۔

”اور رہی بیماری۔۔۔ تو میاں بیماریاں تو ہر نفس کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ میں خود آئے دن ہائی
 پریشر کے ہاتھوں بے دم رہتی ہوں۔ اگر اسے علاج کے لیے پیسے چاہئیں تو ہم دو چار ہزار کا بندوبست
 کے دے دیں گے، اس سے زیادہ ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔“
 وہ اپنی ہی رو میں بہہ رہی تھیں۔

واہ رے ونیا! ذرا سا اختیار کیا مل جائے فوراً فرعون بن بیٹھتی ہے۔
 احسان اور ترس کے پوڑے ماری ہے۔
 مجبور یوں کا مذاق بناتی ہے، تماشا دیکھتی ہے، اس نے ادھر ادھر دیکھا۔
 ”آپ کے گھر میں سب کچھ ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بچا افضل سے مخاطب ہوا۔ ”مگر انسا
 نہیں ہے۔“

کہہ کر وہ رکنا نہیں، تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ افضل چچی ایک لمحے کو ستانے میں آگئے۔ ا
 کی بیماری کی تفصیلات کچھ دن پہلے ماثرہ نے بھی ان کے گوش گزار کی تھیں۔
 ”یہ جذباتی بلکہ میلنگ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔“
 چچی انہیں دوبارہ اپنے ”اثر“ میں لے آئیں۔

”وہ ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے، گھر کے اخراجات قابو میں نہیں آ رہے۔ یہ بھی پتا چل گیا
 کہ باپ اچھا کھا کما رہا ہے، گھر میں اللہ کا شکر ہے خوش حالی آچکی ہے، اسی لیے اپنے سارے بیج

کی راہ استوار کر رہا ہے، وگرنہ جس کو ٹیومر ہو، وہ سارا دن ٹیکسی چلا سکتا ہے۔ دھوپ بارش میں باہر
 ہے، سب ڈھونگ ہے۔“
 چچی نے جسی سے کہتے ہوئے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”امی! کون صاحب تھے۔“ ردا، ندا اور اجیہ آپنی تینوں مشتاق نظر آئیں۔ ماثرہ البتہ خاموشی سے
 اپنے ناخن دیکھتی رہی، وہ سب کچھ سن چکی تھی۔
 ”اسد کا سالا تھا۔“ انہوں نے مختصراً کہہ کر بیٹیوں کے چہرے دیکھے۔ ان پر ستائش اور شوق کی
 ت نمایاں تھی مگر اجیہ۔

اجیہ کے چہرے اور آنکھوں سے اور بھی بہت کچھ چھلک رہا تھا جو صرف ماں کی حساس نظر ہی
 سن کر سکتی تھی۔
 ”اوہ! تو گویا یہ بات ہے۔“ وہ کسی جوڑ توڑ میں لگ گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر بچا افضل کے
 لیے میں آ گئیں۔ وہ کسی گمبھیر سوچ میں غلطاں دکھائی دیے۔

”بات سنیں، آپ اس کو پیغام بھجوائیں کہ اس کی واپسی اس صورت میں ممکن ہو سکتی ہے اگر وہ اجیہ
 ناد اور حصّتی کا بندوبست کر دے۔“ ان کا انداز براہ راست اور رازدارانہ تھا۔
 ”لا حول ولا قوت۔“ بچا افضل بگڑ کر اٹھ بیٹھے۔ ”وہ کیسے کرے گا۔“
 ”یہ احسن ہے نا۔“ ان کے لہجے میں ملائمت و راز تھی۔ ”انتا بھر پور کڑیل جوان پھراتی ابھی پوسٹ
 نامان تو ہے، ہی اعلیٰ، ہم سے ادبچے ہیں، سو نے پر سہا کہ ایک ہی ایک ہے۔“
 چچی نے اتنے بھر پور انداز میں درغلایا کہ بچا افضل کو اس قسم میں سوچنے ہی بن پڑی۔

☆☆☆

احسن اپنے ہاتھ میں اس کی بھجوائی ہوئی پیپر شیٹ رول کیے اس کے پاس آیا تھا۔
 ”میں ماثرہ، ادھر آئیں۔“ احسن نے سختی سے پکارا۔
 ”الہی خیر، اب کیا ہو گیا۔“ ناچار وہ سیٹ سے اٹھ کر ڈھلوانی پلین سطح والے بورڈ کے قریب آئی،
 ماہر شیٹ بچھا رہا تھا۔

”یہ جن صاحب کے گھر کا نقشہ آپ نے ڈیزائن کیا ہے، وہ گاڑی اپنے سر پر کھڑی کریں گے
 ؟“ انداز استہزاء تھا۔
 اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ پورچ تو بنایا ہی نہیں تھا، اس جگہ کو اپنی ایریے میں شامل کر دیا تھا۔
 ”آپ دھیان سے کام نہیں کرتیں؟“ وہ بلا دروغ اس پر برس رہا تھا۔
 ”آپ نے ہی تو کہا تھا کہ غلطیاں ضرور کیجیے، اسی طرح بندہ سیکھتا ہے۔“ اس کے منہ سے بے تکا
 ناز نکل گیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔

”مگر یہ بھی تو کہا تھا ان کی اصلاح بھی کیجیے۔“ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے بغور
 کی شکل دیکھی۔ وہ اس کی نظروں سے گھبراہٹ کی۔
 ”غلطی کرنا غلطی نہیں ہے مگر اس کی درستگی نہ کرنا بہر حال غلطی ہے۔“ وہ اس کی گھبراہٹ محسوس

کرتے ہوئے مبہم سا مسکرایا۔

”بلکہ غلطی پر غلطی ہے۔ کیوں احسن صاحب!“ کچھ فاصلے پر کام میں مگن شائستہ نے سے اضافہ کیا۔
”بالکل صحیح ہے۔“ احسن قدرے شوخی سے کہہ کر دلچسپی سے ماثرہ کی طرف دیکھنے لگا۔
بوکھلا کر شیٹ پر نگاہیں جمادیں۔

”بہر حال آپ ان صاحب کی کوٹھی پر نظر کرم کیجیے اور انہیں گاڑی کھڑی کرنے کے لیے پورج عنایت فرمادیں۔ عین نوازش ہوگی۔“
وہ جھینپ کر نئی شیٹ نکال کر نقشہ بنانے لگی۔
احسن وہیں کھڑا دلچسپی سے اس کی حرکات و سکنات نوٹ کرنے لگا۔

ماثرہ نے چوری سے دیکھا۔ گرے سوٹ میں اس کا شاندار سراپا مزید اٹھ رہا تھا۔ لمبا قد ہو گیا تھا۔

”ماثرہ بی بی! ماثرہ بی بی۔ آخر آپ کو غلطیاں کرنے میں اتنی دلچسپی کیوں ہے۔“ وہ اس طرف سے قدرے جھک کر نقشہ پر ایک جگہ نشاندہی کرنے لگا۔

”یہ گھر کی اوپننگ کا شیڈول آپ بنا رہی ہیں، اس میں کھڑکیوں کی پیمائش نہایت غیر ہے۔ ایک کھڑکی چھ بائی چھ کی ہے تو دوسری اٹھ بائی چار کی۔ پندرہ میں یہ تناسب آنکھوں کو لگے گا، اسی طرح جی ایف پلان میں آپ نے ڈرائنگ اور لاونج دونوں طرف سے اینٹرنس ہیں جبکہ شیڈول میں صرف ایک دروازہ لکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں لاونج والی کھڑکی کا شیڈول ذکر ہی نہیں ہے۔“

وہ نقشہ پر غور و خوض کر رہا تھا۔ اُن جانے میں وہ اس کے قریب کھڑا تھا کہ اس کی شیٹ پر ج انگلیاں لرزنے لگیں۔ اسے از حد گھبراہٹ لاحق ہونے لگی تھی۔ اس کے ہاتھوں نے کام کرنا چھوڑا۔
”یہ درست کیجیے نا یہاں سے۔“ اسے رکتا دیکھ کر وہ تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔
”میں درست کر کے آپ کی سیٹ پر پہنچا دوں گی۔“ وہ دھشت زدہ سی پیچھے ہٹ گئی۔

احسن نے ایک طائرانہ نگاہ اس پر ڈالی۔
اس کی گھبراہٹ میں جو خوب صورت سا ”اعتراف“ اور ”احساس“ چھپا ہوا تھا، اس نے چونکا سا دیا۔

نہ جانے کیوں وہ دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔
یہ تو وہ جانتا تھا کہ وہ جب بھی میدانِ محبت میں اترے گا، فتح یاب ہوگا جس کو ”چاہے“ سے ”پائے“ گا۔

”اوکے“ وہ ترنگ میں آکر سیٹی بجاتا ہاں سے چلا گیا۔ لنج بریک میں ان کا دوبارہ آہوا۔

ہوا۔

انتظامیہ نے چھوٹی سی مگر مکمل قسم کی کینٹین بنا رکھی تھی۔ بیٹھنے کے لیے میزیں بھی لگائی گئی

”اسد بھائی نے انہیں قسم دے رکھی ہے کہ ان کی زندگی کے لیے کسی سے بھیک نہ لیں۔ وہ سگے باپ کے آگے جا کر حالت زار بتا کر مدد حاصل کرنے کے بھی رولڈار نہیں ہیں۔ میں اپنے طور کے والد صاحب کے پاس گیا تھا کہ شاید کوئی بہتری نکل آئے مگر نہ۔ وہ جاموش ہو گیا۔ ان

”آپریشن میں کتنے پیسے لگیں گے۔“
”دو، ڈھائی لاکھ۔“

”آپ اسد بھائی کو سمجھائیے تو سہی۔“ وہ جانے کیوں ہان کے لیے اتنی بے چین ہو رہی تھی۔
”ہر طرح سے سمجھا چکا ہوں۔“ اس نے اپنی شکست کا اعتراف کیا۔
”اب ایک آخری حذر دے گیا ہے۔ سوچتا ہوں وہ کنگز روں۔“ وہ کسی بوج میں ڈوب گیا۔
”کیا؟“ وہ تجسس ہوئی۔
”ابھی نہیں، بعد میں بتاؤں گا۔“ وہ خیالوں کے تانے بانے بننے لگا۔

”راہی!“ اسد نے ان کے سبے اشک ہاتھوں سے پونچھے اور کھینچ کر گلے سے لگایا۔
”کیوں پریشان ہوئی ہو۔“ دیکھو، میں اب ٹھیک ہو گیا ہوں۔“ دورہ پڑنے کے پون گھنٹے تک طرح تڑپنے کے بعد دورہ کا دورانیہ کم ہوتے ہوئے ختم ہو گیا تھا۔
”میں مر جاؤں گی اسد! میں آپ کو یوں تو پتا ہوا لیکن دیکھ سکتی۔“ میرا کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔
میں آپ کے کنارے دفن اپنے نام لگا سکتی۔ یہ عذاب کچھ میرے کیوں نہیں اتارتا؟“
وہ ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

”بری بات۔“ اسد نے جب شناختہ ان کے ہونٹوں پر لکھا تو وہ بات۔
”تم تو بہت صبر اور جوصلے والی عورت ہو چلو بہت کیوں ہار گئیں۔“
”اب نہیں ہے مجھ میں ہمت۔ سال ہو چلا ہے آپ کو اذیت کی اتنی بھی میں سہکتے ہوئے۔ مجھ یہ سب کچھ نہیں دیکھا جاتا اسد! آپ پلیز اس جین کی بات ملان لیں۔ مجھے اس گھر کو، ان بچوں کو اور زندگی اور صحت و سکون کی ضرورت ہے۔“
انہوں نے باپ کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر بھرتوں کی طرح سبے ہوئے دونوں بچوں کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔ راہی ان سے الگ ہو کر رو پئے۔ اسے اشک طاف گزر رہی تھی۔
”جس طرح اچھے دن زیادہ دیر تک نہیں رہتے، اسی طرح برے دن بھی نہیں رہتے۔ آزار کا پر صبر اور صبر کا مظاہرہ ان کا دورانیہ گھٹا دیتا ہے۔“ بے طبعی بدلتا خود ایک طویل عذاب ہے۔ مگر فرض کی سہ کیوں ہوں جسے سالوں تک لوٹا نہ سکوں۔ اگر اللہ نے میرے نصیب میں صحت و تندرستی لوگوں کی رفاقت لکھی ہے تو وہ خود بخود کوئی وسیلہ بنا دے گا۔ فرض برکت کو ختم کر دیتا ہے راہی! اور مجھ بھی اپنے شالے سے فرض! کیوں اس سر کو ہمیشہ کے لیے جھکا نا چاہتی ہوں۔ میں اپنی پیادگی کے لیے کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا، نہ نہیں اس بات کی اجازت دوں گا۔ میں اس نیادگی کے خلاف لڑوں

نہ سے استقامت اور شفیاقیابی کی دعا کروں گا دوسروں سے کیوں، اللہ سے کیوں نہ مانگوں۔ تم بھی اسی پر روبرو رکھو۔“ وہ دھیرے دھیرے ان کا سر تھپتھپاتے ہوئے تسلیاں دے رہے تھے۔
”میں امی کے ہاں گئی تھی، ان سے یہ درخواست کر کے کہ وہ دونوں بچوں کو شام تک اپنے پاس لے لیں تاکہ میں اس دوران جاب کر سکوں۔ ایک رپورٹ کمپنی میں چار ہزار سیلری کی ایک جاب ملے گی۔“
”مگر امی کی مجبوری۔ وہ اتنے چھوٹے بچوں کو اتنے نہیں سنبھال سکتیں۔ وہ کہہ رہی تھیں اسد سے کہو گھر پر مہر جایا کرے۔“
راہی بڑا دکھا ہوا دل لے کر ہاں کے گھر سے واپس آئی تھیں۔

اسد کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ برپا ہو گئی۔
”تم نے وقف ہو راہی! اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی انہیں آزمانے چل دیں۔ ہم نے سب سے طاقت مول لے کر شادی کی تھی۔ کوئی بھی دل سے راہی نہیں تھا۔ یہی کے لیے تمنا کے جذبات سے مجبور ہو کر تمہاری امی نے نہیں قبول تو کر لیا ہے مگر میرے لیے تجناش نکالنا ان کے طرف اور دل کے لیے ایک بہت بڑا امتحان ہے۔ میرا سامنا، میری موجودگی ان کی شکست خوردگی اور خاندان کی رسوائی کی اپنا زہ کر دیتی ہے۔“
راہی، اسد کی زیرک اور ختاس طبیعت کی قائل سی ہو گئیں۔ امی ان کی خواہش سننے ہی سے اٹھ گئی تھیں۔

”ساری عمر بھولوں کے بستر پر سونے والی امی اپنے خاوند اور بچوں کو پالنے کے لیے مزدوروں کی طرح مشقت کرے گی۔ گھر کا بوجھ دھوے گی۔ اس دن کے لیے اس چند ہزار روپیہ واسے معمولی سے صحابی سے نانا جوڑا تھا۔“
”امی! مجھے اپنے اس فیصلے پر کوئی افسوس یا ملال نہیں ہے۔ فقط یہ ہی نہیں ہے نا، ان کے علاوہ تو وہ سب کچھ میرے پاس ہے جس کی کسی آئیڈیل پرست اور خواب دیکھنے والی لڑکی کو مننا ہوا کرتی ہے۔ امی! وہ فطرت کے اتنے نیک، اتنے سلھے ہوئے، اتنے نرم دل اور شفیق ہیں کہ ان سے صرف محبت ہی کی جا سکتی ہے۔ ساڑھے تین برس ہو گئے ہیں میں ساچھ رہتے ہوئے ہر آج تک میں نے اس شخص کی زبان سے اپنے لیے سخت، ناروا جملہ نہیں سنا۔ وہ میرا، میرے جذبات کا، میرے دل کا سر آرم کرتا ہے، میری ہر بات کو برائے سمجھوں پر لکھتا ہے۔ اسے جانے کا سلسلہ ہے امی! اسے نبھانے کا ن آتا ہے۔“
”راہی! مجھ بھی کچھ نہیں بھڑا۔ تم اس سے نانا تو ذکر اس گھر میں واپس آ جاؤ تاکہ تم اور تمہارے بچے اپنی زندگی آرام و ساس اور سکون سے گزار سکیں۔ امی! وہ ختم ہو چکا ہے۔ رماخ کے یومر ایسے ٹھوڑی قسم ہوتے ہیں، وہ جان لے کر ہی چھوڑتے ہیں۔ تم کب تک اس لگاؤ سے بھی رہو گی۔ اس میں اب کچھ باقی نہیں رہا۔ محض زندگی کو گھسیٹ رہا ہے وہ ایسے دورے جان لیا ہوا کرتے ہیں۔ کسی بھی لمحے وہ موت سے قریب تر ہو سکتا ہے۔ لہذا تم سوچ لو، تم اسے کہو، وہ اپنے والدین کے پاس واپس چلا جائے، وہ اس کی دیکھ بھال کر لیں گے۔“

”ای۔۔۔ ای۔۔۔ ہاں ہو کر بیٹی کے کلیجے پر چھری چلائے ہوئے آپ کا دل نہیں کانپا۔“ وہ

تڑپ کر رہ گئی تھیں۔

انہوں نے قسم کھائی کہ وہ آئندہ کبھی بھی یہاں قدم نہیں رکھیں گی۔

”میں تو تمہارے فائدے کو کہہ رہی تھی! تمہاری حالت دیکھتی ہوں تو مر جانے کو ہی چاہ رہی ہوں۔“

”آپ نے تو مجھے ہی بے موت مار دیا ہے امی!“ ان کی آنکھوں میں سیلاب اتر آیا تھا پھر وہ چھپاک سے باہر نکل گئیں۔

”بس! اسد! آپ کم از کم تین بجے تک گھر پر کا کریں گے، جب میں آفس سے آ جاؤں تو بھلے ٹیکسی چلانے چلے جایا نیچے گا۔“ واپس آ کر میں بچوں اور گھر کو دیکھ لیا کروں گی۔“ انہوں نے اسد کو سہ پہر تک بچوں کے پاس رکھنے کے لیے مٹا کر ہی دم لیا تھا۔

”میں نہیں چاہتا کہ تم پیسوں کے لیے باہر دھکے کھاتی پھرو۔“ وہ مرجھائے ہوئے شکست خوردہ انداز میں گویا ہوئے۔

”یہ کوئی ہمیشہ کی روٹین تھوڑی ہے، کچھ عرصے بعد آپ ٹھیک ہو جائیں گے پھر آپ کام پر جا کر کریں گے اور ہم ماں بچے گھر میں موج اڑایا کریں گے۔“ انہوں نے امید کے جگنو دھیرے سے ہاتھ میں پکڑے۔

اسد کے لبوں پر کر بناک سی تھکی تھکی مسکراہٹ تیر گئی تھی۔

ان کا دل کسی اتھاہ میں ڈوب رہا تھا۔ اتنی محبوب، اتنی عزیز از جان اور حسین مورنی جیسی بیوی کو روزی رزق کے لیے دفنوں میں رلتے دیکھنے کا تصور بھی ان کے لیے سوہان روح تھا۔ انہوں نے ایک اذیت بھری سانس اندر کھینچتے ہوئے دیوار پر نظر پڑا دیں۔

☆☆☆

”آپ نے اسد سے بات کی؟“ چچی افضل چچا سے پوچھ رہی تھیں۔

”کون سی بات۔“ انہوں نے ہنسنے لگا چکا تھا۔

”اجیہ اور احسن والی بات۔“ چچی جھلا گئیں۔

”ہاں میں نے پیغام بھجوایا تھا کہ اگر وہ جاہتا ہے کہ اسے اور اس کے بیوی بچوں کو خاندان میں جگہ دیں، اسے اپنی سسرال سے ایک نیا رشتہ قائم کرنا ہوگا تاکہ دونوں گھرانوں کے تعلقات معمول پر آسکیں۔“

”پھر اس نے کیا جواب دیا۔“ چچی بے صبری سے پوچھنے لگیں۔

”وہ کہتا ہے اول تو وہ شرائط پر ہم سے رشتہ داری کو استوار نہیں کرے گا دوم یہ کہ احسن شادی کے لیے لڑکی پسند کر چکا ہے۔ رابی نے احسن سے بات کی تھی۔“

لاحول ولا قوۃ۔“ چچی بری طرح بھنا گئیں۔

”تو پھر یہ بھی سن لیجیے۔ اگر وہ شرائط پر رشتہ داری کرنا پسند نہیں کرتا تو پھر میں بھی اس لڑکی کو مرنے

کا بہو تسلیم نہیں کروں گی۔ اگر اس میں ذرا سی بھی ہم سے رشتہ داری کی چاہ یا خواہش ہوتی تو خود کو تیار کر لیتی لیکن وہ ہمیں اپنا نہیں بھتی، نہ سمجھنا چاہتی ہے۔ ایسی تک چڑھی اور خود غرض لڑکی میری ہلانے کے لائق نہیں ہے۔“

وہ چراغ پا ہو رہی تھیں۔ رشتے سے انکار انہیں زہر سے بھری سرخ کی طرح اپنی رگوں میں اترتا ہی ہو رہا تھا۔ احساس تو ہن اور ذلت سے ان کا برا حال تھا۔

دوسری بار ان کی اولاد ٹھکرانی گئی تھی۔ وہ غم و غصے سے پاگل ہو رہی تھیں۔ اب تو کسی صورت بات میں بحالی ممکن نہیں تھی۔ چچا افضل کسی گہری اور گھمبیر سوچ میں غرق ہو چکے تھے۔

☆☆☆

”میں دو پہر کو آتی تھی آپ کی طرف، اسد بھائی سے پتا چلا آپ جاہ پر گئی ہیں۔ بچوں سے البتہ بات ہو گئی۔ اچھا کیا جو آپ نے جاہ شروع کر دی۔ یہ ایک مثبت اور دانش مندانہ فیصلہ ہے۔“ مارہ انہیں سراہا۔

”اور کوئی چارہ بھی نہیں رہا تھا مارہ!“

رابی کو یہ مخلص اور حساس طبع لڑکی بہت پسند آتی تھی۔

”کچھ دن پہلے تمہارے چچا اور میرے سر کی طرف سے صلح کا پیغام آیا تھا، مع ایک شرط کے۔ ہم ہار گئے، صلح کا پیغام بھی دشمنی میں بدل گیا۔“ وہ ملال سے بولیں۔

اب وہ اس سے ہر طرح کی بات کر لیتی تھیں۔

”پتا نہیں کون تھا اور شرط کیا تھی۔“ مارہ نے دلچسپی سے دریافت کیا۔

”ارسل آیا تھا۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔

”شرط یہ تھی کہ اجیہ کے لیے احسن کا رشتہ کرنے کی کامیاب کوشش کی جائے“

ایک لمحے کو مارہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

”اسد تو یہ پیغام سنتے ہی غصے میں آ گئے تھے، میں نے البتہ امی سے بات کر کے بات بتانے کی ش ضرور کی تھی مگر ایک تو امی کو منظور نہیں تھا، دوسرے احسن سے بات ہوئی تو اس نے بھی معذرت لی کہ وہ اس ضمن میں پہلے ہی کچھ سوچ چکا ہے۔“

مارہ کو اپنا چہرہ سرخی جذبات سے گرم ہوتا محسوس ہوا۔ کتنی بنفیس بحال ہو گئی تھیں۔

”حالانکہ میں نے بھی ”کچھ“ سوچا تھا اس کے لیے مگر۔“ وہ ایک خصوصی نگاہ اس پر ڈال کر کچھ نہ کہتے رہ گئیں۔

”میری پوزیشن اپنے میکے میں وہ نہیں ہے جو ایک ماں باپ کے دل کی بچی خوشی کے ساتھ بیاہی لڑکی کی ہوتی ہے۔ کچھ مشورہ تجویز بھی دیتی ہوں تو ڈرتے ڈرتے۔ لحاظ اور مروت کے مارے نہ حق کی ہوں نہ بیاہتا لڑکی کی طرح دندانے ہوئے یہاں وہاں اپنی مرضی کر سکتی ہوں۔ میں خود کو وہاں

نادر مہمان سا تصور کرتی ہوں۔“ وہ افسردگی سے گویا تھیں۔

باہر نکل ہو رہی تھی۔

”میں دیکھتی ہوں، آپ اپنی ہانڈی میں ”بڑی“ رہیں۔“ وہ انھی۔

”اُحسن ہوگا، کبیر ہاتھ شام کو چکر لگاؤں گا۔ اللہ سلامت رکھے میرے بھائی کو۔ ہیر نے جیسے اور شفاف دل سے کہ پیدا ہوا ہے۔“ مائرہ کے دروازے کی طرف بڑھتے قدموں میں سرشاری سی آگئی۔ ”السلام علیکم۔“ دروازہ کھلتے ہی اُحسن کی نظر سرخ لباس میں کھلی کھلی مائرہ پر پڑی تو اندر نہر تانگی دوڑ گئی۔ اس کا موڈ خود بخود شگفتہ اور شائش ہو گیا تھا۔

”کیا حال چال ہیں جناب۔“ پر شوق انداز میں پوچھا گیا۔
 ”ٹھیک ہوں۔“ اس کا انداز حیا آلود تھا۔ وہ راستے سے ہٹ گئی تھی۔
 اُحسن اندر آ گیا۔ ”آپا! اُنھیں اسد بھائی سے بہت ضروری کام ہے۔“
 ”ہاں ہاں، بیٹھو نا۔ وہ کس آتے ہی ہوں گے۔“ وہ دوپٹے سے کیلے ہاتھ پونچھتی چن سے نکلیں۔
 ”چائے بناؤں۔“

”نہیں آپا! ابھی ابھی مین امی کے ساتھ بی کے آ رہا ہوں۔ آپا! یہ کچھ سو دا ہے۔“ وہ ہچکچا کر بھاری تھیلہ چن میں رکھنے لگا۔

”اُحسن۔۔۔!“ صدے اور دکھ کی شدت سے ان کی آواز بندھ گئی۔
 ”یہ نہ کیا کرو اُحسن! میں خود اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو جاتی ہوں۔“
 ”کیسی باتیں کرتی ہیں آپا! یہ سب بلا اس سے بہت زیادہ آپ کا کتھی ہے۔ مہاہوہنے سے بیویوں کے حق تھوڑی ختم ہوتے ہیں۔ سنی جلد آپ نے دیکھا ہوگا جب بھی نیکیے دانے آپے ہیں، لہو پھندے اور تحائف کے انبار کے ساتھ آتے ہیں۔“ وہ ان کے احسانات کو ہلکا ہلکا کرنا چاہتا تھا۔
 ”میکے کی سوغاتیں اس وقت سوغاتیں لگتی ہیں جب گھر میں ہر طرح کی سبزی اور آبودی ہو دوسری صورت میں یہ بھیک، ترس اور رحم ہی شمار کی جاتی ہیں۔“ رانی کو اسد کا کہنا یاد گیا تھا۔
 ”یہ بچوں کے اور آپ کے کپڑے ہیں، یہ بھلوئے ہیں، ان کے جوتے بھی ہیں اور یہ سیریلیک کے کچھ ٹیکس ہیں۔“ اُحسن دوسرا بڑا شائینگ بیک گاڑی سے نکال لایا۔
 ”نہیں نہیں، میں نہ ہرگز نہیں رکھ سکتی۔“ پلیر اُحسن! وہ ایک دم پریشان ہو گئیں۔
 ”چلیں ابھی نور حسین نا، اسدہ نہیں لاؤں گا۔“ وہ صکتا بولا۔ رانی نے اسے چاہے دینے کے بعد چن میں پڑا اٹھلا کھولا۔

انہیں ماں کے اس درد خیال رکھنے اور اپنی بے بسی بردھانا آئے لگا تھا۔
 ”میں کل بھی آیا تھا اسد بھائی! آپ سے ملاقات نہ ہوئی۔ آج میں اظہار صاحب کو بھی اپنے ہمراہ لے کر آیا ہوں۔“ اُحسن کے طوائف براسد نے نووارد کی طرف دیکھا۔
 ”ارے آپ تو غالباً ایک ڈلی نیور پیپر کے ایجنٹوں اور پٹر ہوئے ہیں۔“ اُحسن میں غلطی نہیں کر دیا۔
 آپ کا نام اظہار صدیقی ہے۔“ اسد کے انداز سے جیسی کھلتی گئی۔
 ”جی ہاں اور میں آپ کے لیے ایک پروپوزل لے کر آیا ہوں۔“ اُدھیر عمر اور شکل و جسم امت سے معتبر نظر آنے والے اظہار صدیقی صاحب محل سے گویا ہوئے۔
 ”جی فرمائیے۔“ وہ قدرے حیران نظر آئے۔

”اُحسن صاحب نے مجھے آپ کی بیماری کے متعلق بتایا ہے، آپ ایک منجھ ہوئے اور برائے فکر ہیں، صحافت کے میدان میں آپ کا ایک نام ہے، ایک مقام ہے اور بہت کم عمر سے میں آپ نے ایڈیٹر شپ کی ذمہ دہارت اور پرنٹیشن حاصل کی ہے جو بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ ہمارے چیف صاحب کو ایسے ہی باصلاحیت، ایماندار اور اپنے کام سے لگن رکھنے والا صحافی درکار ہے۔ میں ان کی طرف سے آپ کے لیے جاب کی آفر لے کر آیا ہوں۔“

”لیکن میں تو جناب نہیں کر سکتا۔“ حیرا مطلب ہے اپنی بیماری کی وجہ سے فی الحال میں دماغی صحت نہیں کر سکتا۔“ انہوں نے اپنی لاچارگی کا اظہار کیا۔

”بی بی پروپوزل تو لے کر آیا ہوں۔“ اُدھیر آپ کو لون کے طور پر رقم دے گا، آپ اپنا آپریشن کروا دیں اور پھر ہمارا اخبار جوائن کر لیں۔ ایک سال تک آپ فزی کام کر سکتے ہیں، اس کے بعد آپ کی بے کاچائیں فیصد قرضے میں کٹ جائے گا۔ آئیے آئیے بی بی، بی بی کی رقم میں کی آجائے گی اور جب رقم پوری ہو جائے گی تو پوری تنخواہ ملا کرے گی، یعنی جوہ ہزار سات سو پچاس روپے، کیسے منظور ہے۔“
 ”اسد کا چہرہ خوشی سے گلزار ہو گیا پھر ایک دم کچھ سوچ کر انہوں نے لائے روٹنگل بڑا قابو پایا اور گہری نظروں سے اظہار صدیقی صاحب کا چہرہ ٹوٹنے لگے۔
 ”اظہار صاحب! آپ میرے گھر تک کیسے پہنچے؟ آپ کو یہاں کا پتا کیسے معلوم ہوا؟“
 ”میری بہن شائستہ، اُحسن صاحب کے آفس میں کام کرتی ہیں۔ اُحسن نے ایک بار یونہی باتوں باتوں میں اپنے صحافی بہنوئی کا ذکر کیا تھا۔ بات اسے بہت لگی، شائستہ نے گھر آکر ذکر کیا تو مجھے آپ سے رابطہ کا سہرا مل گیا۔“

”مائرہ! ارے بھی، تم کہاں رہ گئی تھیں۔ اماں پریشان ہو رہی تھیں۔“ چچی اسے اندر داخل ہوتا دیکھ کر جھٹکا کر مخاطب ہوئیں، مگر پھر ان کی بولی بند ہو گئی۔
 ”ارے یہ سن کو اسے آئی ہوتا! ان کے دل میں کوئی خدشہ جاگا۔ یہ تو وہ بہر حال جانتی تھیں کہ وہ آج کل اُسد کے گھر کے چکر لگا رہی تھی۔ دوشین مرتبہ ارسل بھی کیا تھا رانی بھی کو تو نہیں روک سکتی تھیں مگر ارسل کو کوئی ڈانٹ ملانی تھی۔

”مائرہ! آپ کے جڑواں پوتے ہیں۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔ اخبار بڑھتے پچا افضل نے چونک کر اخبار چہرے سے ہٹایا۔ ایک جیسے ہلکے نیلے اولی لباسوں میں روٹی کے گالوں جیسے نرم و گلابی بھر پور تندرست اور خوب صورت بچے دل موہ لینے والی شائستگی کے ساتھ مائرہ کے دونوں ہاتھوں کی انگلی پکڑے کھڑے تھے۔
 ”بھونہ!“ چچی جلدیلا کر کھڑے لے نکل گئیں۔

”جاؤ بیٹے! یہ تمہارے دادا ابو ہیں۔“ وہ بچوں کو لے کر پچا افضل کے پاس آئی۔
 انہوں نے بے اختیار انہیں گود میں بھر کر پیشائیاں چوئیں۔
 ”ایک ٹھنڈک سی اتڑی چلی گئی تھی۔“ انہیں لگا جیسے انہوں نے معصوم و تین صورت والے چھوٹے سے پیارے سے اسد کو کیلچ میں سمولیا ہے۔

پدرانہ شفقت پکھل پکھل کر ان کے سینے سے بچوں کے دل میں منتقل ہونے لگی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرا آئے تھے۔

”کیا نام ہے آپ دونوں کا۔“ ان کا لہجہ بہت مدہم تھا۔ ان کی نظریں بچوں کے چروں پر جم ہی گئی تھیں۔ وہ بار بار یوں دیکھ رہے تھے جیسے دل نہ بھر رہا ہو۔

ماثرہ ان کی کیفیات نوٹ کر رہی تھی۔

اس نے بچوں کو دادی اماں سے بھی ملوایا۔ انہوں نے جی بھر کر پیار کیا اور تری ہوئی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

ایک گھنٹے بعد جب وہ انہیں واپس چھوڑنے جا رہی تھی تو اس کے ہمراہ چچا افضل بھی تھے۔ دادی اماں نے بچوں کو پانچ پانچ سو روپے دیے تھے، ساتھ میں پھل، چپس، بسکٹ، چاکلیٹس وغیرہ بھی ہمراہ تھے۔ ”ابو جی آپ۔۔۔!“ باپ کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گئے۔ جونہی حیرت ٹوٹی، انہیں سلام کیا۔

ہر ابھرا ہوا بہار درخت خزاں کے بے رحم پنجے میں کس بری طرح مر جھا گیا تھا۔ ان کا دل کٹنے لگا۔ وہ ان کا خون تھا۔ ان کا مینا تھا۔ وہ کیسے اس حقیقت سے انکار کر سکتے تھے۔

”بیٹے! گھر چلو، میں تمہارا علاج کرواؤں گا۔ بچوں کو بھی لے لو۔“ وہ ہار گئے تھے، لہجہ دل گیر اور بھرا ہوا تھا۔

”مگر میری بیوی۔۔۔ رابی۔۔۔“ ان کا لہجہ مضبوط اور اٹل تھا۔

”اسے کچھ عرصے کے لیے میکے بھیج دو، جب حالات ٹھیک ہوں گے تو۔۔۔“ وہ نظر پڑا کر بولے، لہجہ کمزور تھا۔

”نہیں ابو جی!“ اسد کے لہجے کی مضبوطی اور قطعیت میں انچ برابر کی نہیں آئی۔

”پھر ہم“ بھی تب ہی آئیں گے جب حالات ”ہم“ سب کے لیے ٹھیک ہوں گے۔ وہ ہم سے الگ نہیں ہے ابو جی! میرے لیے اس کی قربانیوں، محبتوں اور حوصلوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ جب ہر قدم یہ ”ہم“ قدم ”ہم“ رہی ہے تو پھر اب یہ دوری کیوں۔۔۔ آپ کا بہت بہت شکریہ ابو جی! رابی ہوتی تو آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی۔ وہ بہت اچھی ہے، اتنی اچھی کہ آپ اس کو پسند کیے بغیر رہ ہی نہیں سکیں گے۔“ افضل چچا تھوڑی دیر تک بیٹھ کر شکستہ قدموں سے واپس چلے گئے۔

☆☆☆

اسد کے آپریشن کی تمام تر دوڑ بھاگ احسن کی تھی۔ رابی سر سے پیر تک بھائی کی شکر گزاں تھیں۔ وہ احسن کے ساتھ ہاسپٹل جاتیں تو پیچھے ماثرہ دونوں بچوں کو سنبھالتی تھی۔ چچی کی ناراضی اور غصے کے باوجود وہ اکثر بچوں کو اپنے ہمراہ گھر لے آتی تھی۔

اس نے چچا کو اسد بھائی کے لیے پیسوں کے بندوبست اور آپریشن کے بارے میں بتا دیا تھا۔ چور لہجے میں وہ اکثر ہی اس سے اسد کی طبیعت پوچھتے تھے۔ آپریشن والے دن وہ بھی ہاسپٹل میں تھے۔ دادی اماں گھر پر بے چین پھر رہی تھیں۔ وہ بار بار مصلّا بچھا کر بیٹھ جاتیں۔

ماثرہ دونوں بچوں کے ساتھ ہاسپٹل میں تھی۔ احسن وقفے وقفے سے رابی آپا کو تسلیاں دے رہا تھا۔ جو ضبط کی تصویر بنی آنسوؤں کو اندر ہی اندر رہی تھیں۔

”آپریشن کامیاب ہو گیا ہے۔“ یہ اطلاع گویا سوکھے دھانوں پر پانی ڈال گئی تھی۔

ایک ماہ تک گھر میں آرام کرنے کے بعد اسد نے اظہارِ صدیقی کا اخبار جو ان کر لیا تھا۔

ماثرہ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر لاہور آئی تو امی نے عجیب و غریب بات سنا لی۔

”تمہاری یاسمین چچی نے تمہارے لیے ارسل کا رشتہ مانگا ہے، انہوں نے فون پر بات کی تھی۔“

”میرا اور ارسل کا رشتہ۔۔۔“ وہ ہکا بکا کھڑی ماں کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ ”وہ تو مجھ سے صرف ایک

آدھ سال بڑا ہے۔ اور اس کا زندگی گزارنے کا اسٹائل نہایت لا پرواہ اور ”منجلا“ قسم کا ہے وہ عملی زندگی

کی ذمہ داریوں اور ضرورتوں کے بارے میں کیا جانے۔ میں اتنے انچور بندے سے شادی نہیں کر

سکتی۔“ امی نے اس کی رائے جان کر دوبارہ بات نہیں چھیڑی۔ مگر جب وہ اسلام آباد واپس آئی تو چچی کا

رویہ بہت اکھڑا اکھڑا اور اجنبی سا تھا۔

غالباً ارسل کے رشتے سے انکار ان تک پہنچ چکا تھا۔ یہ بے گانہ اور بھٹایا ہوا رویہ اسی کا ردِ عمل تھا۔

ماثرہ کو زیادہ عرصہ تک یہاں اپنا قیام مشکوک نظر آنے لگا تھا۔

☆☆☆

”احسن! مجھے تم سے یہ امید ہرگز نہیں تھی۔“ امی غضب ناک نظر آرہی تھیں۔

احسن خاموشی سے ان کی کیفیت ملاحظہ کر رہا تھا۔

”پہلے بہن اور اب بھائی صاحب بھی اسی خاندان میں جا گھسے“ ہیں۔“ وہ بڑبڑا رہی تھیں۔

”کیا تم لوگوں کو اور کوئی گھر نظر نہیں آیا تھا۔ ابھی تو ایک ”ذلت“ کا بوجھ سر سے نہیں اترا۔ اپنے

خاندان میں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ معاملہ سمٹا ہے تو اب تم نئی قیامت

ڈھانے چلے ہو۔“ وہ خچی سے بولیں۔

”امی۔۔۔ کم از کم اس سلسلے میں تو کوئی ذلت، رسوائی یا غلط بات شامل نہیں ہے۔“ وہ انہیں

شانوں سے تھام کر صوفے پر لے آیا۔

”کیونکر شامل نہیں ہے۔“ وہ گڑگڑا کر بولیں۔

”جن لوگوں سے ہمارے تعلقات کشیدہ ہیں ان سے رشتہ مانگنے کیسے جاؤں؟ پہلے ان کے بیٹے

خاور کے لیے انکار کیا۔ پھر تمہارے اور اجیہ کے رشتے سے۔ اب وہاں دوسری لڑکی کو تمہارے لیے مانگنے

کیسے جاسکتی ہوں، اور پھر وہ ذلت میں کیسے بھول سکتی ہوں جب رابی کی مرنے والی کیفیت کے پیش نظر

اس کے اور اسد کے رشتے کی بات کرنے میں اور تمہارے ڈیڈی ان کے ہاں گئے تھے اور انہوں نے جی

بھر کر طرزیے تھے۔ ذلیل کیا تھا اور رابی کو کیا ہے سے انکار کر دیا تھا۔ ہرگز نہیں۔“ ان کا لہجہ سخت تھا۔

”آپ افضل صاحب کے ہاں جانے کے بجائے ان کے بڑے بھائی شکیل صاحب کے ہاں

لاہور جائیں۔ ان سے ان کی بیٹی کا رشتہ مانگیں۔ ماثرہ کے والدین بہت سلجھے ہوئے، بڑھے کھسے،

مہذب لوگ ہیں۔ ان کا رہن سہن بھی ہماری طرح کا ہے۔ مجھے یقین ہے ان سے مل کر آپ کو دلی خوشی

ہوگی۔“

ان کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔
 ”دور سے اچھا ہے، ٹکلیل نے خون کر کے مجھ سے مشورہ کیا تھا اور میں نے اسے ہاں کرنے کو کہا۔“
 ”دادی اماں کا لہجہ دلوک تھا۔“

”ہاں ہاں، آپ تو ہمیشہ سے میرے بچوں کی دشمن رہی ہیں۔ ان کی کوئی خوبی آپ کے دل کو نہیں آتی۔ جنہوں نے میرے بچوں کو ٹھکرایا، آپ انہی کی جھولیاں بھر رہی ہیں۔“ چچی اوجھی آواز میں رونے لیں۔

چچا افضل بھی ان پر خفا ہو رہے تھے مگر دادی اماں نے پروا نہیں کی۔
 ”وہ بھی تمہارا بیٹا تھا، جس کے ساتھ تم نے دشمنی کی اور اب تک کر رہے ہو۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو اترنے لگا۔

”زہرہ کو میں اپنی خوشی سے بیاہ کے لائی تھی۔ وہ ماں بننے والی تھی تو میں نے پھیلی کا چھالہ بنا کر لھا تھا۔ اس کو جنم دیتے ہی وہ مر گئی۔ لیکن افضل علی! اس کا باپ تو زندہ تھا۔ تم نے جیتے جی اس کے سر سے باپ کا ستارہ چھین لیا۔ وہ بدترین بیماری میں مبتلا ہو کر مر پڑا رہا۔ اور تم بیوی کے کہنے میں آ کر اسے ہوٹل سمجھ کر جس بنے بیٹھے رہے۔ تم نے باپ ہو کر خبر نہیں لی اور اس بچی نے محض پچازاد ہونے کے لئے ان کے دکھ سکھ میں ساتھ دیا۔ ان کی خبر گیری کی! افضل علی! تم انسانیت کہاں رکھ کے بھول آئے؟“ ان کے انداز میں ملامت تھی۔

”میں سمجھا تھا بونہی معمولی سا سر درد ہے۔ باقی سب جذباتی بلیک میلنگ ہے۔ جب پتا چلا تو بات ہٹ آگے جا چکی تھی۔“ وہ نظر پڑا کر کف افسوس ملنے لگے۔ لہجہ ناؤم اور آہستہ تھا۔
 ”اسے اور اس کے بیوی بچوں کو گھر واپس لا کر تم اس بے حسی کا ازالہ کر سکتے تھے۔“
 جواب میں وہ چچی کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ دادی اماں کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔
 ”بہر حال، یہ کاغذات تمہیں دکھانا تھے۔“ انہوں نے فائل افضل چچا کو دی۔
 ”یہ کیا! آپ نے نہایت قیمتی مالیت کا کمرشل بلاٹ اسد کے نام کر دیا ہے۔“ افضل چچا کے پیچھے ٹکی کی ہر زور ہائے غمی گونجی تھی۔ وہ کچھ پڑ کر صوفے پر گر گئی تھیں۔

”ہاں۔۔۔“ دادی اماں بہت پرسکون تھیں جیسے کوئی بوجھ سر سے اتر گیا ہو۔ ”تمہارے باپ نے ہلاٹ مجھے دیا تھا اور تم جانتے ہو، جو چیز اپنی زندگی میں تحفہ کسی کو عنایت کی جائے، وہ وراثت میں نازل نہیں کی جاتی۔ وہ میری چیز تھی اور میں اسے تحفے کے طور پر اسد کے نام کر رہی ہوں۔ تاکہ اگر تم سے اپنے خاندان کی شناخت اور حصہ دینے سے انکاری ہو جاؤ تو بھی اس کے پاس ”درشے“ کے طور پر کچھ نہ ضرور رہے۔“
 وہ کہہ کر واپسی کے لیے مڑ گئیں۔

”اور ہاں، کوئی جائے نہ جائے، میں مازہ کی شادی میں ضرور جاؤں گی۔“
 ”دادی اماں ”حاضرین“ کو سناٹے کے عالم میں چھوڑ کر چلی گئیں۔
 ”وہ بلاٹ کسے کہ بھی پچاس لاکھ مالیت کا ہے۔ میں کب سے اس لگائے بیٹھی تھی کہ شاید آپ کے یا خاور بیٹے کے نام کر دیں مگر۔۔۔ اف اتنا دھوکا، اتنا فراڈ اتنا عرصہ خدمتیں ہم نے کیں اور صلہ

”مگر خاندان تو ایک ہی ہے نا؟“ وہ اس کے مسلسل اصرار پر جھنجھلا کر رہ گئیں۔ ”ظاہر ہے دونوں بھائیوں کا آپس میں میل جول تو رہتا ہی ہے۔“
 ”مازہ کی فیملی بہت کم کم یہاں آتی ہے۔ دونوں گھرانوں میں اتنی قربت نہیں ہے کہ ایک دوسرے کے فیصلے پر اثر انداز ہو سکیں۔ دونوں اپنے اپنے معاملات میں آزاد ہیں۔ پلیز امی۔ رابی آپنی کو بھی رشتہ دل و جان سے پسند ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔“ احسن بچی ہوا۔
 ”اچھا بابا۔۔۔“

امی لاہور خاصے بڑے دل سے اور محض بٹنے کی خوشی کی خاطر روانہ ہوئی تھیں لیکن مازہ کے گھر والوں سے مل کر ان کے دکھ رکھاؤ اور تہذیب و شائستگی کے پر جوش رویے نے ان کی ساری ناپسندیدگی اڑا کر چھو کر دی۔

انہوں نے بڑی چاہ سے مازہ کے رشتے کی بات کی۔ انہیں اس کے والدین کا اخلاق بہت بھایا تھا۔ انہوں نے انکار تو نہیں کیا مگر سوچنے کے لیے مہلت ضرور طلب کی۔

☆☆☆

مازہ صرف چچی کے ہی نہیں سب گھر والوں کے تیور بدلے بدلے محسوس کر رہی تھی۔ خاص طور پر اجیہ تو اسے یوں گھورتیں گویا کچا جابائیں گی۔ رشتے سے انکار پر ارسل ویسے ہی اس سے کترانے لگا تھا۔ باقی بہن بھائیوں کا رد عمل بھی بے زار کن اور اجنبی ہوتا جا رہا تھا۔
 اور اس دن تو اس نے چچا افضل کی آنکھوں میں بھی اپنے لیے غصہ اور سرد مہری محسوس کر لی۔
 ”احسن نے اپنی والدہ کو ہم سے بات کرنے کے بجائے لاہور کیوں بھیجا؟“ وہ خشک لہجے میں اس سے مخاطب تھے۔

”تو گویا اسی لیے بھاگ بھاگ کر اسد کے ہاں جاتی تھیں۔۔۔“ چچی پھینکا دیں۔
 مازہ کا چہرہ احساس ذلت سے سرخ پڑ گیا۔

”آپ۔ الزام نہیں دے سکتیں چچی۔“ وہ برہمی سے بولا۔
 ”میں اسد بھائی کے ہاں صرف بھابھی کے لیے جاتی ہوں، آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہنا ہی ہے تو یہ کہیں کہ آفس میں احسن سے ٹیکس بڑھائی ہیں۔“ وہ طنز اُبولی۔
 ”دیکھا۔۔۔ دیکھا۔“ چچی کا بارہ سوا نیزے پر پہنچ گیا۔

”کیسی عصوم سی تھی جب آئی تھی اور چار دن میں پرلگ گئے ہیں صاحبزادی کو۔ بس آپ ٹکلیل بھائی سے کہہ دیں کہ وہ کسی صورت اس رشتے کے لیے ہاں نہ کریں۔ ورنہ ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارا تعلق ٹوٹ جائے گا۔ ہماری جان کے دشمنوں سے میل کر رہے ہیں، غضب خدا کا میرے بچے ٹھکرائے جا رہے ہیں اور دوسروں کے بچے اسی خاندان میں کھپ رہے ہیں۔“
 اصل تکلیف تو اسی بات کی تھی انہیں۔

مازہ سخت تلملائے ہوئے انداز میں باہر نکل گئی تھی۔
 ”ٹکلیل اس رشتے کے لیے کیوں انکار کرے۔ کیا ہمیشہ ہر بات تمہاری ہی سنی اور مانی جائے گی۔“
 ”ہاں! دادی اماں اچانک کمرے میں داخل ہو گئیں۔ لہجہ آہستہ لگتا تھا۔

دوسرے کو مل گیا۔“ چچی دادیلا مچانے لگیں۔

لیکن افضل چچا حیرت انگیز طور پر پرسکون ہو گئے تھے، شاید بیٹے کے محفوظ مستقبل کا سوچ کر ہو گئے تھے۔

☆☆☆

دو ماہ کے اندر اندر شادی کی تاریخ طے ہو گئی، گویا چٹ منگنی پیٹ بیاہ والی بات ہوئی تھی۔ آفس سے چھٹی لے کر لاہور جا چکی تھی، دادی اماں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ ان کا ارادہ بڑے پاس مستقل رہنے کا تھا۔

اسد بھائی اور رابی آپا نے اس رشتے کا بھرپور خیر مقدم اور دلی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

رابی بہت دل سے بھائی کی بری بنا رہی تھیں۔

اس دن احسن کی مایوں بھی جب اسد نہایت عجیب سے تاثرات چہرے پر لیے احسن کو ڈھو ہوئے اس کے کمرے میں آئے۔

”آئیے اسد بھائی۔ میں تو ابٹن کے ”بھیا نک حملے“ سے بچنے کے لیے یہاں چھپا بٹھا ہوا شوخی و شرارت اور ایک نئی سی ترنگ تو یوں بھی ان دنوں احسن کے رویوں میں سے بھونچتی محسوس تھی۔“ میں تم سے جو کچھ پوچھوں گا سچ بتانا ہوگا۔“ ان کا چہرہ گھبر اور لہجہ خوف ناک حد تک تھا۔ احسن کا دل دھڑکا۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔ آپ کہیے۔“

”میں چیف ایڈیٹر صاحب کے کمرے میں یہ دریافت کرنے گیا تھا کہ مجھے دو ماہ سے پوری مل رہی ہے جب کہ پروپوزل کے مطابق پہلے ایک سال مجھے فری کام کرنا تھا۔ بغیر سیکری کے۔ اگر بعد ہر ماہ کوئی ہوتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو ہر ماہ پوری سیکری ملنا کہ کیونکہ ادارے نے آپ کے آپریشن کی رقم نہیں دی اور نہ ہی ایسا ہوا کرتا ہے۔ رقم کسی اور نے دی اور اسے کا نام استعمال کیا گیا تھا۔ میں تو کھڑے قدم سے گر گیا احسن۔۔۔!“

وہ گہری سانسیں لینے لگے۔ لہجہ وحشت زدہ تھا۔

”بتاؤ، تم نے میرے ساتھ یہ فراڈ کیوں کیا۔ کیوں اظہار صدیقی کے پاس گئے۔ یہ جھوٹ بولا۔۔۔“ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ”تم نے دی تھی نا۔“

”اسد بھائی۔۔۔“ اس نے بحرمانہ انداز میں سر جھکا لیا۔

”یہ سچ ہے کہ اظہار صدیقی صاحب از خود میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے یہ آفر کی تھی جب آپ ٹھیک ہو جائیں تو ان کے آفس کو جوائن کر لیں۔ چیف ایڈیٹر صاحب باصلاحیت صحافیوں لیے ہمیشہ منجائش نکال لیتے ہیں، البتہ بانی کا پلان میرا گھرا ہوا تھا۔ اظہار صدیقی صاحب اور ایڈیٹر کو اعتماد میں لینے کے بعد اس پر عمل کیا گیا تھا۔ آپ اور رابی آپا مجھ سے رقم لینے پر کسی طور رضا نہیں ہوتے تھے۔ میرے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میں آپ کے والد صاحب کے پاس بھی گیا تھا وہ ہی آپ کو اپنالیں، بہر حال باپ سے مدد لینا کسی طور شرمندگی کا باعث نہیں ہوتا مگر وہ بھی راضی

دے تو میں نے اظہار صدیقی صاحب کا سہارا لیا۔“

اسد نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے احسن کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ بری طرح ہراساں

لگائی دیا۔

”اسد بھائی! پلیز، آپ رقم کو قرض سمجھ لیجیے۔ بھلے مجھے لوٹا دیجیے گا بعد میں۔ لیکن آپ مجھ سے

اراض نہ ہوں۔“ وہ التجائیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”کیا تمہاری آپا بھی اس ”پلان“ میں شامل تھیں؟“ وہ اسے تول رہے تھے۔

”نہیں، صرف ماڑہ کو پتا تھا شروع سے ہی۔۔۔“

”وہ بھی بہت گھٹی نکلی۔“ اسد بڑبڑائے۔

”اسد بھائی! بس پلیز، آپ اس بات کو بھول جائیے۔ اپنی انا کا مسئلہ بنا کر کڑھتے نہ رہیں۔

یقین کیجیے میں پہلے آپ کا بھائی ہوں پھر سالا ہوں۔ آپ یوں سمجھ لیں، گویا اپنے بھائی کا پیسہ استعمال کیا

ہے۔“ وہ شدتوں سے انہیں منانے کے جتن کر رہا تھا۔ اسد نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ ان کی

آنکھوں سے اشک بہنے لگے تھے۔

”کتنے عجیب مگر کتنے بلند ہوش، اتنا بڑا اور اتنا پیارا، حساس دل کہاں سے پایا ہے تم نے، بولو۔“

☆☆☆

بارات لاہور پہنچ چکی تھی۔

تکلیل صاحب نے افضل چچا کی فیملی کو کارڈ بھیجا تھا مگر صورت حال کے پیش نظر ان کی آمد کی کسی کو

وقع نہیں تھی۔

حیرت انگیز طور پر شادی سے ٹھیک دو دن پہلے چچی اور چچا مع اہل و عیال شادی میں شرکت کے

لیے پہنچ گئے۔

چچی کا رویہ ماڑہ کے ساتھ بہت شفیق اور نرم تھا۔ افضل چچا بھی گرم جوشی سے ملے تھے۔

زیادہ حیرت تو انہیں چچی جان کے اس بیان پر ہوئی۔

”تم رخصت ہو کر احسن کے گھر چلی جاؤ گی تو میں بھی اپنی بہو اور پوتوں کو گھر لے آؤں گی۔ گھر

میں سادہ سی تقریب ہوگی۔ صرف تکلیل بھائی اور احسن کی فیملی کو بلاؤں گی۔ اماں جی کو تو میں اپنے ساتھ

لے کر جاؤں گی۔ اور ہاں میں بارات کے ساتھ ہی واپس جاؤں گی بھی! اسلام آباد جا کر احسن کا ولیہ

بھی تو اٹینڈ کرنا ہے۔ احسن بذات خود کارڈ دینے آیا تھا۔ میں کیسے انکار کر سکتی ہوں۔“

”یا الہی! کیا یہ چچی ہی ہیں۔“

ماڑہ کو نندا اور وردہ سے مزید معلومات حاصل ہوئیں۔

”خاور بھائی کراچی میں از خود شادی کر چکے ہیں۔ انہوں نے امی سے پوچھنا تو درکنار شادی میں

شامل کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ اجیہ آپا کو ایک چالیس سالہ ادھیڑ عمریہ و فیسر صاحب پسند آ گئے تھے۔

موصوف ایک گیارہ سالہ بیٹی اور آٹھ سالہ بچے کے باپ ہیں۔ بیوی مرچلی ہے۔ امی نے سنتے ہی رشتے

والی کی سوت بھاڑ دیا تھا مگر اجیہ آپا بضد ہیں کہ ادھر ہی کریں گی۔ کیونکہ پردیفسر صاحب نے ان کی مرضی

سے رشتہ بھیجنا ہے۔ اجیہ آپ اُمی کے انکار پر بری طرح ان سے لڑ پڑیں کہ وہ اسی طرح اولاد کو گھر بٹھا بوڑھا کرنا چاہتی ہیں اسی لیے تو تنگ آکر خاور بھائی نے خود بیاہ رچالیا ہے۔ اگر وہ پروفیسر صاحب لیے نہیں مانیں تو وہ کورٹ میرج کر لیں گی۔ اُمی ان کی دھمکی سنتے ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں اور قبول کر لیا۔“

تمہیں اپنا بنالیں

”اوہ۔۔۔“ بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے۔“ وہ سوچنے لگی۔
”کیا خاور بھائی اور اجیہ آپ کے ہاتھوں مات کھا کر انہیں اسد بھائی اور ان کے بیوی بچوں بسانے کا خیال آیا یا پچاس ساٹھ لاکھ کی مالیت کی کشش نے اسد بھائی سے ”محبت“ جگا دی ہے۔ اہ دلوں کی تو وہی جانے۔“

☆☆☆

وہ ایف ایون کی مارکیٹ میں ”انٹیریئر ڈیکور“ کی عظیم الشان بلڈنگ میں داخل ہوئی تو سامنے بڑے بڑے گھر تھے۔

”تمہارے لیے ایک کام آیا ہے، ایک کینیڈین فیملی پاکستان میں سیٹل ہوئی ہے، انہیں اپنے گھر کیوریٹن پلس فرنشنگ کرائی ہے۔ میڈم نے تمہیں اسائن کیا ہے یہ پروجیکٹ۔“

”اوہ۔“ اس نے دلچسپی سے سر ہلایا تھا۔
”کیا وہ کینیڈا کی شہریت رکھتے ہیں؟ کیونکہ پھر تو انہیں ڈیکوریشن اور فرنیچر وغیرہ کا اسٹائل بھی اساجا ہے ہوگا۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”نہیں، ماں باپ پاکستانی ہیں۔ بچوں میں سے بھی بڑی بیٹی کی پیدائش یہیں کی ہے۔ باقی اپنے کینیڈا میں پیدا ہوئے۔ بڑی بیٹی ایک سال کی تھی جب وہ لوگ کینیڈا شفٹ ہوئے تھے۔ اب بس بعد وطن واپس آئے ہیں پچھلے ماہ۔ پہلے رشتہ داروں کے ہاں رہے، اب پچھلے ہفتے اپنا گھر خریدا نیلی گھر میں شفٹ ہو چکی ہے۔ ضروری اشیاء کے ساتھ مگر گھر ظاہر ہے ابھی خالی ہے۔ پہلے انہوں نے نا اور انٹیریئر ڈیکوریز کو ہائر کیا تھا۔ اس نے پورے لگوادے تھے پھر کسی وجہ سے اسے یہ پراجیکٹ ہاروا تو انہوں نے ہماری کمپنی سے رجوع کیا۔“

شہر ورنے تفصیلات سے آگاہ کیا۔
”میڈم آصفہ اس پراجیکٹ کو خصوصی اہمیت دے رہی ہیں۔ رچ فیملی ہے۔ ظاہر ہے بینڈسم ٹپے کرے گی۔ انہیں ہر چیز نہایت معیاری اور اعلا ویدہ زیب درکار ہے۔“

”بچہ تو اور بھی اچھا ہے، ظاہر ہے ہم سب پیسے کے لیے ہی کام کر رہے ہیں۔ میری گاڑی پچھلے کئی سالوں سے کالے تنگ کر رہی ہے۔ اگر اس پروجیکٹ سے ٹھیک ٹھاک کمیشن ملا تو میں اس کا نیا انجن بناؤں۔ سات ہزار کا خرچہ ہے اس کے روز روز کے چوک پہ بند ہو جانے کا خطرہ تو نہیں رہے گا۔“ اس نے ہنس کر بول دیا۔

”کل شام چار بجے اس ایڈریس پر پہنچ جانا۔“ شہر ورنے ایک کارڈ اس کے حوالے کیا۔
”ہول، مسٹر سفیان شاہ۔ ڈائریکٹر جنرل سفیان بلڈرز۔“ وہ کارڈ پڑھ رہی تھی۔
”مسٹر سفیان چار بجے آفس سے آ جاتے ہیں۔ اگر لیٹ بھی ہوئے تو وہاں ان کی بوڑھی ملازمہ

”اونہوں، اونہوں۔۔۔“ احسن کھنکھارتے ہوئے جملہ عروسی میں داخل ہوا تھا۔
”آداب۔۔۔“ اس کے شریر لہجے نے عروسی ہار سنکھار اور لباس سے دو آتشہ بنی مائرہ کو سحر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے پسلیاں توڑ کر سینے سے باہر آ جائے گا۔
”برا ہو اس ماڈرن برائیڈل میک اپ کا۔“ وہ لہبا صاحبان گھونکھٹ اٹھانے کی خواب ناک اور رومان پرور کارروائی کے لیے ترس گئے ہیں، جو نبی سہاگ کے کمرے میں قدم رکھو دلہن کا رخ روڑ نیون سائن کی طرح چمکتا ہوا عین سامنے ”رکھا“ ہوتا ہے گویا۔“

وہ لطیف چھیڑ خانی کا آغاز کرتا ہوا بیڈ پر عین اس کے سامنے نیم دراز ہو گیا۔
مائرہ کی مانو جان ہی نکل گئی۔ وہ سر سے پیر تک کانپ اٹھی۔
”غلطیاں کرنے کی تو آپ شروع سے از حد شوقین رہی ہیں لیکن یہ ”غلطی“ بہت صحیح کی ہے۔“

وہ بھرپور نظروں سے اس شعلہ جوالہ روپ کو آنکھوں میں جذب کر رہا تھا۔
”کون سی غلطی؟“ وہ بری طرح بدحواس ہوئی۔
”شادی کے لیے ”ہاں“ کرنے والی غلطی!“

اس کی قربت کا نشہ اس کے بھرپور وجود کے انگ انگ سے چمکتا، اس کی استحقاقانہ نظریں، ہر چیز مائرہ کے اوسان خطا کے دے رہی تھی۔

”احسن صاحب پلیز۔۔۔“ وہ اس کی بے باک جسارتوں اور گستاخیوں پر گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اسے پیچھے دھکیلنے لگی۔

”احسن صاحب! اب کچھ نہیں کر سکتے۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔
”کیونکہ اب بی بی ”بیوی“ میں تبدیل ہو چکی ہے لہذا احسن صاحب ہر گستاخی اور زیادتی کے بالکل آزاد ہو چکے ہیں۔ تو پھر شروع کی جائے محبت کی کہانی کی ڈرامائی تشکیل۔۔۔“
وہ نچلا ہونٹ دباتے ہوئے شرارت سے ہنس دیا تھا۔

☆☆☆

بچوں کے ہمراہ موجود ہوگی۔“

”کیا مطلب؟“ ارسلہ نے ہنسی اچکائی۔ ”کیا مجھے مسٹر سفیان سے تفصیلات ملے اور ان کی مسز؟“

”وہ پاکستان میں ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد واپس کینیڈا چلی گئی ہیں۔“

”مگر کیوں؟“ ارسلہ کا جس انداز نہایت فطری تھا۔

”کسی کام سے گئی ہیں۔“ شہروز نے مختصر آبتایا۔

”کس قسم کا کام؟“ وہ ابھن رن کرنے کے لیے پوچھ بیٹھی۔ شہروز نے اس سوال پر گہو

دیکھا تھا۔

”لاحول ولا قوۃ! ارے ابھی ہوگا کوئی کام، مجھے ان کے پرسنل افیئر ز سے کیا لینا دینا۔ تم کھال اتارنے بیٹھ جاتی ہو بعض اوقات۔“

”اچھا ابھی! ناراض کیوں ہوتے ہو۔ چلی جاؤں گی کل۔۔۔ ابھی! یہ بتاؤ، کوئی ٹیبل ور پھر میں آف کر لوں۔“ وہ براؤن لیڈر بیگ ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل کرتے ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے، جاؤ تم۔ اگر کچھ کام ہوا بھی تو میں دیکھ لوں گا۔“ شہروز حسن میں یہی تو خوب ہمیشہ اس کا بوجھ اور پریشانی سمیٹنے کے لیے تیار ہوتا تھا۔

وہ آفس سے باہر آگئی۔ سامنے پارکنگ ایریے میں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ یہ مارکیٹ میں نئی تھی اور نسبتاً ویران اور خاموش سی تھی۔

”افو۔۔۔ اب یہاں سے چکلا لہ اسکیم تھری تک کا طویل ترین راستہ، کباڑہ ہو جائے کرتے کرتے۔۔۔“ اس نے گاڑی کا لاک کھولنے کے بعد لاشعوری طور پر اپنے کندھے دبا۔

جب وہ گھر پہنچی تو پاپا شاہین فاؤنڈیشن سے واپس آچکے تھے۔ اس کے پاپا میجر ضیاء رب اور حکومت کی طرف سے ملے ہونے اس خوب صورت اور کشادہ اپارٹمنٹ میں اپنی دو بیٹیوں

رہتے تھے۔ ان کے اپارٹمنٹ کے عین اوپر والا اپارٹمنٹ ان کے بڑے بھائی کرنل سجاد کی ملک اتفاق سے دونوں بھائی آرمی میں رہے تھے۔ اور آگے پیچھے ہی ریٹائر ہوئے تھے۔ کرنل سجاد کی

خاصی تھی اور ہر وقت ان کا اپارٹمنٹ ”بارون“ اور ”پرنسز“ رہتا تھا۔

دونوں بھائیوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد ”شاہین فاؤنڈیشن“ جو اس کر لیا تھا۔

”اسلام علیکم پاپا۔۔۔“ میجر ضیاء نے بہت گرم جوشی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا تھا۔

”بھئی جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ٹیبل پر آ جاؤ۔ بھوک کے مارے آنتیں قل حوالہ پڑھ رہی“

”افو، ایک تو آپ بھوک کے بہت لپے ہیں۔ اور بھوک لگ رہی تھی تو ایک گھنٹے سے کھا رکھ کے کیوں بیٹھے تھے۔ کھالیا ہوتا نا۔“

”اپنے بچوں کے بغیر میں کیسے کھا سکتا تھا۔ نہ تم آئیں نہ روشن کالج سے لوٹی۔“ وہ ٹیبل پر آ۔

روشان آج لیٹ آئے گی۔ اس کی کلاس فیرویل پارٹی کی پریکٹس کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے، کونٹینشن ہے۔ فور تھ ایر کے اعزاز میں پارٹی دی جانی ہے اور اپنی روشن فیرویل پارٹی

”میں اچھی ہے۔“ وہ ہنس پڑی۔

”پاپا نے بھی تبصرہ کیا تھا۔“

”پاپا نے بھی تبصرہ کیا تھا۔“

”پاپا نے بھی تبصرہ کیا تھا۔“

”پاپا نے بھی تبصرہ کیا تھا۔“

”پاپا نے بھی تبصرہ کیا تھا۔“

”پاپا نے بھی تبصرہ کیا تھا۔“

”پاپا نے بھی تبصرہ کیا تھا۔“

”پاپا نے بھی تبصرہ کیا تھا۔“

”پاپا نے بھی تبصرہ کیا تھا۔“

”پاپا نے بھی تبصرہ کیا تھا۔“

”پاپا نے بھی تبصرہ کیا تھا۔“

”پاپا نے بھی تبصرہ کیا تھا۔“

”پاپا نے بھی تبصرہ کیا تھا۔“

”پاپا نے بھی تبصرہ کیا تھا۔“

نے تقہیبی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال تو یہ ہے کہ فی الحال آپ اس قصبے کو رہنے دیں۔ میں اپنی فیلڈ میں قدم جما بعد شادی کا ارادہ رکھتی ہوں۔ اور اسد بھائی کا بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ جب تک وہ لوگر نہیں کرتے آپ کو ذکر چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

باپ بیٹیوں کے درمیان ہر طرح کی بے تکلفی اور اظہار رائے کی آزادی تھی۔ یہی وجہ بہت اعتماد اور سکون کے ساتھ ان سے ہر طرح کے موضوع پر بات کر لیتی تھیں۔

”ایز یوش، لیکن بیٹے! ڈھائی سال کی منگنی بہت کافی نہیں ہوگئی؟ میری خواہش ہے کہ تم اپنا گھر سلاو۔“ انہوں نے اپنی سوچ کا اظہار کیا۔

”پاپا! روشان کو بہت دیر نہیں ہوگئی؟ اب تک تو آ جانا چاہیے تھا۔ چار بجنے کو ہیں۔“ وہ کپ میز پر رکھنے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی نظر گھڑی کی دوڑتی بھاگتی سوئیوں پر تھی۔

”جاؤ اپنی تائی جان کے ہاں جا کر معلوم کرو۔“ نینا آگئی ہے یا نہیں۔“ نیناں اور ویر وشار کلاس میں پڑھتی تھیں۔ اور اسی کی وجہ سے روشان ہر وقت تائی جان کے ہاں پانی جاتی تھی۔ دانت دانت کافی دوتی تھی۔

وہ سیرھیاں چڑھ کر تائی اماں کے پارٹمنٹ میں پہنچی تب ہی ڈور بیل بجاتے سیاہ ڈزربلیوس اسد پر نظر پڑی تھی۔

”السلام علیکم۔۔۔“ اس کو بہر حال آداب تو نبھانا تھا۔

”وعلیکم السلام۔۔۔“ اسد جواب دے کر بے نیازی سے ڈور بیل کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

دوسرے لمحے کچن کی سائیڈ سے دروازہ کھل گیا۔

صبح کچن میں مصروف عمل تائی اماں دونوں کو ایک ساتھ آتا دیکھ کر خاصی محظوظ ہوئیں۔

”تائی جان! وہ دو مغرور مٹیاریں ابھی تک کالج سے نہیں لوٹیں۔ کچھ خبر ہے ان کی۔“

”نیناں کہہ رہی تھی، رہبر سئل کی وجہ سے دیر ہو جائے گی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے

سے فون کر کے بتایا ہے کہ آدھ پون گھنٹے تک آجائیں گی۔“

”کمال ہے، مجھے موبائل پہ نہیں بتا سکتی تھیں۔“ وہ جھنجھلائی۔ ”میں انہیں پک کر لیتی۔“

”میں پاپا کو بتا کر آئی ہوں۔ اچھا تائی جان! میں مارکیٹ جا رہی ہوں، ہفتہ وار سودا سلا

کچھ گروہری وغیرہ تو نہیں منگوانی؟“ اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”نہیں بیٹے! البتہ اگر کوئی الیکٹریشن مل گیا تو لے آنا۔ گیسٹ روم کے ہاتھ روم اور اس

اسٹور کی دائرنگ خراب ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ رومی کے کمرے کا چھوٹا فرنیچر بھی کام نہیں کر

سے خراب پڑا ہے، مگر روزانہ آج کل، آج کل کے چکر میں کام رہ جاتا ہے۔“

”لا حول ولا قوۃ۔۔۔“ کتنی موچھوں تلے اس کے ہونٹ بری طرح مشکوے۔ پیشانی

گئے تھے۔

”کیا گھر میں کوئی مرد نہیں ہے ان کاموں کے لیے؟ اب یہ مردوں کے بیچ گھس کر؟“

کریں گی۔“

وہ برہمی سے ماں کو گھور رہا تھا۔ اس پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی۔

”ارے بیٹا اور کون ہے اور کس کو پر دہا ہے۔ رومی اسدا کا کٹنا اور کام چور لڑکا ہے۔ کالج کا اسٹوڈنٹ

ہے۔ بیس برس کا ہے، مگر عقل نام کو نہیں ہے۔ احساس ذمہ داری چھو کر نہیں گزرا۔ اسے اپنے دوستوں اور

سیوزک کے جنون سے ہی فرصت نہیں ہے۔ رہے تمہارے ڈیڈی تو وہ آفس سے آئیں گے انٹرنیٹ پر

بیٹھ جائیں گے یا دوستوں میں نکل جائیں گے۔ لے دے کے یہی بچی رہ جاتی ہے۔“

”توبیٹ مین کس مرض کی دوا ہے۔“ اسد کئی سے گویا ہوا۔

”بھئی وہ تو روز گھنٹے دو گھنٹے کو آتا ہے۔ صفائی کر کے اور ایک دو مزید کام کر کے یہ جاوہ جا، اور

ارسد بیٹی سمجھ دار ہے۔ ہمیشہ سے وہی تو کرتی آئی ہے۔“ تائی اماں من سے انداز میں ہانڈی میں چھچھہ ہلا

رہی تھیں۔

”بیٹے! یہ شامی کباب مائیکرو ویو اوون میں رکھ دینا اسد کو چائے کے ساتھ دینے ہیں۔“

”جی اچھا۔۔۔“ اس نے پلیٹ لے کے اوون میں رکھ دی جو پہلے سے آن تھا۔ اسد ہونٹ چباتا

ہوا خاموشی سے اندر چلا گیا تھا۔

”میں چلتی ہوں تائی اماں۔“

”ارے بیٹا بیٹھو تو، چائے بن رہی ہے۔ پی کے چلی جانا۔“ تائی جان اس سے خصوصی شفقت کا

اظہار کرتی تھیں۔

”میں پانچ منٹ پہلے پی کے آرہی ہوں، پاپا کے ساتھ۔ ابھی تو بالکل بھی منجانش نہیں ہے۔“ اس

نے سلیقے سے معذرت کی اور باہر نکل گئی۔

”چائے لے لو اسد۔۔۔“ تائی اماں پلیٹ میں گرم شامی کباب اس کے سامنے رکھتے ہوئے

اسے متوجہ کر رہی تھیں۔

”تم ارسد کے ساتھ اتنے اکھڑے ہوئے کیوں رہتے ہو۔۔۔؟“

”مجھے اس کی مردانہ قسم کی عادتیں، سخت ناپسند ہیں۔“

اسد نے اپنے احساسات چھپانے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی۔

”عورت، نزاکت اور آہستہ روی کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔ ضرورت سے زیادہ ایکٹو، جرأت

مند اور ہر آلے سیدھے میدان میں ٹانگ اڑانے والی لڑکیاں مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ اوپر سے اس

کی جاب نے اسے مزید بے باک اور بے دھڑک بنا دیا ہے۔ جدھر جی چاہتا جاگھتی ہے۔ یہ بے خونی،

خود اعتمادی اور خود سری عورت کی شرمیلی و شائستہ فطرت کے خلاف ہے۔“

”لا حول ولا قوۃ۔۔۔“ تائی جان نے برا سامنے بنا کر بیٹے کے ارشادات پر رد عمل ظاہر کیا۔

”وہ اپنا بوجھ خود اٹھاتی ہے۔ کسی پہ انحصار نہیں کرتی۔ اس میں اتنا اعتماد ہے کہ وہ جو کام اپنے ذمے

لگتا ہے اسے احسن طریقے سے انجام دے سکتی ہے۔ وہ اپنے عمل سے ثابت کرتی ہے کہ اس پہ جو اعتماد کیا

جاتا ہے وہ اس کی حق دار ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ یوں بھی ان کے گھر میں کوئی بھائی

نہیں ہے۔ دونوں بہنیں ہی تو ہیں۔ اگر ایسے میں اس نے باہر کے کام اپنے ذمے لے لیے ہیں تو اس میں کیا برائی ہے۔“

”آپ کے لیے نہیں ہوگی۔ میرے لیے ہے۔“ اسد کا لہجہ تیز ہو گیا۔ ”میں اپنی بیوی کو اپنے مقابلے پہ کھڑا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ لڑکی ہے اور لڑکی بن کر ہے، آخر روشاں بھی تو ہے نا۔“

”روشاں کا اپنا مزاج ہے۔ اسلہ کا اپنا۔ دونوں میں کیا موازنہ کرنا۔“

”اسلہ کو انکل نے غیر ضروری آزادی دے رکھی ہے۔“ اسد کے دل میں اس کے لیے کوڑا گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔

”لیکن اس نے اس آزادی کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ خود کو اس کا اہل ثابت کیا ہے۔“

”ممکنی آپ نے اور ڈیڈی نے اپنی پسند سے کی ہے نا تو پسند کرتی رہیے جی بھر کر۔ مگر مجھے اس کا کے لیے مجبور نہ کریں۔“

وہ خشک انداز میں کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا، اس کا رخ اپنے کمرے کی جانب تھا۔

تائی جان تشویش ناک نظروں سے اپنے بگڑے ہوئے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔

اسد کا اپنا ایک مزاج اور نقطہ نظر تھا۔ جب کہ اسلہ شروع سے ہی بہت مختلف شخصیت کی حامل رہی تھی، اپنی عمر کے بچوں جیسی اس میں کبھی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ ذہین، حساس، ذمہ دار اور بلا کم و کسری محنتی۔ میجر صاحب نے اس کی صلاحیتوں کو جانچنے کے بعد اسے مقدور بھرا اعتماد اور تعاون فراہم کیا تھا جس نے اس کی شخصیت میں مزید نکھار اور پختگی پیدا کی تھی۔

اسد کا اسٹائل، سوچ اور نظریات اسلہ سے میل نہیں کھاتے تھے۔ وہ اسے بطور منگیتر صرف برداشت کر رہا تھا۔ کوئی خاص محسوسات بے دار کرنے میں قطعی ناکام رہا تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ آئندہ زندگی گزارنے کا سوچ کر وہ کوفت اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے لگتا تھا۔

☆☆☆

”کباب صدر اور میرے لذیذ ساتھیو۔۔۔ السلام علیکم۔۔۔ میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ مجھے اس محفل میں بلایا۔ اور اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔ ویسے اظہار قاضی بھی اچھا آرٹسٹ۔ اگر اسے موقع دیا جائے۔۔۔“

نیناں نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کالج کے ہال میں اپنی باری آنے پر روشاں کے ساتھ مل کر تیار کردہ آئٹم شروع کیا۔

یہ ایک مزاحیہ تقریر تھی۔

”ارے بھی یہ کیا بکواس ہے۔۔۔“ اس کی کلاس فیلو ہانے برا سامنہ بنایا تھا۔ مزید ایک دو۔ بھی نکتہ چینی کی۔

”آگے تو سن لو پہلے۔۔۔“ روشاں نے جھنجھلا کر کہا۔

”دوستو! آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ نورتھ ایئر وہ کلاس ہے جو کبھی کبھی ”واقعی“ کلاس میں پایا جاتی ہے۔ ورنہ عام طور پر آپ انہیں کیفیئر یا اورگائڈ میں بغیر مائیکرو اسکوپ کے دیکھ سکتے ہیں۔

ایس لیناں کی عادت ہے بقول شاعر۔

اے نورتھ ایئر، ساڈی نورتھ ایئر

ساری ٹیچرز کرن ایڈھی سیوا

کلاس دج نہ آن والیے

تے خڑے دکھان والیے

نیناں نے عطا اللہ عیسیٰ جیلوی کے گانے کا حشر کیا تھا۔

”نورتھ ایئر کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ کبھی کبھی کلاس لے کر ثواب کمانے میں کوئی حرج نہیں۔

لٹرا ایڈھی بہت ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ بچوں کو عیدی بالکل نہیں دینی چاہیے۔ اس سے وہ جاتے ہیں۔ طبیعت بگڑ جائے تو شاعر کے اس مشورے پر عمل کرنا چاہیے۔

جو دکھتا ہو گلا نزلے کے مارے
تو کر نمکین پانی کے غرارے

”چینگ۔۔۔ چینگ۔۔۔ یہ تو ڈاکٹر یونس بٹ کا اسٹائل ہے۔۔۔“ ثوبیہ کے گروپ نے شور مچا

”ارے بھی اسٹائل ہی لیا ہے، کوئی چوری تو نہیں کی۔ کاپی کرنے میں کیا حرج ہے۔ آج کل تو نون تک کاپی بننے لگی ہے۔“ نیناں نے روشاں کے ساتھ شور مچا کر پھر چپ کر دیا تھا۔

”غرا روں سے یاد آیا، آج کل غرا روں کا بڑا فیشن ہے۔ فیشن تو پھر فیشن ہے نا جی۔ مثال کے طور

ماری نورتھ ایئر کا چھٹی ناٹم فل میک اپ کے ساتھ بہانے بہانے سے گیٹ کے چکر لگانا اور ہمارے دی ہیروز“ کا قطار اندر قطار مودب و مستعد ہو کر کھڑے ہونا۔“ نیناں سنجیدگی سے پڑھ رہی تھی۔ اب دہلی دہلی ہنسی بکھر گئی۔

”بہت ماریں گی نورتھ ایئر کی“ باجیاں۔۔۔ ہانے ہنسی روکتے ہوئے کہا تھا۔

”اب کچھ بات پارٹی کے بارے میں ہو جائے۔ پارٹی کرنا اور پارٹی بنانا اچھی بات ہے۔ پارٹی

ہر طرح طرح کے آئٹم ہوتے ہیں لیکن وہ چاہے کسی قسم کی بھی ہو اس کا مقبول ترین آئٹم ”ریفریشنٹ“ ہوتا ہے۔ اور دوستو! فریشن رہنا کے اچھا نہیں لگتا۔ ہماری حکومت تو ہمیشہ ہی ”فریشن“ رہتی ہے۔ ہر

لٹے نئے چہرے وزیر اعظم کی کرسی پہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اور یہ صورت حال بے چارے پاکستان

ٹری کے اسٹوڈنٹس کے لیے بہت دردناک ہے۔“

”زبردست، اب مزہ آیا نا۔ یہ آئیڈیا کس کا تھا۔۔۔ مزاحیہ تقریر کا۔۔۔“

”ہم دونوں کا۔۔۔“ روشاں نے فخریہ سراٹھایا تھا۔

”ابھی آگے بھی تو سنو، دل تھام کے۔۔۔“ نیناں جوش میں آگئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا پیپر دوسری

رف سے الٹ کر وہ دوبارہ سلسلہ جوڑا۔

”حاضرین! آپ جانتے ہیں سب سے لمبی جڑ خربوزہ کی ہوتی ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ

ٹک پکڑتا ہے اور نورتھ ایئر کو دیکھ کر سارا کالج عبرت پکڑتا ہے۔ اللہ اللہ، یہ فیشن کی بہاریں، یہ میک اپ

کے لشکارے، یہ ادا، یہ تازہ انداز آپ کے۔ کالج سے فرار کا بہانہ بن گئے۔۔۔“ وہ گنگٹا نے لگی تھی۔
 ”خیر دوستو! کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔ ہماری مشہور فلمی آرٹسٹ قید جی، کیا خوب ڈانس کر
 ہیں۔ ایمان سے میرا تو ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ ہماری کینٹین کی تازہ بہ تازہ بنی ہوئی اور بار بار گرم کی
 گرما گرم چائے بہت اچھی ہوتی ہے۔ پیچھے اور وعا دیجئے۔“ نیناں نے اپنا آسٹم پیش کرنے کے بعد
 الوداعی کلمات کے بعد اجازت لی۔ سب نے تالیاں بجا لیں۔

”اب سمجھ میں آیا میں نے فیرویل پارٹی میں یہ آسٹم کیوں شامل کیا ہے۔“ روشن راج ہنر
 طرح گردن اکڑائے ہوئے تھی۔

”اب اگلا آسٹم میرا ہے۔ یہ ایک گروپ پر فارمنس ہے۔ نیناں تم بھی اپنی جگہ سنبھالو۔۔۔“
 آسٹم میں نیناں بھی شامل تھی۔

”پہلے ہمارے گروپ کا ڈانس آسٹم پر فارم کرنے وہ ہمیں ذرا جلدی ہے۔“ ہما صدیقی نے کہا
 انہیں حدیقہ کیانی کے ”دوپہ میرا مل کا“ پر پر فارم کرنا تھا۔ اس کے بعد ایک مزاحیہ خاکہ کیٹر
 گیا۔ چونکہ لڑکیاں آپس میں مل کر ریہرسل کر رہی تھیں اس لیے غیر سنجیدگی، لاابالی پن، ہنسی مذاق
 خواہ مخواہ کے شور شرابے کی وجہ سے ابھی تک کوئی تسلی بخش ریہرسل نہیں ہو سکی تھی۔

مشاعرے کے آسٹم کے لیے ممبر لڑکیاں ہی پوری نہیں ہو رہی تھیں۔
 ”یہ کس قسم کا مشاعرہ ہے۔ ہمیں ڈیڈ آسٹم ہی نہ ثابت ہو۔“ ہمانے خدشہ ظاہر کیا تھا۔
 ”ایک تو تم ہر کام میں پہلے سے شور مچانا شروع کر دیتی ہو۔“ روشن نے اس کی طبیعت صاف
 تھی۔

”ارے بھئی، مزاحیہ مشاعرہ ہے اور خاص طور پر فاضل ایئر والوں کے اعزاز میں لکھا گیا ہے
 پہلے ہمارے گروپ کی پر فارمنس دیکھو۔ پھر تنقید کی پیچی اٹھانا۔“
 روشن منتخب کی گئی لڑکیوں کو اس پر ایک مخصوص نیم دائرے میں بٹھا کر مائیک پکڑ کر شروع ہو گئی تھی
 ”حاضرین آگے ہیں شیخ صاحب۔۔۔ اب یہ ٹوپی سنوارنا بند کریں۔“ اس نے اپنی ایک سا
 لٹاڑا تھا۔

”اد اچھا جی اچھا۔۔۔ کیرہ سیرہ آن ہے نا۔۔۔ ہاں تو بہت ہی معزز سامعین معافی
 ہوں۔“

”پہلے میں اپنا کلام سناؤں۔۔۔“ روشن نے خیالی پکڑی سنبھال کر کھنکار کر عرض کیا۔

ہسٹری نے کے ہم پہ کیا گزری
 یہ بڑی دکھ بھری کہانی ہے
 کچھ نہ پوچھو اے فاضل والو
 کس مصیبت میں زندگانی ہے
 ابھی پاکستان بنانا ہے
 اور مغلوں کی خبر لانی ہے

”واہ۔۔۔ بہت خوب۔۔۔“ تنقید کرنے والے خاصے محفوظ ہوئے تھے۔
 اب اجتماعی کھی کھی شروع ہو گئی تھی۔
 ”اب میں دعوت دیتا ہوں محترم ”قلیل شفائی“ صاحب کو کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔“
 روشن کے دعوت دینے پر اس کے ساتھ بیٹھی کرن نے مائیک تھام لیا۔
 ”عرض کیا ہے۔۔۔“

اے ہسٹری کے کورس، اب تو ختم ہو
 پڑھ پڑھ کے ہم پاگل ہونے والے ہیں

”واہ، واہ۔۔۔ کیا پسینہ کوئی فرمائی ہے۔“ روشن لہک کر کہہ رہی تھی۔ پھر اس نے اس سے اگلے
 ساتھی ”احمد ناراض“ کو دعوت دی۔

کاموں کی اس قدر بھرمار دیکھ کر
 جی چاہتا ہے فاضل ہی چھوڑ جائیں ہم

”اب آتے ہیں مسٹر یوگن ویلیا۔۔۔ سوری مون ایلیا صاحب۔۔۔“ مون ایلیا صاحب اپنے
 مجھول حلیے میں مائیک کو اپنے آگے کھینچے ہیں۔

کالج میں پڑھ رہے ہو تو کیوں چپ ہو اس قدر
 اک آسمان سر پہ اٹھائے ہوئے چلو
 ”ایک شعر عرض ہے۔“ خان پکڑ آبادی نے اپنی باری پر گلا صاف کیا۔
 نوٹس بھی اچھے بنائی ہے میری فاضل مگر
 منہ بنانے میں تو اس کا کوئی ثانی ہی نہیں

”اوتے ہوئے۔ کیا تیر جگر میں پار ہوگا۔ نور تھ ایئر تو کھولتے کڑا ہے پر جا بیٹھے گی۔“ ہمانے مزہ لیا
 تھا۔
 ”معزز سامعین آپ کو یقیناً ہمارا مشاعرہ پسند آیا ہوگا۔ آخر میں سارے اسٹوڈنٹس کے حق میں
 دعا۔۔۔ ہاتھ اٹھالیں سب کے سب۔۔۔“

مجھے قید مکتب سے یارب چھڑا دے
 پڑھانا ہے جو کچھ وہ گھر پہ پڑھا دے
 قادر ہے ہر شے پہ مختار ہے تو
 ذرا میرے پرچوں کے نمبر بڑھا دے

”مزا آگیا۔۔۔“

”کیوں تم تو کہہ رہی تھیں ڈیڈ آسٹم ہے۔“ روشن نے بھنویں اچکائی تھیں۔

”اچھا بھئی، ساڑھے چار ہو رہے ہیں۔ اب چلتے ہیں۔ آخری ٹرپ دس منٹ بعد روانہ ہونے
 والا ہے۔“ لغتہ نے گھڑی دیکھی تو سب کو وقت گزرنے کا دھیان آگیا۔
 ”ارے بھاگو، ٹرپ نہ نکل جائے۔“ نیناں نے روشن کو دیکھ کر شور مچایا۔

”میں ٹرپ سے نہیں جاؤں گی۔“ وہ دھیرے سے گویا ہوئی۔
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں پرائیویٹ بس سے جائیں گے۔“ روشان اس کی طرف دیکھے بغیر گویا تھی۔

”کیا۔۔۔؟“ نیناں کو جیسے بچھونے کاٹ لیا تھا۔

”ہاں۔۔۔“ روشان اس کا بازو پکڑ کر مرکزی گیٹ کی طرف آگئی۔

”ارمغان کھڑا ہوگا۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے۔ بس دس منٹ لگیں گے، پھر ہم پرائیویٹ بس سے گھر پہنچ جائیں گے۔ اسی ٹائم پر جس یہ کالج بس ہمیں پہنچانی ہے۔“

”ارمغان۔۔۔؟؟؟“ نیناں کی آنکھیں تھیرے سے پھیل گئیں۔

”ہاں۔۔۔“ وہ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

”تم، جانتی ہو اس کا انجام؟“ نیناں بہت سنجیدگی سے اس کا چہرہ پڑھنے لگی۔

”ہاں۔۔۔ کیا انجام ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ باپا خانا ہوں گے، ازسلا ناراض ہوگی۔ لیکن پھر وہ مان بھی جائیں گے۔ آئی ایم شیور۔۔۔ ارمغان کوئی غیر تو نہیں ہے۔ میرا سا ماموں زاد ہے۔ باپا، ماموں کی فیملی سے رشتہ نہیں رکھنا چاہتے مگر میں تو ایسا چاہتی ہوں نا۔۔۔“ وہ اپنی حرکت کے جواز تلاش کر رہی تھی۔

”چچا جان نے برسوں سے تمہارے ماموں کی فیملی کا گھر میں آنا بند کر رکھا ہے۔ وہ ان کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اور تم ان سے رشتہ جوڑنے جا رہی ہو۔“ نیناں حیران تھی۔

”تم اپنی ننھی سی عقل کو زحمت نہ دو۔ بس منہ بند رکھنا، گھر جا کے نہ بک دینا۔“ وہ گیٹ کے باہر قدم رکھ چکی تھی۔

”وہ رہا ارمغان۔۔۔!“ روشان تیزی سے سیاہ پینٹ اور پنک شرٹ میں ملبوس ایک اسمارٹ سے لڑکے کی جانب بڑھ چکی تھی۔

نیناں ٹھنڈی سانس لے کر گیٹ سے کچھ فاصلے پر لگے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

دس بارہ منٹ بعد روشان سرشاری قدم اٹھاتی واپس آچکی تھی۔

”یہ تم کیا کرنے جا رہی ہو روشان؟“ نیناں کو فکر ہو رہی تھی۔

”ارے مجھے کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔ ایک ہی خاندان ہے ہمارا۔ گھر نہیں مل سکتے، اس لیے وہ مجھ سے بات کرنے کی خاطر یہاں آ جاتا ہے۔ کبھی کبھار وہ بتا رہا تھا ممانی، باپا سے ہمارے رشتے کی بات کرنے کا پروگرام بنا رہی ہیں۔“

”چچا جان کبھی بھی نہیں مانیں گے۔ یہ تم جانتی ہو۔۔۔“

”میں منوانا جانتی ہوں۔ اور یہ بات تم بھی جانتی ہو۔۔۔“

روشان کا لہجہ سپاٹ ہو گیا تھا۔

نیناں نے چپ سادھ لی تھی۔

☆☆☆

وہ گلی نمبر ۶ کے ”شاہ ہاؤس“ کی نیل بجاتے ہوئے اسٹاکش سے گیٹ کے اندر جھانک کر گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی۔

”جی کون۔۔۔؟“ اوپر ٹیرس کی گولڈن گرل سے ایک چودہ سالہ لڑکی نے جھانکا تھا۔ اس نے جینز اور بلیو اپر پہن رکھا تھا۔

”میں ”انٹیریئر ڈیکور“ سے آئی ہوں۔ ڈیزائنر ہوں۔ آپ کا گھر ڈیکورٹ کرنے کے لیے اسائن کی گئی ہوں۔ مسٹر سفیان شاہ گھر پر ہیں؟“

”جی آپ آج ایسے اندر۔۔۔ باپا بس پہنچنے ہی والے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد گیٹ کھل گیا۔ چونکدار نے ہاتھ سے اندر جانے کا اشارہ کیا تھا۔

بہت پر شکوہ طرز تعمیر تھا۔ ڈرائنگ روم کا فرش چاکلیٹ براؤن اور وائنٹ کمر کے پرنڈ خوب صورت چوکور ٹائلوں پر مشتمل تھا۔ عارضی طور پر ایک سادہ سا صوفہ سیٹ رکھا گیا تھا۔

اس نے اوپر نیچے کے کمروں کا جائزہ لیا۔

”کیا سارا گھر ڈیکوریت کرانا ہے؟ میرا مطلب ہے اوپر کا پورشن بھی؟“ اس نے نیچے آ کر چودہ سالہ تانیہ سے پوچھا تھا اس سے ڈیڑھ دو سال چھوٹی عانیہ تھی۔ چھوٹا بھائی آٹھ سال کا تھا، فریدوں۔

بچوں کی شائستگی، تہذیب اور نیر داری قابل رشک تھی۔ کینیڈا میں ملنے بڑھنے کے باوجود ان کے ہر انداز میں شرقی سبھاؤ اور مقامی رنگ و ہنگ نمایاں نظر آتا تھا۔

”مس! آپ کافی لیس گی یا کولڈ ڈرنک۔۔۔؟“

”تھینکس۔۔۔ بس آپ اپنے باپا کو بلا دیں۔“

”مس! عانیہ نے فون کر دیا ہے۔ ان کا آفس یہاں سے بمشکل دس منٹ کی ڈرائیو پہ ہے۔ وہ بس آتے ہی ہوں گے۔“

تانیہ نے جواب دیا تھا۔

”السلام علیکم۔۔۔ بیٹے! کیا حال ہے آپ کا۔۔۔؟“ ایک معمر خاتون اندر داخل ہوئیں۔

”یہ اماں ہیں۔ باپا کے گاؤں کی رہنے والی ہیں۔ گھر کی دیکھ بھال کے لیے باپا انہیں ساتھ لے آئے ہیں۔“ تانیہ نے تعارف کر دیا تھا۔

وہ بچوں سے باتوں میں مصروف تھی کہ سفیان شاہ آگئے۔

”السلام علیکم! آئی ایم سوری مس! آپ کا انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔“ لائٹ براؤن تھری پیس سوٹ میں قدرے بھاری مگر لانا اور بھرپور سراپا لیے وہ بردباری اور شائستگی کا واضح تاثر دے رہے تھے۔

”کس قسم کی لگ چاہتے ہیں آپ اپنے گھر میں؟ میرا مطلب ہے ویئرٹن یا ایئرٹن اسٹائل یا دونوں کا کسچر۔۔۔؟“ اسلئے نے پروفیشنل انداز میں گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

”جو آپ کو اس گھر کے لیے سب سے بہتر لگے۔“

رو۔ آج کل زمانہ بہت خراب ہے۔“ اس نے ہر بار کی طرح ارسلہ کو تائید کی تھی۔
 ”افوہ! یہ ہنسی پٹی نصیحت نہ کیا کرو بار بار، مجھے بھی پتا ہے، اس وقت تو چائے منگواؤ اچھی سی۔“
 اس نے پرسکون ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔

☆☆☆

”کیسی رہی تمہاری ریہرسل، کل تو فکشن ہے نا۔۔۔؟“ روشان جمعرات کو دیر سے گھر لوٹی تو
 سلا اس کی منتظر تھی۔

”بہت زبردست، کیا تم کل آؤ گی میرے کالج، ہماری پرفارمنس دیکھنے؟“ وہ بیگ اور فائل لاؤنچ
 بصرے پر رکھ کر کیشن لے کے وہیں کارپٹ پر دراز ہو گئی تھی۔

”نہیں یار، مجھے سفیان صاحب کے فرنیچر کے لیے آرڈر دینا ہے۔ کل کا دن بہت مصروف
 زمرے گا۔“ ارسلہ نے معذرت چاہی۔

”افوہ، تم آتیں تو تمہیں اندازہ ہوتا، ہم نے کتنے اچھے آئٹم تیار کیے ہیں۔ ابھی نیناں کے ساتھ مل
 کر ریہرسل کروں گی۔ تم دیکھنا تو سہی۔ وہ تھوڑی دیر بعد ادھر آئے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ ابھی تو میں بیٹیں ہوں۔ یہ پاپا ابھی تک نہیں آئے۔“ ارسلہ نے وال کلاک کی
 رف دیکھتے ہوئے خود کلامی کی۔

”کہاں گئے ہیں؟“ روشان نے بے فکری سے پوچھا۔

”واک! پھٹے تھے، تاپا کے ساتھ۔“

”کہیں دونوں ”ریٹائرڈ آرمی آفیسرز“ آپ کی اور اسد بھائی کی ڈیٹ فکس کرنے تو نہیں بیٹھ
 گئے۔“ روشان نے شرارت سے بڑی بہن کی طرف دیکھا۔

”اس موضوع پر میری پہلے ہی پاپا سے بات ہو چکی ہے۔ تم چائے پیو گی؟“ وہ کچن کی طرف
 بڑے ہوئے گویا ہوئی۔

”نہیں البتہ اگر اورنج جوس مل جائے تو نہایت شکر گزار ہوں گی۔“ روشان کپڑے تبدیل کرنے
 کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

نیناں آئی تو دونوں مل کر ”کالج کا خبرنامہ“ تیار کرنے لگیں۔

”ہمارے نامعقول ذرائع کے مطابق کالج کی لائبریری کی سربراہ اور انتظامیہ نے کتابوں کی عدم
 دستیابی کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے آئندہ سے ہر قسم کی نصابی کتب کے خاتمے کا فیصلہ کیا ہے ان کے اس
 سخت اقدام کو تمام اسٹوڈنٹس نے خوب سراہا ہے۔“

ایک اور خبر کے مطابق آج کالج کونٹیننٹ میں جنگ عظیم سوم کی سی کیفیت دیکھنے میں آئی۔ طالبات
 کے جنگجو گرد ہوں نے کرسیوں کے ذریعے زمینی جملے کیے جب کہ کتابوں، پلیٹوں اور چمچوں کے ذریعے

ہوائی حملے کر کے ایک دوسرے کو بھاری نقصان پہنچایا۔ اقوام درندہ نے اس جنگ کو بہت پسند کیا ہے۔
 امید ہے آئندہ چند روز میں پانی پت پارٹ ٹو کی ریہرسل بھی اسی جوش و خروش سے منعقد کی جائے گی۔“

نیناں خبریں پڑھ کر سنار ہی تھی اور ارسلہ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

چوٹس میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ پہلے میں نیچے کا پورشن فرنش اور ڈیکوریٹ کرواؤں گا، پھر کچھ
 گیپ کے بعد اوپر والا پورشن۔ میں نے اپنا بزنس کینیڈا سے حال ہی میں پاکستان شفٹ کیا ہے اس لیے
 فی الحال اگلے چھ ماہ تک میں اپرا سٹوری کی شاہانہ قسم کی سینگ انورڈ نہیں کر سکتا۔ آپ مجھے اپنی فیس بھی
 بتا دیجیے گا۔“

”فیس تو ادارہ ہی طے کرے گا۔ ہمیں تو صرف کمیشن ملتا ہے۔ آپ فرنیچر درڈیکوریٹیشن کی چیزوں
 کے لیے اپنی رینج بتائیے۔ کتنا بجٹ بنا رکھا ہے آپ نے؟“

”میرے ناقص اندازے کے مطابق دو لاکھ فرنیچر کے لیے اور ایک لاکھ ڈیکوریٹیشن کے لیے کافی
 رہے گا۔ کیوں کیا خیال ہے؟“ اس سے رائے طلب کر رہے تھے۔ ارسلہ اس وقت سرخ اور سبز کھلتے

ہوئے رنگوں کے شلوار سوٹ اور سرخ دوپٹے میں ملبوس تھی۔ گہری سیاہ آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور
 چہرے پر سنجیدہ دوبے نیاز مگر نہایت چونکا دینے والا بھرپور تاثر ہر وقت نمایاں رہتا تھا۔

اس کی بے نیازی ہی اس کی شان تھی۔
 ”جی۔۔۔“ وہ اپنے کسی خیال سے چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی جو لغو اس کا جائزہ لے رہے

تھے۔
 ”ٹھیک ہے آپ نے رینج بتا دی ہے میں اسی کے مطابق سینگ کروادوں گی۔ لیکن کارپنگ کے
 لیے آپ کو علیحدہ سے بجٹ نکالنا ہوگا۔“

”اس کی فکر نہ کریں، وہ میں ایک دودن میں ہی کروالوں گا۔ اور فرخنگ کے لیے اگر آپ کو مین
 پاور کی ضرورت ہو تو میرے پاس بہت سے درکر ہیں۔ بوقت ضرورت آپ مجھے آفس کال کر کے انہیں
 بلا سکتی ہیں۔“

”شکریہ۔۔۔۔۔“

”اب میں چلتی ہوں، کل آؤں گی۔ پردوں کے لیے کھڑکیوں کا ناپ لینے کے لیے ایک درکر
 ساتھ لاؤں گی۔ اس کے علاوہ فرنیچر کے لیے ٹیپلاگ بھی لیتی آؤں گی آپ ایک نظر دیکھ کر پسند کر لیجیے
 گا۔ تاکہ اس کا آرڈر دیا جاسکے۔“

”او کے مس! بس ایک بات کا خیال رکھیے گا کہ جو کچھ کرنا ہے، آپ لوگوں نے ہی کرنا ہے، میں
 اپنی فیملی کے ساتھ حال ہی میں کینیڈا سے آیا ہوں اور مجھے کسی مارکیٹ یا شاپ کا علم نہیں ہے۔“

وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
 ”آپ بے فکر رہیں، ہماری کمپنی ان تمام معاملات کو دیکھ لے گی۔ وہاں میل درکرز بھی ہیں جن کا
 ایسے ہی کاموں سے واسطہ رہتا ہے۔“

”ہاں بھئی، کیا رسپانس ہے؟“ وہ آفس آکر میڈم آصفہ کو رپورٹ دینے کے بعد باہر نکلی تو شہروز
 نے استفسار کیا تھا۔

اس نے مختصر اپنا تجزیہ بتایا۔
 ”جب بھی کام کے لیے نکلے تو پہلے وہاں رہنے والوں کی تمیز و تہذیب اور شرافت کا یقین کر لیا

”جلدی چلاؤ ارمغان! ہو سکتا ہے موسم کی خرابی کے باعث پایا، ارسلہ مجھے اور نیناں کو پک کرنے
نیں۔ نیناں اکیلی بے چاری اس صورت حال سے کیسے نبٹ سکے گی۔ ہمیں ہر حال میں پایا کے آنے
پہلے کالج گیت پر پہنچنا ہے۔“
”جو حکم جناب عالی!“ وہ مسکرا دیا۔ ”ورنہ دل تو یہی کہہ رہا ہے کہ اس آنکھ چھوٹی کھیلے بادلوں کے
ہم بھی اسی طرح اڑتے پھریں۔ بادلوں میں تیرتے رہیں۔“
”ہانی گاڈ، ڈیڑھ بج رہا ہے۔ نیناں بے چینی سے میری منتظر ہوگی۔“ روشان کو رہ رہ کر ہول اٹھ
تھے۔

وہ بایک سے اتر رہی تھی جب اس کی نظر کالج گیت سے قدرے ہٹ کر پارک کی سمت گئی، ٹیوٹا
لا کے دروازے سے ٹیک لگائے براہ راست اس کی طرف دیکھتے ہوئے پایا پر پڑی۔ وہ ہلکے نیلے
بی سوٹ میں ملبوس دونوں ہاتھ سینے پر باندھے پھرائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے

وہ کالج کے بجائے کہیں باہر سے آرہی تھی۔
ایک لڑکے کی بایک پر۔

اوردو لڑکا ارمغان تھا۔ اس کے ماموں کا بیٹا، جنہیں پایا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔
اس سے زیادہ اتہنا کیا ہو سکتی تھی، روشان سفید چہرہ لیے بایک سے اتری۔ ارمغان اسے اتار کر
موڑ چکا تھا، اس وحشت ناک صورت حال سے اسے اکیلے ہی بننا تھا۔

☆☆☆

”پاپا پلیز! کھانا کھالیں آپ نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔“

ارسلہ ہنسکی سے ان کے اسٹڈی روم میں داخل ہوئی تھی۔

انہوں نے سرخ بے خواب آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا بیٹیوں کو اسی لیے لاڈ پیار، مان اور آزادی دی جاتی ہے کہ وہ باپ کی عزت کو چوراہے پر لٹا
مل۔۔۔؟ ساری دنیا کہتی تھی بیٹیوں کو زیادہ لاڈ، محبت نہیں دیا کرتے۔ ان کی تربیت سخت ہونی
یہ تاکہ وہ آئندہ نسلوں کی حفاظت کی امین بن سکیں، لیکن میں ان کی باتیں مذاق میں اڑا دیا کرتا تھا
میرے لیے بیٹا، بیٹی برابر ہیں۔ دونوں کو ایک جیسا مان، پیار اور اعتماد ملنا چاہیے۔ کیا میں نے تم
بل پر بھروسہ کر کے غلط کیا تھا۔۔۔؟“ وہ اپنی شکست و ریخت کے عمل سے گزر رہے تھے۔

”پلیز پاپا! آپ ایسا نہ سوچیں۔ وہ کہہ رہی ہے میں ارمغان کے ساتھ ایسی ویسی جگہ یہ ہرگز نہیں
ماٹی، بلکہ ماموں ممانی کے گھر گئی تھی۔ ممانی نے اسے بلوایا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کھوٹے پھر نے کے
دسے قطعی نہیں گئی تھی۔ اور نہ کبھی وہ ایسا کرنے کا سوچ سکتی ہے۔“

ارسلہ نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

”میں اس وقت اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ تم جا کر اپنا کام کرو۔“ یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ
ماسے اتنی رکھائی سے مخاطب ہوئے تھے۔

”اب آپ سنیے موسم کا حال، کالج ہوٹل سے موصول شدہ اطلاعات کے مطابق ہوٹل میں
کی لائن بند ہو جانے کے باعث پورا ہاسٹل خشک سالی کا شکار ہو گیا ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے
کالج انتظامیہ نے کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ سے تعاون کی اپیل کی ہے کہ وہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ملا کر
بنانے کی کوشش تیز کر دیں۔ اس کے علاوہ پرنسپل اور ایگزیکٹو مینیشن کمیٹی کے کمرے کا موسم سخت گرم رہا۔
اس وقت خبرنامہ کمیٹی شدید عتاب کا شکار نظر آرہی ہے، اس سے پہلے کہ مجھ سمیت اس کمیٹی
کے پھینکا جائے ہم آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔“
”بہت خوب۔۔۔“ پاپا بھی اس دوران آچکے تھے اور ان دونوں کے تیار کردہ مزاحیہ خبرنامے
محفوظ ہو رہے تھے۔

”پاپا! پہلے ان سے پوچھیں کہاں سے نقل کیے ہیں یہ سارے آئیڈیاز۔۔۔“ ارسلہ نے بڑ
چھیڑا۔

”جی نہیں۔۔۔ ہم نے محض انپائریشن لی ہے۔ محنت ہماری اپنی ہے۔ بنایا بھی خود ہی ہے۔
دونوں تڑپ ہی تو گئی تھیں۔“

ان کی پارٹی اختتام پذیر ہوئی تو گھر والوں نے سکون کی سانس لی ورنہ شام چار پانچ بجے تک
کے انتظار میں دوسووں میں گھر رہتے تھے۔

اس دن موسم خاصا خراب ہو رہا تھا۔ ارسلہ بھی جلدی واپس آگئی تھی۔

”ارسلہ بیٹے! میں ذرا کرٹل ستار کی طبیعت پوچھنے جا رہا ہوں۔ روشان کے کالج کے آس
ہے ان کی کوٹھی۔ اگر ٹائم ہوا تو وہاں جیسی میں روشان اور نیناں کو پک کرتا ہوا آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے پاپا! یوں بھی موسم بھی عجیب ہو رہا ہے۔“

☆☆☆

موسم حسیں ہے لیکن
تم سا حسیں نہیں ہے
ہر اک ادا تمہاری
واللہ دل نشین ہے

ارمغان آج بہت موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔
”ارمغان پلیز، میں ویسے ہی بہت پریشان ہوں۔ تم یہ اٹلے سیدھے گانے گا کر مجھے مزید مینہ
”کرو۔“

احساس جرم اور پایا کے اعتماد کو پہنچنے والی ٹھیس کا سوچ کر اس کا رواں رواں نادم ہو رہا تھا۔
”ارسلہ اور پایا کو یہی معلوم ہے کہ میں کالج گئی ہوں اگر انہیں پتا چل جائے کہ میں صبح سے
سے غائب ہوں تو وہ کیا سوچیں گے۔ ہائے میرے پیارے پاپا۔۔۔!“

ارمغان بڑی ترنگ کے عالم میں اسلام آباد کی بھیگی کشادہ سڑکوں پر موٹر سائیکل چلا رہا تھا،
کہ بار بار گھڑی دیکھتی روشان کا شدید ٹینشن کی وجہ سے نروس بریک ڈاؤن ہونے کو تھا۔

ارسلہ باہر آ کر روشان پر برس پڑی۔

ابھا۔

☆☆☆

”اے کہہ دو ارسلہ! میری محبتوں اور میرے مان کا اتنا عبرت ناک صلہ نہ دے۔ وہ لوگ اس کے ردِ جال بن رہے ہیں۔ ان کا ہر اٹھتا قدم نیا فریب ہے تم دونوں کے نام لکھی گئی میر دولت کو، تھیانے ا۔ وہ ہمارے ہوئے انداز میں اگلے دن اپنے کمرے سے برآمد ہوئے تھے۔“

”پاپا۔۔۔ وہ۔۔۔“ ارسلہ کو بتانا محال لگ رہا تھا۔

”رضوان ماموں کا ابھی فون آیا تھا۔ وہ روشان کی ایما پر رشتہ مانگنے آپ کے پاس آ رہے ہیں۔ روشان نے کل ہی ساری صورت حال ارمنغان کے گوش گزار کر دی تھی فون پر۔ اسی وجہ سے۔۔۔“

ارسلہ سر جھکا کے بھرمانہ لہجے میں انہیں مطلع کر رہی تھی۔ ضیاء صاحب کارنگ پیلا پڑ گیا۔

”بہت بری طرح توڑا ہے مجھے روشان نے۔ میں تو خود اپنے نظریات سے ہار گیا ہوں۔ خود بچے آپ میں جھوٹا پڑ گیا ہوں۔“

”ہائے میرے پاپا۔۔۔“ ارسلہ کا دل دکھ گیا۔

اسے روشان پر جی بھر کے غصہ آیا۔

☆☆☆

”روشان نے کہا ہے کہ شادی کرے گی تو صرف اور صرف ارمنغان سے۔ ورنہ تمام عمر یونہی گزارے گی۔“

ارسلہ نے انہیں اس کے آخری فیصلے سے آگاہ کیا تھا۔

”وہ اپنے واسن میں انگارے بھر رہی ہے۔ بے وقوف۔۔۔“ وہ بڑبڑاتے تھے۔

”مگر وہ اپنی ہٹ کی پکی ہے۔ اس کی ضد سے تو آپ واقف ہیں۔ پھر کچھ بھی سہی ارمنغان ہے تو ہمارا ماموں زاد، سگارشتہ بنتا ہے۔ اتنا بھروسہ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ ارسلہ نے بے لفظوں میں موجود صورت حال کی سنگین کا احساس دلایا اور باپ کو آئندہ اقدام کے لیے سوچ بچار کرنے کے لیے نکتہ پیش کیا۔ ضیاء صاحب کے کندھے نیچے ڈھلک گئے۔ اولاد پر حتی کرنے والوں میں سے تو وہ کبھی بھی نہیں رہے تھے۔

”آخر کیا ضرورت تھی تمہیں پاپا کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی۔ گھر سے کالج کے لیے نکلیں اور سے چپکے سے کھسک لیں اس لڑکے کے ساتھ۔۔۔! شیم آن یوروشان! یہ کتنی گری ہوئی حرکت کہ تم نے نا صرف ہمیں بلکہ اپنے استاد کو بھی دھوکا دیا۔۔۔“

”تم یقین کرو ارسلہ! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن ارمنغان دو تین دن سے بار بار کہہ رہا ماموں، مہمانی مجھے یاد کر رہے ہیں۔ وہ یہاں تو نہیں آ سکتے تھے، اس لیے میں ان کے ہاں چلی گئی۔ وہ یہاں کیوں نہیں آ سکتے۔ پاپا کو اتنے ناپسند کیوں ہیں وہ؟ حالانکہ وہ تو بہت اچھے ہیں۔ پتا ہے، بار تہہ راپو چھ رہی تھیں۔“

ارسلہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

”جس بات سے والدین روکتے ہیں، اس سے رک جانا چاہیے۔ خواہ وہ کے جواز نہیں دے جائیں۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی پاپا کی ناپسندیدگی کی۔“

”کوئی وجہ نہیں، بس وہ کچھ غریب ہیں۔ اس لیے۔“ کو اچھے نہیں لگتے۔ ”روشان نے بگڑ کر ارسلہ اور روشان کی امی لاشانہ کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ خدا نے انہیں حسن کی سے نواز رکھا تھا۔ میجر ضیاء جو اس وقت نئے نئے کیپٹن بنے تھے۔ اچانک ان کی نظر کا شکار، لاشانہ چار بہنوں میں بی بی تھی۔ ایک بھائی، بھابھی تھے جو ان کے ذمہ دار تھے۔ رضوان نے کچھ ہی کیپٹن ضیاء سے بہن کی شادی کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ضیاء صاحب جدی پشتی امیر تھے۔ آری ا محض ان کا شوق، ان کی پسند تھی۔ لاہور کے نواحی علاقے میں ان کی وسیع زرعی اراضی تھی۔ شادی بعد بہن کے گھر آ کر اس نے بھی کاروباری امداد کے بہانے، کبھی کسی ناگہانی آفت کا حوالہ دے کبھی کسی بہن کی شادی کے اخراجات کے لیے کیپٹن ضیاء سے آئے دن رقمیں مانگنا شروع کر دیں صاحب اپنی عزیز از جان بیوی کے منہ کو دیکھ کر اپنے غمگین اور کام چور سائلوں کو نوازتے تھے۔ پھر بعد لاشانہ کی وفات کے بعد بھی رضوان نے اپنی ہڈ حرامی اور بے غیرتی کا مظاہرہ ترک نہیں کیا صاحب کو حتی سے کام لینا پڑا۔

اس دن لاشانہ کی دوسری برسی تھی۔ رضوان نے کاروبار کے لیے پچاس ہزار مانگے تھے۔

میاں بیوی آٹھ سالہ ارسلہ اور پانچ سالہ روشان کو چوم چاٹ رہے تھے۔

ضیاء صاحب کو ان کے خود غرض رویے کی یہ لینا پونہ زہر لگ رہی تھی۔

”برائے مہربانی آپ دونوں میاں بیوی دوبارہ یہاں تشریف لانے کی زحمت نہ کریں پچیاں ماموں، مہمانی کی محبت کے لیے مری نہیں جا رہیں۔ یوں بھی آپ کی بہن اس دنیا میں نہیں اب آپ کا اس گھر سے کوئی رشتہ، واسطہ نہیں ہے۔ رہی پچیاں تو وہ سراسر میری ذمہ داری ہیں۔“

”محبتوں“ کے بغیر بھی وہ بڑے آرام سے ہیں۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں بھائی صاحب۔“ رضوان فوراً چا پلوٹل انداز میں مخاطب ہوئے۔ ضیاء صاحب کو ان لاپچی اور فریبی لوگوں سے مزید تعلق رکھنا منظور نہیں تھا لہذا دو ٹوک دوبارہ نہ آ۔

”پتا نہیں چلتے چلتے خود ہی بند ہو گئی ہے۔“

”خود ہی کیسے بند ہو گئی؟“

”افو! ایک تو بات بے بات جرح کرنے لگتے ہو۔ مجھے کیا پتا کیسے بند ہو گئی۔ یہ تو گاڑی سے پوچھ کے بتا سکتی ہوں کہ تمہیں کیا مرض لاحق ہوا ہے۔“ وہ جل کر کہہ رہی تھی۔ ”تم یہ بتاؤ، اب کروں؟“

”جابل لڑکی! میں اس لیے وجہ پوچھ رہا تھا کہ اگر کوئی چھوٹی موٹی گڑبڑ ہے یا کرنٹ کی تار اتار ہے تو میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ کیسے نقص دور ہوگا۔“ اس نے وضاحت کی۔

”چھا میں بونٹ کھولتی ہوں، تم بتاؤ۔ کیا چیک کروں۔ کرنٹ کی تار کہاں ہوتی ہے۔“ وہ بوز کھول کے موبائل کان سے لگا کے کھڑ پٹر کرنے لگی۔ شہر ز کچھ ہدایات دے رہا تھا مگر وہ سیدھی سید اس کے سر سے گزر رہی تھیں۔

”افو! میں خود ہی پہنچتا ہوں، تم سے نہیں کچھ ہوگا۔ بیس منٹ لگ جائیں گے۔“ تنگ آ کر شہر نے کہا۔

”دیر ہو جائے گی شہر ز۔۔۔ تم جانے کب پہنچو گے، میں پہلے ہی لیٹ ہو رہی ہوں۔ میں ٹیکس کر لوں؟“

”ہرگز نہیں، جب میں آ رہا ہوں تو رسک لینے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ فوراً بولا۔
”رسک کی کیا بات ہے، جانے لٹی لڑکیاں روزانہ ٹیکسی پہ ایکی سفر کرتی ہیں آخر میں گاڑی کے بھی تو ایکی ہی آتی جاتی ہوں۔“

”لڑکیاں بے شک کرتی ہوں گی، مگر تمہارا یہ نیا تجربہ ہوگا۔“ وہ فون رکھ چکا تھا۔
”لو، یہ خواہوا میں میرا ”گاڈ فادر“ بنا رہتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے تپتی دیر ہو جائے گی مجھے۔ ادھر وہ شاہ صاحب میری جان کو رو رہے۔“ وہ بڑبڑاتی۔ وہ تھوڑی دیر میں اپنی سرخ آلتو اسے ڈھونڈتا ہوا آن پہنچا۔

”ادرمیری اس گاڑی کا کیا ہوگا؟“ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔
”تمہیں کلائنٹ کے گھر ڈراپ کر کے واپس آکر اسے کسی مکینک کو دکھاتا ہوں، اگر نقص مہر ہوا تو اسے تمہارا بے باس لے آؤں گا نہیں تو فون پر انفارم کر دوں گا۔“

”ٹھیک ہے، اگر درکشاپ پہ لے جانی پڑی تو تم مجھے اپنی گاڑی میں پک کر لینا۔ آفس جا کر پافون کر کے ان کا آفس ڈراپور منگوا لوں گی۔“
وہ سفیان شاہ کے جنگلہ کے آگے اترتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”اوکے مگر اپنا حلیہ تو درست کرلو۔ سارے بال بھر گئے ہیں۔۔۔ یہ لو۔“ اس نے جھک کر ڈا بورڈ سے برش نکالا جس کے پینڈل پہ شیشہ لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنا حلیہ ملاحظہ کیا۔ گھنگھریالے بالوں چھوٹی بڑی لٹیں پیشانی اور گردن کے ارد گرد ناگن بن کر لپٹی ہوئی تھیں۔ سیاہ بے حد چمکدار خوب صورت آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی لکیر انہیں مزید واضح اور روشن کر رہی تھی۔

بال درست کر کے از سر نو پنوں میں جکڑنے کے بعد اس نے سر اٹھا کر دیکھا شہر ز اس کی طرف بچہ تھا۔ اس کے دیکھنے پر نظروں کا زاویہ بدل کر گاڑی اشارٹ کرنے لگا۔
”اللہ حافظ۔۔۔“ وہ گاڑی آگے بڑھالے گیا۔

”آئی ایم سوسوری، سفیان شاہ صاحب! آپ کو اتنی دیر تک انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ دراصل ری گاڑی۔۔۔“
وہ جاتے ہی شروع ہو گئی تھی۔

”وجہ کوئی بھی رہی ہو س ارسل! اس اوکے پلیز۔ یہو اے سیٹ!“ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ لہجہ رسائیت اور نرمی لیے ہوئے تھا۔
وہ بے ساختہ شرمندہ سی ہو کر بیٹھ گئی۔

”یہ کیجیے۔۔۔“ ارسل نے فائل ان کی طرف بڑھائی۔
”اس میں فرینک اور ڈیکوریشن کا اسٹائل، کلر اسکیم اور ان پر آنے والی لاگت کی ڈی ٹیل ہے۔۔۔“ براؤن شلوار قمیص میں ملبوس سفیان شاہ نے بغور فائل کا جائزہ لیا، ان کے چہرے پر سنجیدگی اور ایک عجیب سا ستا ٹاٹم تھا۔

”ٹھیک ہے، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ ظاہر ہے آپ پر فیشنل ہیں۔ اماں! ابھی تک چائے نہیں آئی۔۔۔“ فائل بند کر کے انہوں نے کچن میں مصروف عمل اماں کو آواز لگائی تھی۔
”آگئی، السلام علیکم نبی!“ اماں چائے کے لوازمات سے سچی ٹرائی لیے اندر آ گئی تھیں۔
دو چار پر فیشنل باتوں کے بعد وہ معذرت کر کے اٹھ گئے تھے۔ ان کی گاڑی گیٹ سے نکلتے ہی نون بجے اس کے پاس آ گئے۔

”تھیک گاڈ۔۔۔ ابھی ابھی ہمارے میوٹر گئے ہیں۔ آپ بتائیے مس! آپ کیسی ہیں؟“
”بالکل ٹھیک! ذرا مجھے اپنا کمر اتو دکھائیے گا۔“ وہ ان کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے ضروری قسم کی پائنش بھی لے رہی تھی۔

اگلے دن وہ شہر ز کے ساتھ مارکیٹ گئی۔ سفیان شاہ کی طرف سے چیک مل چکا تھا۔ شام کو منتخب سامان لوڈ کر کے ان کی کوشی میں پہنچا دیا گیا۔
وہ اور شہر ز در کرز کی مدد سے سامان سیٹ کراتے رہے۔

گوکہ یہ شہر ز کا پراجیکٹ نہیں تھا لیکن وہ ہر پراجیکٹ میں اس کی مدد کرتا تھا۔
دونوں وہاں سے آؤں آ گئے اور کچھ ضروری حساب کتاب کرنے لگے۔ اسے یہ بل میڈم آصفہ کو بھی دیئے تھے۔

”ڈارک گرین لیڈر کے صوفے، ڈارک گرین کارپٹ اور سلور پیجز پر مشتمل ڈارک گرین پلوے۔ دوسرا صوفہ سیٹ سلور اور گرین سلک کے کورز والا ہے اور ڈیکوریشن کے لیے گرین کرشل کے خوب صورت گلدان اور کچھ روایتی کچلرل قسم کے ڈیکوریشن پیسز مثلاً دیواروں پر رگ (rug) لٹکانا اور شاندار قسم کی پورٹریٹ، اب رہ گیا بچوں کا کمر اور شاہ صاحب کا کمر۔ اپر پورشن وہ لوگ بعد میں کرائیں

”اچھا، یہ کارڈ رکھو، نیا سال شروع ہونے والا ہے۔ دس تو میں تمہیں بارہ بجے کے بعد ہی کروں گا، ال کارڈ حاضر ہے۔“

”ہائی گاڈ شہر دز! تم عید، بقرعید ہر تہوار پر، ہر موقع پر مجھے دس کرنا اور کارڈ بھیجنا نہیں بھولتے۔ میری جگہ اینڈ شیئرنگ قسم کے دوست ہو۔“ ارسلہ کو بے ساختہ سی خوش ہوئی تھی۔ وہ کارڈ کا بغور جائزہ لیتی تھی۔ بہت خوب صورت سا منظر تھا، شام کا سورج ڈوبنے کا۔ کارڈ پر لکھا تھا۔

”جب بھی مدد کی ضرورت ہو، آنکھیں بند کر کے پکار لینا۔“ وہ کارڈ پڑھ رہی تھی اور محظوظ ہو رہی تھی۔

☆☆☆

گھر میں زور و شور سے روشناس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ظاہر ہے زیادہ ”کھپ“ ارسلہ لیے ہی تھی کہ وہی باہر کے کام سنبھال رہی تھی۔ پاپا بھی سرگرم عمل تھے لیکن بہت بجھے بجھے انداز۔ ممانی اب بڑے حق سے یہاں آیا کرتی تھیں اور باتوں باتوں میں اپنی فرمائشیں اور چیزوں کے لیے میں اپنی پسند، ناپسند بتا دیا کرتی تھیں۔

ارسلہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔

تایا سجاد کی فیملی کو اس اچانک اور انہونے قسم کے فیصلے پر خاصا اچنبھا ہوا تھا۔ نیناں جانتے بوجھتے بے بھی خاموش رہی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ یہ تیل منڈھے چڑھا جائے گی۔

بہر حال وہ ہر حال میں خوش اور مطمئن رہنے والی، بے فکری لڑکی تھی۔ اس نے اپنی ساری توجہ کی کوکھر پورا اور ہنگامہ خیز بنانے میں لگا دی تھی۔

شادی سے ایک ہفتہ پہلے اسے پاپاؤں بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ واقعہ شادی سے ٹھیک تین دن قبل ہوا۔

”میں فرنیچر لوڈ کروانے جا رہی ہوں پاپا کے ساتھ تمہیں تھریڈنگ اور فیشل کے لیے پارلر کس ٹائم ہے۔“ ارسلہ نے ڈراپ کرنے کی غرض سے پوچھا تھا۔

”وہ شام کو جانا ہے، آپ لوگ جائیں۔“

اس دن روشناس ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خاموش، الجھی ہوئی بلکہ فکر مند سی دکھائی دی تھی۔ ارسلہ واپس آ کر اس سے پوچھنے کا سوچتی ہوئی چلی گئی مگر واپس آئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ جس سے پوچھنا تھا، وہ گھر سے غائب تھی۔

ارسلہ تایا جان کے ہاں غلبت میں آئی تھی۔ وہاں بھی نہیں ملی۔ آس پاس اپارٹمنٹ میں بہانے لکھ کے دیکھا مگر کہاں۔ پارلر فون کیا۔ ادھر سے جواب آیا۔ ”ہم تو خود انتظار کر رہے ہیں۔“

یا خدا کہاں چلی گئی۔ زمین نکل گئی یا آسمان کھا گیا۔

میجر ضیاء کے چہرے پر ہوا سیاں اڑ رہی تھیں۔ ہاتھوں پیروں سے جان لگی جا رہی تھی۔

”پاپا۔۔۔ پاپا! پلیز، آپ ریلیکس رہیں۔ میں اسے ڈھونڈ لاتی ہوں۔ یہیں کہیں ہوگی، شہر کے کاشاپنگ سینٹر میں۔ اپنی مرضی کی کوئی چیز خریدنا ہوگی اور اس نے کہاں جانا ہے۔ پرسوں اس کی شادی

گے۔“

”ان کی سز تک آ رہی ہیں؟“ شہر دز یونہی پوچھ بیٹھا۔

”بچے کہہ رہے تھے، وہ کینیڈا میں ہیں اپنی کسی دوست کے پاس، وہ دو تین ماہ میں آئیں گی۔“

”کیا وہاں جاب کرتی ہیں یا ان کے والدین رہتے ہیں؟“

”نہ جاب کرتی ہیں، نہ میکہ ہے وہاں۔ بس کسی وجہ سے ایک ہفتہ پاکستان رہ کر وہ واپس چلی گئی ہیں۔“

”یہ کیا چکر ہے؟“ شہر دز تعجب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”بچے تو یہی کہتے ہیں کہ ماما کی کام سے وہاں رکی ہیں۔ آخر کون سا کام ہو سکتا ہے۔ کوئی کر وغیرہ کر رہی ہوتیں تو کم از کم بچوں کو تو خبر ہوتی۔ پس پردہ ہے کچھ۔ خود شاہ صاحب بھی اس موضوع کتراتے ہیں۔“ وہ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔

”بس۔“ شہر دز نے ہاتھ اٹھا دیا۔ ”ہمارے پاس اپنے مسائل کم ہیں بات کرنے کے لیے جو اُدھر کی پریشانیاں سمیٹ رہے ہیں۔ تم سناؤ، تمہارے پاپا کی طبیعت کچھ کسبجلی؟“

”ان کی طبیعت تو ہمیشہ کے لیے خراب ہو گئی ہے۔“ ارسلہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”روشناس کی پر اس کا رشتہ ارمنغان سے طے تو کر دیا ہے مگر وہ خوش ہرگز نہیں ہیں۔“

”ارمنغان کر تا کیا ہے؟“ شہر دز کو اول روز سے سارے قصے کی خبر تھی۔ ارسلہ اس سے اپنی بات نہیں چھپاتی تھی۔

”گزشتہ تین سال سے ایم بی اے کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔“

”ہو سکتا ہے اس بار کرنی گزرے۔ ایم بی اے پاس کرنے کے بعد اسے بہتر نوکری حاصل کر کے مواقع مل جائیں گے۔ صورت حال اتنی بھی مایوس کن اور بری نہیں ہے کہ تم اور انکل یوں جی بیٹھیں۔ ہمیں اچھائی کی توقع کرتے رہنا چاہیے۔ اس سے انسان کو ٹھکن نہیں ہوتی، وہ تازہ دم ہے۔ یہ بتاؤ، شادی کے کب ارادے ہیں۔“ چائے آچکی تھی۔ شہر دز اس کی چائے اس کے سامنے ہوئے پوچھنے لگا۔

”ناموس، ممانی کا تو بس نہیں چلتا، آج ہی بیاہ کے لے جائیں۔ رکاوٹ پاپا کی طرف سے۔ وہ مجھے اور اس کو اکٹھا بیٹھا چاہتے ہیں۔“ شہر دز بے وجہ کا غصہ پر پین سے لائیں کھینچنے لگا۔ اس کا سر جھکا تھا اور ساری توجہ کاغذ پر تھی۔

”پھر کیا طے ہوا؟“ اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔

”ابھی تو کچھ بھی نہیں۔ تایا جان کی طرف سے فی الحال کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی اور خود میں ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔ میری کوشش یہ ہے کہ میں پہلے روشناس کی شادی کروں، مبادا اس کے ذہن میں خیال آئے کہ میری وجہ سے اس کی خوشیاں اس سے دور کھڑی ہیں۔“

”بالکل۔“ وہ قدرے ریلیکس نظر آیا۔ ”ضروری تو نہیں ہے بڑی کی پہلے ہو اور چھوٹی کی اس بعد۔“ وہ اپنی میز کی دروازہ کھول رہا تھا۔

ہے اور اس کی پسند سے ہو رہی ہے۔ اس موقعے کا وہ شدت سے انتظار کر رہی تھی پھر اسے راہ کیوں جانے دے گی۔ اسے بھی موقع کی نزاکت کا پورا پورا احساس ہوگا۔“
وہ خود بھی از حد پریشان تھی لیکن باپ کا مرجھایا ہوا خوف زدہ چہرہ دیکھنے کی تاب نہیں ہو رہی وہ خود کو زبردستی مطمئن دکھانا چاہتی تھی۔

”عزت صدیوں کی محنت اور جدوجہد کے بعد خاندان کے سرپرستار بن کر سجا کرتی ہے نیا رات کے ساڑھے گیارہ ہو گئے تو تایا سجاد نے سخت لہجے میں ضیاء صاحب کو مخاطب کیا تھا۔
”میں جانتا ہوں بھائی صاحب!“ وہ بے بسی کی انتہائی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ آنکھیں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ ارسلہ نے اپنے آفس فون کر کے شہر وز کو پک کیا اور اب دونوں ہاں چھانتے پھر رہے تھے۔“
پوری رات گزر گئی۔
بڑی قیامت کی رات تھی۔

ماموں، ممانی اور ارمدان کو اس بات کی اطلاع پہنچ گئی تھی کہ کل سے لڑکی غائب ہے۔
”یہ سب آپ لوگوں کی سازش ہے۔ جان بوجھ کر اسے چھپایا ہے۔“ ارمدان نے چیخا شروع دیا تھا۔ وہ بہت جارحانہ موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔ آتے ہی اس نے بے وجہ چیزیں پختا شروع کر دیں۔ ضیاء صاحب صبر کے گھونٹ پی کر اس کی کن ترانیوں کے جواب میں خاموش بیٹھے رہے۔ ا بے بسی قابل دید تھی۔
”آپ لوگوں نے مجھے ذلیل کرنے، میرے خاندان کا نام بدنام کرنے اور بہانے سے چھڑانے کے لیے لڑکی کو کہیں بھجوا دیا ہے۔“
وہ شعلہ باز نظروں سے ضیاء صاحب کو گھورنے لگا۔

”ہوش تو ٹھکانے ہیں ماماں صاحب زادے!“ ضیاء صاحب چپ رہے مگر ان کی جگہ سجاد بول پڑے تھے۔ ان کی ساری فیملی ضیاء صاحب کے گھر پر جمع تھی۔ تانی جان، نیناں، تایا، سب از ضیاء صاحب کی تسلی و تسفی کر رہے تھے اور ان کے غم میں برابر کے شریک تھے۔ رومی تو دو دن صوبائی سطح پر کھیلے جانے والے کالج کے کسی میچ کے سلسلے میں لاہور گیا ہوا تھا، البتہ اسد موجود تھا مگر چہرہ، لہجہ اور انداز کسی قسم کی ہمدردی اور اپنائیت سے مبرا تھا۔

”یہ سب آپ کا تصور ہے چچا جان! بیٹیوں کو بے لگام اور بے مہار کھلا چھوڑنے کا نتیجہ دیکھ لے۔ کسی کام نہ آئی آپ کی یہ ”لیبرل“ سوچ۔ بہت مان اور غرور تھا نا آپ کو اپنی بیٹیوں پر۔“ اسد کا لحاظ رکھے بغیر کہا۔

ادھر ارمدان نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔
”مجھے ہر قیمت پر روشن چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت۔“ وہ روشن کے کمرے کے دروازے پر جا کر کھڑا ہوا۔ گویا اسے اچانک کہیں سے برآمد کر لے گا۔
”ہم نے تو اپنی مری ہوئی بہن کے پیٹھ پیچھے رشتہ جوڑا تھا۔ کیا خبر تھی اندر ہی اندر اور

کھلائے جارہے ہوں گے۔“ رضوان نے مونچھوں کو تان دیتے ہوئے تبصرہ کیا۔
”شرم کریں آپ! غائب ہونے والی لڑکی آپ کی بھی کچھ لگتی ہے۔ کم از کم سگی بھانجی کا رشتہ تو ہے نا۔ اسی کا خیال کر لیجیے۔“ ارسلہ رہ نہیں سکی تھی۔

سارا دن کی خواری کے بعد وہ یوں بھی بہت غمگین تھا۔
”تایا جی! کسی طرح ان لوگوں کو تو نکالیں یہاں سے۔ یہ تو بولے ہی چلے جائیں گے۔ مجھے ڈر ہے پاپا کا نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے ان کی حرکتوں سے۔“ ارسلہ نے موقع پا کر تایا سجاد سے بات کی تھی۔ تایا جی نے طریقے سے انہیں ٹالا۔
”اب وہ آ بھی گئی تو کیا حاصل۔ رات تو پوری گزر گئی۔ اعتبار تو بس ایک ہی بار کا ہوتا ہے، اب آئے بھی تو اسے سنبھال کے اپنے پاس ہی رکھیے گا، ہماری پہلے ہی بہت بدنامی ہو چکی ہے اب کس منہ سے لوگوں سے کہتے پھریں گے کہ جو شادی کا رڈ آپ کو دیا گیا تھا، اس کو کنسل سمجھ لیجیے۔“ ممانی اور ماموں بہت جل جل کر تبصرہ کر رہے تھے۔ ”دہن صاحبہ گھر سے غائب ہیں۔“
وہ لوگ گھر چلے گئے، دو گھنٹے بعد ان کا فون آیا۔

”ہم نے جن لوگوں کو کارڈ دیے تھے، ان سے معذرت کر دی ہے کہ کسی وجہ سے فی الحال یہ شادی ملتوی کر رہے ہیں۔“
”اوہ۔۔۔“ ضیاء صاحب کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ جو ایک امید تھی کہ کہیں سے معجزہ ظہور پذیر ہو جائے گا اور وہ اس ذلت سے بچ جائیں گے، وہ خاک میں مل گئی۔
انہیں بھی ہول میں ہال کی بنگ کیسٹل کرا تا پڑی جو کہ بڑی مشکل سے ملتی تھی۔
دوپہر کو ارمدان نے پھر چکر لگایا۔ اب کے اس کارڈ عمل بہت سنجیدہ تھا۔
”کچھ پتا چلا؟“

”نہیں۔“ ارسلہ کا چہرہ مایوسی و پریشانی کا اشتہار بنا ہوا تھا۔
”گھر والے کچھ بھی کہیں پھو پھا جان! روشن مل جائے تو میں آج بھی اس سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔“
میمر ضیاء کے چہرے پر ہلکی سی کرن نمودار ہوئی۔ پہلی بار انہیں اس لڑکے کے خلوص پر یقین آیا تھا۔ وہ کتنا اعلا ظرف تھا۔

”لیکن تمہارے والدین۔۔۔“
”انہیں میں منالوں گا، کسی نہ کسی طرح راضی کر لوں گا۔ ایک بار وہ ملے تو سہی۔“ وہ ہاتھ مل رہا تھا۔

”میں دنیا کی باتیں سن لوں گا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہیں کہیں گے تاکہ بھاگی ہوئی لڑکی سے شادی کی ہے۔ جانے کہاں کہاں سے اور کن کن مراحل سے گزر کر واپس گھر پہنچی ہے لیکن کوئی بات نہیں، وہ میری عزت ہے اور میں ہر قیمت پر اسے اپناؤں گا۔ پتا نہیں اس جیسی سمجھ دار لڑکی نے اتنی نادانی کیوں کی۔“

ہیں صرف اپنا بندہ بنا کر رکھے۔ حاجت روائی کے لیے وہ ایک در ہے نا، جہاں ہر کسی کی سنی جاتی ہے، ہم جیسے گنہگاروں کی بھی۔“ ضیاء صاحب کا لہجہ بھیگ گیا۔

ارمغان کو راستے میں ڈراپ کر کے دونوں باپ بیٹی گھر آ رہے تھے کہ ارسال کے موبائل کی بیل بجی۔

”میں نے ریسکیو ون فائیو پر اطلاع دی ہے۔“

”ارے، پولیس تک بات نہیں پہنچانی تھی۔“ ارسال تو بوکھلا اٹھی۔

”بے فکر رہو، کوئی تحریری ریکارڈ نہیں ہوگا اس قصے کا۔ وہاں ایک انسپکٹر میرا واقف کار ہے۔ میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ یہ ایک رسل معاملہ ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟“

”پاپا کے ساتھ کہیں نکلی ہوئی ہوں، گھر پہنچ کر تمہیں کال کروں گی۔“ اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

”کون تھا؟“

”پاپا! شہر وز تھا۔ اس کا کوئی گہرا دوست پولیس میں ہے اور اس نے یقین دلایا ہے کہ پولیس کے ریکارڈ پر آپ کا یا میرا کوئی حوالہ نہیں ہوگا۔ وہ اپنے طور پر لڑکی کی تلاش جاری رکھیں گے اور سراغ ملتے ہی اطلاع دیں گے۔“

”پولیس۔۔۔؟“ میجر ضیاء کا سانس رکنے لگا۔ ”یہ تو میں بھی کر سکتا تھا مگر میں تھانے کچہری کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا۔“

”آپ بے فکر رہے پاپا! یوں سمجھ لیجیے۔ گھر کی بات ہے۔ اگر انہوں نے بازیاب کرا لی تو کبھی بھول کر بھی کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ پولیس گھر نہیں آئے گی وہ صرف شہر وز سے رابطے میں رہے گی۔ کچھ بھی آن ریکارڈ نہیں ہوگا۔“ ارسال نے تسلی دی۔

”میری محبت اس قابل تو نہیں تھی روشن بیٹے! کہ تم اتنی بری طرح جوتا مارتیں۔“ ایک آنسو بند آنکھوں سے لڑھک کر گال پر سفر کرتا ہوا ٹھوڑی کے پاس آ کر گرم ہو گیا تھا۔

گاڑی چلائی ارسال نے ایک نظر باپ پر ڈالی۔ اسے گہرا شاک لگا۔ دل سے شعلے سے اٹھنے لگے۔

”بائے روشن، یہ کیا قیامت ڈھائی ہے تم نے۔“

فولادی اعصاب کے مالک، اس پیار لٹانے والے وسیع القلب انسان کو کس بے وردی سے کانٹوں پر گھسیٹ ڈالا ہے۔

شہر وز کل سے اب تک مسلسل اس سے رابطے میں رہا تھا۔

کل تو وہ اس کے ساتھ پورے اسلام آباد، پٹری میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ آج پولیس سے خفیہ مدد لے رہا تھا۔ شام ہوگئی، کل مہندی تھی اور پرسوں رخصتی۔

ارسال نے مہندی کے لیے گھر کا لاؤنج کتنا شاندار قسم کا تیار کرایا تھا۔ یہ بہت بڑا ہال نما ایریا تھا جنہاں سے فرنیچر ہٹا کر لڑکیوں کے بیٹھنے کا بڑا اچھا انتظام کروایا گیا تھا۔ ایک سائیڈ پر رائج بنایا گیا تھا۔ دو لڑائی قدیم کرسیوں کو مصنوعی پھولوں اور آرائشی لڑیوں سے بے حد خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔

”سارے ہسپتال، سارے ادارے، ہر سڑک کھنگال ماری ہے۔ جانے کہاں چلی گئی وہ۔“ ضیاء صاحب کی آواز میں گہری اذیت تھی۔

”ایک حل ہے میرے پاس، ادھر پنڈی میں ڈبل روڈ پر کوئی بزرگ رہتے ہیں۔ سنا ہے، وہ لوگوں کے مسائل اور پریشانیوں کا فوری حل بتاتے ہیں اور اس پریشانی کی بنیادی وجہ بھی بیان کرتے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو ان کے پاس چلتے ہیں، شاید وہ ہماری مدد کر سکیں۔“

”میں ان ذریعوں پر یقین نہیں کرتا لیکن چلو، چل کے دیکھ لیتے ہیں۔“ ضیاء صاحب اس پیرز فیکری کے بہت خلاف رہے تھے مگر اس وقت بیٹی کے گھر سے غائب ہونے کا دکھ اس درجہ حادی تھا کہ سب فراموش کر بیٹھے تھے۔

ارسال نے روتے ہوئے دل سے ان کی طرف دیکھا۔

اس کے اتنے پر وقار، اتنے بارعب پاپا اس وقت لاچاری و بے بسی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ از کی ذہنی حالت بہت ردی ہو رہی تھی۔

ارسال ہی ڈرائیو کر رہی تھی، وہ جھکے کندھوں، ستے ہوئے چہرے اور بے خواب اذیت بھری آنکھوں سمیت اگلی سیٹ پر بیٹھے جانے کس آس پر بے تابی سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ ارمغان پچھلا سیٹ پر بیٹھا تھا۔

عجیب و غریب، تاریک بل کھاتی گھٹیاں عبور کر کے وہ عجیب سے بوسیدہ قسم کے مکان میں پہنچے تھے۔

یہاں پہنچ کر مزید گھٹن اور اذیت کا احساس بڑھ گیا۔ پچاس روپے فیس دے کر وہ لوگ لمبی قتا میں لگ کے انتظار کرنے لگے جو شاید گھنٹوں تک محیط تھا۔

”لو اگر یہ بزرگ کوئی کرشمہ ساز ہوتے تو خود اپنی حالت نہ سنوار لی ہوتی۔ اس پرانی دھرائی گھڑ زدہ جگہ پر ہاش پذیر ہونے کے بجائے کسی اچھی جگہ پر نہ ہوتے۔ انسان کے پاس کچھ ہو تو سب پہلے وہ اپنی ذات پر لگاتا ہے، اپنے لیے خرچ کرتا ہے پھر خدمتِ خلق کی طرف آتا ہے۔“ ڈیڑھ گھنٹے بعد باری آئی۔

بزرگ عربی زبان میں لکھے ہوئے کچھ تعویذ دے کر استعمال کا طریقہ سمجھانے لگے۔ مزید توڑ۔

لیے کل تشریف لانے اور پانچ سو روپے کا ایک عمل کرانے کی تاکید کی۔

”ان لوگوں کے چکروں میں نہیں آنا چاہیے پاپا! اپنی جگہ خدا بن کے بیٹھے ہوتے ہیں۔ دیکھا کیسے رعونت سے بات کر رہے تھے اور مسئلہ پورا سنا بھی نہیں تھا کہ ٹوک دیا۔ جیسے فافٹ بھٹتا رہے ہوا اور یہ کم فیس بھی وراصل دھوکا ہے۔ پچاس روپے غریب بھی با آسانی دے سکتے ہیں۔ پہلے یہ انہیں۔

چنگل میں پھنساتے ہیں پھر جو پیسے والا ہوا ہے آنے بہانے سے نچوڑنے لگتے ہیں اور جو غریب، اسے سو پچاس میں نال دیتے ہیں، ان جگہوں پر تو بھی نہیں آنا چاہیے۔“

ارسال نے باہر آ کر پاپا سے کہا۔

”میں کون سا خوشی سے آیا تھا بیٹی! بس پریشان دل ہی تو بھٹکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف کرے۔“

جاسکے۔ ریسک و نفاذ والے اپنا کام کر رہے ہیں۔ اچھا اب کام کی بات سنو، میں نے کل مختلف دن میں اپنا نمبر لکھوایا تھا نا۔“ احتیاط و عزت کے پیش نظر ضیاء صاحب کا نمبر نہیں لکھوایا گیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہاں سے کوئی رسپانس آیا؟“ وہ بے صبر ہو گئی۔
”ادارہ فیض الاسلام کی ایک شاخ ہے دارالامان۔ کھنہ پل کے پاس۔ انہیں کل ایک بائیس سالہ بلی ہے۔ وہ سر کی چوٹ کی وجہ سے بے ہوش ہے۔ اس نے نیلے رنگ کے کپڑے پہن رکھے۔ گورارنگ ہے اور براؤن کھنکھریا لے بال ہیں۔ گلے میں ایک چین بھی ہے۔“ وہ مزید بھی کچھ بتا رہا ارسلہ سے رہا نہ گیا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہ ہی حلیہ ہے۔ یقیناً روشناس ہی ہوگی۔ تم مجھے وہاں لے چلو، میں گاڑی لٹی ہوں۔ تمہیں آفس سے پک کر لوں گی۔ اپنی آٹو وہیں چھوڑ دینا۔“ وہ بے قرار ہو گئی۔
”ایک منٹ۔ میں آفس میں نہیں ہوں، اپنے گھر پر ہوں۔ آئی ایٹ فور کے فلیٹ نمبر بارہ بلاک بی تم کہو تو میں تمہیں تمہارے گھر سے پک کر لیتا ہوں۔“

”نہیں، شاید یہ مناسب نہ لگے۔ پایا تو تمہارے بارے میں اچھی طرح آگاہ ہیں کہ میں باہر کے رج کے معاملات ان سے شہر کر رہی ہوں مگر شاید اسد کو یہ اچھا نہ لگے۔ میں خود آ رہی ہوں۔“ وہ اڑتی ہوئی مطلوبہ جگہ پہنچی تھی مگر اس لڑکی کو دیکھ کر اس کی امیدوں پر افسوس پڑ گئی۔

”یہ روشناس نہیں ہے۔“ وہ ٹوٹے ہوئے قدموں سے واپس آئی تھی۔ شہر و زکو واپس ڈراپ کر کے آئی تو اس کے قدم دبلیں پر ہی جم گئے۔

اڑی ہوئی رنگت، بھرے براؤن بالوں اور ہلکے کپڑوں میں ملیں بے اوسان سی مہربان آنسو اور روشناساں! آؤج میں بیٹھی تھی۔ تائی اماں اور نیناں اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھیں۔ تاجا جان کسی کی پشت پکڑے کھڑے تھے۔ اسد نیبل کا کنارہ تھا مے بری طرح روشناس کو گھور رہا تھا اور نے کے سے انداز میں۔۔۔ صوفے پر بیٹھے تھے۔

”یہ کیا طریقہ تھا پریشان کرنے کا بیٹی!“ تائی اماں اس کے بال سنوارتے ہوئے خفگی سے پوچھنے لگی۔

”مم۔۔۔ مجھے کسی نے اغوا کر لیا تھا۔“ وہ سر جھکائے آنسو بہاتی ہچکیوں میں بتا رہی تھی۔ ”میں جانے کے لیے نکلی تھی کہ مین روڈ پر ایک گاڑی رکی، دوسرے ہی لمحے وہ مجھے رومال سنگھا کر بے ہوش کھٹالے گئے۔“

”کہاں لے کر گئے تھے تمہیں۔“ ارسلہ نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
”پتا نہیں پایا! وہ ایک بند کمر تھا، کل شام سے آج شام تک وہیں بند رکھا پھر جانے کیا سوچ کر چھوڑ دیا مگر لے جانے سے پہلے آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ گھر کے پاس آ کر پٹی کھولی ہے۔ آئی نیناں! انہوں نے مجھے ”بسی“ قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔“

میں تو یقین کر لوں گا بیٹا کہ میری مجبوری ہے۔ میں ایک باپ ہوں مگر تم ان لوگوں کو کیسے یقین دلاؤں جن کے ساتھ عمر گزار رہی ہے۔“ پایا دل گیر لہجے میں بولے۔

دیواروں پر بھی آرائش کی گئی تھی۔ بے شمار چمکتی لڑیاں، غبارے، چمکتی پتیوں سے بنے پھول ستار۔ جانے کیا کیا کچھ۔

روشان کے لیے مہندی کا سوٹ اس نے خود ڈیزائن کیا تھا۔ ہراگوٹا، دوپٹے کے پلوؤں پر موتی اور کاچ کی چوڑیوں کا انوکھا امتزاج۔

پاپا اس کی فرمائش پر تین دن پہلے سے ڈھونڈ لے آئے تھے۔ فریج بے شمار قسم کے اسٹیکس۔ ہوا تھا۔ روشناس، نیناں اور ارسلہ کی سہیلیاں آتیں، گانے گاتیں، کیک، مٹھائیوں اور سینڈوچز کے ڈرائی فروٹ اور نمکدود وغیرہ سے شغل فرماتیں اور رات کا کھانا کھا کے واپس جاتی تھیں۔

ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں اور اب کل سے جیسے موت کا سا سکوت طاری تھا۔ ارسلہ نے نیناں کو فون پر بٹھایا ہوا تھا۔ وہ سہیلیوں اور رشتہ دار لڑکیوں کے آنے والے فون کی آمد پر کسی ایمر جنسی کا بھانا کر کے انہیں مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔
”ارسلہ! ہم سارے رشتہ داروں اور میل ملاپ کے لوگوں میں بدنام ہو گئے ہیں۔ نہ نہ ہوئے بھی سب کو بتا چل گیا ہے۔“

تائی اماں فکر مندی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ ابھی ابھی نیناں کے ہمراہ آئی تھیں سجاد، پاپا کے کمرے میں جانے کوئی سی تجویز لے کر گئے تھے۔ سوائے اسد کے وہ پوری فیملی پریشانی میں برابر کی شریک تھی۔

”اب کیا ہو سکتا ہے تائی اماں! ایسا تو ہونا ہی تھا۔ کب تک چھپا سکتے ہیں ہم اس گمشدگی کا خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”ارے نیناں! یہ بڑے کیا ہاتھ ہیں ہی پکڑے رہوگی۔ رکھو ادھر میز پر اور اپنے چچا اور ارے لیے کھانا نکالو۔ کل سے کچھ نہیں کھایا پیا۔“ انہوں نے لوازمات سے کچی بڑے ہاتھ میں تھامے؛ شہو کا ہاتھ تھا۔

فون کی بیل پھر بجی تھی۔ نیناں نے ارسلہ کے اشارے پر بڑے رکھ کر کونے میں جا کر فون اس کے پاس آگئی۔

”آپ کے آفس سے فون ہے ارسلہ!“
”جی۔“ وہ مارے باندھے فون تک آئی۔

”ارسلہ! میں ہوں شہروز۔“ وہ رساں سے گویا ہوا۔ ”کیسی طبیعت ہے انکل کی اور تمہارا کھایا پیا بھی ہے یا نہیں۔“ وہ ہمیشہ کی طرح اس کے لیے فکر مند تھا۔

”ابھی تائی اماں کھانا لائی ہیں، نیناں نکال رہی ہے، کچھ نہ کچھ لے ہی لوں گی۔“ وہ بے دہ بولی۔

”اوہو، سرال والوں کی جانب سے خدمتیں ہو رہی ہیں، بہت خوب۔“
”اس وقت تو کوئی بات بھی خوش نہیں کر رہی شہروز۔“ وہ ٹوٹ سی گئی۔
”اونہوں، ہمت نہیں ہارتے۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو۔ دنیا کی کوئی ایسی پریشانی نہیں ہے جس

”وہ بھی یقین کر لیں گے۔ ارمغان انہیں سمجھالے گا۔“

”مگر ارمغان کو کون سمجھائے گا۔“ ارسلا افسردگی سے اس کے پاس بیٹھ گئی اور کرتھتھیا کی اپنے باپ کے حوصلے پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ کوئی روایتی باپ ہوتا تو بنا صورت حال جانے بیٹا الزام ٹھہرا کر برا بھلا کہتا۔

ارمغان اور اس کی فیملی کو اطلاع دی گئی۔ پایا خود گئے تھے۔

ارمغان تو ابھی بھی اسے اپنانے کو تیار تھا مگر ماموں ممانی بہت شور کر رہے تھے۔

”ہم کیسے سارے جہان کی کالک اپنے منہ پر مل لیں۔ ساری دنیا کو خبر ہے۔ سب ہم پر تہ رہے ہیں۔ دودن باہر گزار کے آئی ہے۔ ہم کس سے ”سرنٹیکٹ“ لیں پاکیزگی کا۔ کیا خبر کیا کچھ اس پر۔“

اب یہ حال تھا کہ پایا مغلوب تھے اور وہ غالب۔ پایا جانتے تھے، اگر ان لوگوں نے نہ روشاں ساری عمر یونہی گھر بیٹھی رہ جائے گی۔ ایک دنیا جان گئی تھی۔ گھر گھر رسوا کی داستان بچ تھی۔ کون تھا جو آنکھوں دیکھی کبھی ٹھکتا۔

انہوں نے تاپا جان کو بیچ میں ڈالا۔ دو تین دن تک وہ ماموں ممانی کے گھر کے چکر لگاتے رہ تاپا جی نے مقدور بھر کوشش کی معاملہ سلجھانے کی۔ بالآخر بہت سی تاویلوں، وعدوں اور فرمائشوں۔ بادل ناخواستہ وہ اس ”رسوائی“ کو بیانے اور گھر لانے پر مجبور ہو گئے۔

”آپ کا کیا جائے گا، آپ تو گھر سے رخصت کر کے ہمارے متھے ماریں گے۔ بھگتنا تو پڑے گا ساری عمر۔ بھگنا ہوئی لڑکی کو گھر میں بسنا کسی کسی کا ہی جگر ہوا کرتا ہے۔ یہ ہمارا ہی ظرف جو رشتے کا لحاظ کر کے آپ کی بیٹی کو قبول کر رہے ہیں، کوئی غیر ہوتا تو۔۔۔ اور آپ نے تو ہمیں سے ہی کمتر اور حقیر جانا۔ ہم سے رشتہ داری نبھانا اپنی توہین سمجھا تھا۔ آپ دیکھ لیں، کون کام آیا۔ صورت حال میں۔“ واقعی پایا قائل سے ہو گئے۔ (گھٹا تو پہلے ہی تھے)

”اب ارمغان کے مستقبل کے لیے کچھ کریں۔ آپ کی بیٹی تو ہم نے بنادی۔“ ماموں بات کر رہے تھے۔

”اے کہیں سیٹ کرادیں اور پانچ دس مرلے کا پلاٹ دلوا دیں۔ کل کلاں کو اپنا گھر بنانا۔ اسلام آباد، پنڈی میں کوئی پلاٹ تو ہوگا نا بلکہ ایسا کیوں نہیں کرتے، آپ کو حکومت کی طرف سے؟ میں دو اپارٹمنٹ ملے ہیں، ایک روشاں کو جھیر میں دے دیں۔ جھیر کا سامان وہیں سیٹ کرادیں۔ میں گاڑی مل جائے گی۔ یوں دونوں چکالہ سے ہمیں ملنے آرام سے آتے جاتے رہا کریں گے۔ پر جو آپ نے اپنے آفس کی ایک برائچ گھولی ہے، اس میں ارمغان کو جاب دلوا دیں۔“ ماموں نے دی

”ٹھیک ہے۔“ پایا نے خاموشی سے سارے مطالبات مان لیے۔ جن باپوں کو بیٹیوں کی ہارنا پڑے، وہ اسی طرح سرنگوں ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

”سجاد بھائی! میں چاہتا ہوں، اب ارسلا کو بھی رخصت کر دوں۔“ روشاں کی شادی کے صرف دو ہفتے بعد ضیاء صاحب از خود چل کر تاپا سجاد کے پاس گئے تھے۔

”تمہاری خواہش سر آنکھوں پر ضیاء! بلکہ یہ فرمائش تو اصولاً ہماری طرف سے ہونی چاہیے تھی مگر۔۔۔“ وہ چپ ہو گئے اور ضیاء صاحب کے دل کی دھڑکن رک گئی۔

”اسد قابو میں نہیں آ رہا دراصل۔۔۔“ سجاد صاحب نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ ”وہ پہلے بھی کافی معترض تھا مگر اب روشاں والے واقعے کے بعد۔“ اچھا ایسا کرد، ارسلا بیٹی کی جاب چھڑوا دو کچھ عرصے کے لیے۔ شاید اسد کو یقین آ جائے اور اس کے اعتراضات اور شکوک دور ہو جائیں۔“

☆☆☆

”ہمیں آپ کی سینگ بہت پسند آئی ہے مس۔ صرف دو ماہ کے عرصے میں آپ نے پورے گھر کا نقشہ بدل دیا ہے اور ہمارا کمر تو بہت ہی اچھا سمجایا ہے۔ لاؤنج، گیٹ روم، پایا کا بیڈ روم، فریڈوں کا اسٹڈی روم۔“

پنک ادنی جرسی نما شرٹ اور بلیک ٹراؤزر میں تانیہ مشرقی نقوش، مشرقی رکھ رکھاؤ، مغربی لباس اور مغربی لب و لہجے کے ساتھ بڑا دلچسپ تاثر دے رہی تھی۔

”اچھا۔“ ارسلا مسکرائی۔

”مجھے بھی بہت اچھا لگا آپ کے ہاں آنا۔ آپ کے میز، آپ کی پیاری پیاری باتیں، میں واقعی بہت مس کروں گی۔“

اسے سچ سچ یہ بچے بہت عزیز ہو گئے تھے۔ بڑی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

”مس! کیا آپ دوبارہ نہیں آئیں گی؟“ عالیہ پریشان نظروں سے دیکھنے لگی۔

”آپ کے فادر کا اسائن کیا ہوا پروجیکٹ کمپلٹ ہو گیا ہے، میرا کام ختم ہو گیا ہے، اب کیا کرنے آؤں گی۔“ وہ مسکرائی۔ بچوں کے چہرے پر مایوسی پھیلنے لگی۔

”ایسا کرو، میرا موبائل نمبر لکھ لو۔ جب جی چاہے بات کر لیا کرنا بلکہ میرا ایڈریس بھی لے لو۔ آپ لوگ کبھی چکر لگنا۔ یہ بتاؤ، آپ کی ماما کی واپسی کا کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں، پایا کہہ رہے تھے، وہ شاید مزید کچھ ماما تک نہ آسکیں۔“ جانے ارسلا کے دل میں کیا آئی، وہ بچوں کو نال کے کچن میں مصروف عمل اماں کے پاس آ گئی۔

”اماں! آج میرا آخری دن ہے، آج تو یہ معہ حل کر ہی دیں۔ بچوں کی ماں کہاں ہے، وہ صرف ایک ہفتہ پاکستان رہ کر کیوں واپس چلی گئیں۔ آخر وہ کیا راز ہے جو بچوں سے چھپایا جا رہا ہے؟ یقیناً آپ جانتی ہوں گی۔ مجھے بتاے سفیان صاحب گھر بیٹو معاملات میں آپ پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔“

”بیٹی! دراصل بی بی کو کینسر ہے۔ آخری ایجنج پر ہے۔ صاحب ان دنوں کینیڈا گئے ہوئے ہیں۔ بچوں سے تو بزنس ٹرپ کا بہانہ کیا ہے لیکن اصل میں وہ علاج کے لیے مزید رقم لے کر بیوی کے پاس گئے ہیں، اسی لیے اوپر والے پورشن کی فی الحال سینگ نہیں کرائی۔ وہ ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ کسی

طرح بی بی کو آرام آجائے۔ بی بی دہاں علاج کے لیے رہتی ہیں اور اب پچھلے ایک ماہ سے مسلسل ہسپتال میں داخل ہیں۔ ان کے ڈاکٹر نے فون کر کے انہیں کینیڈا بلوایا ہے کہ اب چل چلاؤ ہے بس جو چند دن کا سائیس رہ گئی ہیں، وہ اپنے گھر والے کے ساتھ گزرانا چاہتی ہیں۔

”اوہ مانی گاڈ۔“ ارسلہ کے سر پر چھت آ رہی۔

”اور جو یہاں بیجے اپنی ماں کے لیے کمر اسجائے، ان کی پسند کے کپڑے خریدنے، انہیں نئے گم کی خوب صورت ڈیکوریشن اور سیننگ دکھانے کو بے چین تھے اور طرح طرح کے منصوبے بنا رہے تھے۔۔۔۔۔“

ارے پڑھے تھے۔“

”دوسرا۔۔۔ عانیہ نے ایک پڑھا تھا اور فریدوں نے پہلا سا رہ۔“ ان کی ماں کے انتقال کو دو ماہ زر چکے تھے۔ بچے یادہ خود انہیں فون کرتی رہتی تھی۔ بچوں کو بالآخر اس ایسے کی خبر ہو گئی تھی۔ تدفین لٹان میں ہو گئی تھی۔

موبائل فون آف کر کے وہ پلٹی تو روشاں کھلے دروازے سے اندر آ چکی تھی۔

”آؤ روشاں! کیسے آنا ہوا؟“ اس نے خوش دلی سے استقبال کیا۔ مخلص تو وہ آج بھی اس سے اسی طرح تھی مگر دونوں کے بیچ ایک ناموس سا فاصلہ، تکلف اور گریز آچکا تھا۔

”میری نیناں سے بات ہوئی تھی فون پر۔ وہ بتا رہی تھی، اسد بھائی نے منگنی توڑ دی ہے جبکہ پایا پ کو جاب چھڑا کر گھر بٹھا چکے ہیں۔ میری وجہ سے ہوا نایہ سب کچھ۔“

”تمہاری وجہ سے نہیں، قسمت کی وجہ سے۔“ وہ چل سے مسکرائی۔

”اور اسد بھائی تو یوں بھی مجھے زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ انہیں تو بہانہ چاہیے تھا۔ رہی جاب کی تو جی بات ہے، اب میں خود بھی اس بھاگ دوڑ سے ہلک چکی تھی۔ پاپانہ بھی کہتے تو چھوڑ دیتی۔“

”نہیں۔“ وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔

”اس سب کی ذمہ دار میں ہوں، میری کم ظرفی، میرا خود غرضانہ رویہ، میری ذلیل اور بچ حرکت۔۔۔ میں کیوں اتنی اندھی ہو گئی تھی۔ پاپا اور آپ اتنے عالی ظرف نکلے، میرے جھوٹ کو بھی نبھاتے ہیں، ان کی تدلیل آمیز حرکتیں اور باتیں برداشت کرتے رہے اور میں نے ان کے پیچھا دوڑے میں کر۔۔۔“

”اجانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ شاید احساس جرم کے بوجھ سے پھیننے پراگئی تھی۔

”میں کہیں نہیں گئی تھی، کسی نے مجھے اغوا نہیں کیا تھا۔ میں ماموں کے گھر پر بھی اس دن۔ ان کے بپے پر بڑا رمدار چایا تھا۔“ ارسلہ کے اعصاب پر جیسے کوئی بم پھٹ گیا تھا۔

اس کی نہایت بے یقین نظریں اور ہوائیاں اڑتے چڑھنے کے تاثرات سوال کر رہے تھے۔ ”مگر ہوں؟“

بچوں پر ہونے والے تقدیر کے کاری دار نے ارسلہ کا دل بھی چھیدا تھا۔

”اللہ اپنا کرم کرے۔“ وہ کچھ دیر تک بیٹھ کر آگئی تھی مگر اس کا دل مسلسل کسی گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔

گھر آ کر ایک نئی خبر، نیا حکم اس کا منتظر تھا۔

”ارسلہ! تم کل آفس سے ریزائن کر دو، بہت ہو گئی جاب۔ اب کچھ عرصہ گھر بیٹھو پھر میں تمہاری شادی کر دوں گا۔“

پاپا کے حکم پر وہ لب بستہ کھڑی رہ گئی تھی۔

یہ بھی نہ کہہ سکی کہ پاپا کسی کے کیسے کی سزا مجھے کیوں دے رہے ہیں۔ اس نے آفس جانے کے بجائے فون پر شہر و ز کو ساری صورت حال بتا کر اپنی طرف سے ریزائن ٹاپ کر کے میڈم کو دینے کا تاکید کر دی تھی۔

☆ ☆ ☆

”بیٹے! اب تو وہ ملازمت چھوڑ چکی ہے۔“

”کچھ بھی ہو، میں کسی قیمت پر اس سے شادی نہیں کروں گا۔ وہ پہلے بھی مجھے کبھی پسند نہیں رہی تھی اور اب تو اس کی بہن کے عظیم ترین کارنامے کے بعد سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

اسد پر تاپا اور تاتی کی وضاحتوں، منتوں بلکہ دھکیوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ کسی صورت اس رشتے کو برقرار رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ مجبوراً تاپا سجاد کو ضیاء صاحب کو صورت حال بتا کر معذرت کرنا پڑی۔

ان کے جھکے ہوئے کندھے مزید جھک گئے۔ ٹوٹا ہوا حوصلہ مزید ٹوٹ گیا۔ کم کم بات کرنے والا عادت مستقل خاموشی میں بدل گئی۔

ارسلہ نے بغیر کسی احتجاج یا اعتراض کے ان کا جاب چھوڑنے کا فیصلہ مان لیا تھا مگر اب اسے بے مقصد انداز میں گھر میں ادھر ادھر بولائے پھرتے دیکھتے تو مزید دلبرداشتہ ہو جاتے تھے۔

☆ ☆ ☆

”مس! پاپا آپ سے اوپر والا پورشن بھی ڈیکوریٹ کر دانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے آپ کے آفس فون کیا تھا۔“ تابندہ کا فون آیا تھا۔

”بیٹے! اب میں یہ کام چھوڑ چکی ہوں، ریزائن کر چکی ہوں۔ تم بتاؤ، اپنی ماما کے چالیسویں برکتے

کے وقت کھلا کہ یہ سب ایک سوچ سمجھی سازش تھی۔ مقام اور محبت نہیں بلکہ مال و دولت اور آسائشوں حصول کے لیے یہ گھنیا حربہ اپنایا گیا۔ اس طرح ایک تو پایا کو نیچا دکھانے کا موقع مل گیا کہ ہم تمہاری ہوئی بدنام لڑکی کو گھر میں بسا رہے ہیں اور دوسرا بے دھڑک فرمائشیں منوانے اور خوب پیسہ بوزر موقع ہاتھ لگ گیا جو کہ ان کا اصل مقصد تھا جس سے میں انجان رہی تھی۔ ماموں ممائی میرے سر اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔ ارمنٹان نے یہ اپارٹمنٹ ماموں کے نام کر دیا ہے۔ گاڑی ارمنٹان کے ہے۔ پایا کے آفس میں مفت کی کھار ہا ہے بیٹھ کے۔ کتنا بیٹھا کھیاں مارتا رہتا ہے یا کبھی موڈ ہو تو سے آفس ہی نہیں جاتا۔ مجھ پر بھی احسان کہ میں تو تمہارے باپ کے ہاں ملازموں کی طرح کام ہوں۔ تنگ آکر پایا نے اسے ملازمت سے نکالنے کو کہا ہے۔ ماموں ممائی مفت کی روٹیوں پر میٹھ رہے ہیں۔ بیٹھے بٹھانے اتنا لگژری اپارٹمنٹ نام ہو گیا۔ اس سے پہلے پنڈی کی تنگ گلیوں میں کرا کے دو کروں میں رُلتے تھے۔“ وہ خنی سے گویا تھی۔

”اب ایک مہربانی کرنا۔ اصل صورت حال پایا کو ہرگز مت بتانا۔ مجھے ڈر ہے کہ اصل صور حال جان کر کہیں وہ صدمے سے پاگل نہ ہو جائیں۔ بہت بری بیٹی کی مثال پیش کی ہے تم نے یہ قدم کر۔ اتنا مان دینے والے باپ کی عزت کو سڑک پر روند دیا۔“

ارسلہ حقیقت جان کر از حد برگشتہ دکھائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

”دیکھ ہم“ شہرہ ز نے سیاہ پھولدار سوٹ میں ملبوس خوش باش سی ارسلہ کو دیکھ کر بے اختیار اسے اٹھ کر شرارت کی تھی۔

”کسی مہربان کی فون کال پر پایا کچھ ایسے پچھلے کہ انہوں نے فوراً مجھے آڑ کر دیے۔ کل سے ان جوائن کرلو، اپنا ریزائن واپس لے لو۔“ وہ شوشی سے مسکرا دی۔ وہ اس کی ٹیبل کے سامنے پڑی کر رہا جہان ہو چکی تھی۔

شہرہ ز کے ایک ایک انداز سے زندگی کی ترنگ اور تازگی چھلک رہی تھی۔ اسی نے فون کر کے بڑے طریقے سلیقے سے ضیاء صاحب کو قائل کر کے ارسلہ کو دوبارہ آفس جوائن کرنے کی اجازت دلوائی تھی۔ ارسلہ تو وہ اس ایک ماہ کی ”چھٹی“ کے دوران مسلسل رابطے میں رہا تھا۔ ہر معاملے سے آگاہ تھا۔

”میں نے بالآخر انہیں قائل کر ہی لیا کہ ایسے لوگوں کی خاطر جن کا اب ارسلہ کی زندگی میں رول بھی نہیں رہا۔ آپ اس کا بہترین کیریئر کیوں تباہ کر رہے ہیں۔ اتنا عرصہ قریب رہنے کے باوجود اگر وہ شخص آپ کی بیٹی کی طبیعت کو سمجھ نہیں سکا، اس سے کمپر و ماٹرن نہیں کر سکا تو پھر اس کی رائے پاپنہ پسند کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے۔ لازمی تو نہیں ہے کہ اگر ایک اولاد آپ کے جذبات کو کھینچ پھینچائے آپ اس کی فرسٹریشن دوسری اولاد کے حقوق ضبط کر کے نکالیں۔ وہ سمجھ دار آدمی تھے۔ سمجھ گئے اور فورا طور پر عمل بھی کر ڈالا جس کے ثبوت کے طور پر آج تم یہاں ہو۔“

”اچھا بھئی! مہربانی، شکریہ۔ اب یہ بتاؤ، کوئی نئی اسائنمنٹ ہے یا نہیں؟“

”وہی شاہ ہاؤس کی اپر اسٹوری کی ڈیکوریشن کرانی ہے۔ وہ پارٹی تمہارے علاوہ کسی دوسرے

نیکو سائن کرانے پر آمادہ نہیں ہیں۔ کیا بات ہے کوئی چکر دوگر تو نہیں ہے۔“ تقریباً ایک ماہ بعد جب وہ اس اسائنمنٹ سے فارغ ہوئی تو سفیان شاہ نے بڑی بردباری اور گی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پروپوز کر ڈالا۔

”دیے تو مجھے یہ بات آپ کے فادر سے کہنی چاہیے تھی مگر چونکہ میرا پروپوزل ایک خاص قسم کا گراؤنڈ رکھتا ہے، اس لیے پہلے آپ کی طرف سے سپورٹ درکار ہے۔ میں بچے ہیں میرے۔“

آخر تقریباً چھتیس سال ہے۔ کیا آپ میرے ساتھ زندگی بسر کر سکیں گی۔ میری خواہش ہے کہ مجھے بڑے گھر کو آپ جیسی سچی ہوئی اور میچور لڑکی کا ساتھ ملے۔ آپ سوچ لیجیے گا اچھی طرح۔ اگر منظور ہو رہی خوش بختی لیکن کسی بھی حالت میں میرے دل میں آپ کی عزت اور وقار میں کمی ہرگز نہیں ہوگی۔“

وہ بے حد سچاؤ سے بڑے پیچور انداز میں نرمی سے کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

وہ زمانے کی گردش پر غور کرنی رہ گئی۔

☆☆☆

وہ بہت بری طرح بھڑکا تھا۔

ارسلہ نے تو یونہی بات کی تھی۔ سرسری سے انداز میں اس سے نئی پروجیشن شیئر کا تھی جیسا کہ وہ اس سے کرتی آئی تھی۔

”مجھے تمہارا غصہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں نے تو تمہیں صرف ایک بات بتائی ہے کہ سفیان شاہ نے اپنے اپنا پروپوزل پایا کے حضور پیش کیا ہے۔ پہلے انہوں نے مجھ سے اجازت مانگی تھی۔ میں نے ہٹا دی تو مجھے کرنی ہی ہے پھر روشان کی حرکت کی وجہ سے ہماری فیملی کو جو بدنامی اٹھانی پڑی اس بعد اس قسم کا پروپوزل کوئی اپنا مل بات بھی نہیں۔ میں سمجھ نہیں پا رہی، اس میں اتنا۔۔۔“

”ہر بات تمہاری سمجھ میں آتی ہے مگر جو سامنے کی بات ہو، وہ سمجھ میں نہیں آتی۔“ وہ بری طرح چڑ گیا۔

ارسلہ حیران پریشان اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ ”یہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟“

”تمہیں کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا ہے، جاتے ہوئے موڈ کیوں آف کر رہے ہو۔ ناراضی کر سکتی کرتے۔“ اس نے اپنی طرف سے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”درد لے کر بھی سفر نہیں کیا کرتے۔“ وہ اسے بری طرح گھور کر پیر پختابا ہر نکل گیا تھا۔

”افو، خواہ مخواہ ناراض ہو گیا ہے۔ لو بتاؤ، اب دودن بعد لو لے گا۔ اتنی دیر تک خواہ مخواہ ٹینشن میں رہے گا اور مجھے بھی یہاں پریشان رکھے گا۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنی سیٹ پر آئی۔ ایک کارڈ لفافے بت رکھا ہوا تھا۔

”ارسلہ۔۔۔“ یہی نیو ایئر کا کارڈ دیکھ کر اسے شہرہ ز کی خلصانہ دانستگی پر بے ساختہ ناز ہونے لگا۔

اب ہر موقع پر وہ اسے یاد رکھتا تھا۔

”اچھا اس لیے کہہ رہا تھا کہ ابھی میری ٹیبل پر بیٹھو۔ جب میں نکل جاؤں، تب اپنی ٹیبل پر جانا۔“

یادگار کا سر پرانہ دینا تھا۔

تمہیں حیات کا حاصل سمجھ لیا ہے مگر

تمہیں ہم اپنا بنالیں، یہ دسترس بھی نہیں

بہت عزیز دوست۔

برسوں سے دل پر حکمران ساتھی۔

دل میں چھپے اس بھید کو آج تم پر عیاں کرنا چاہتا ہوں تاکہ کل کیم جنوری کو تمہارے افر پھولوں سے اپنی بقیہ ساری عمر مہم کالوں۔“

بہت سارے بیٹے پل آگے پیچھے اس کی نظروں میں دوڑتے چلے گئے۔ وہ جانے کتنی درہا ہی میں گم رہی۔

وہ قدم قدم پر سایہ بن کے ساتھ رہنا۔

ہر لمحہ خیال، توجہ، احساس، اپنائیت۔

ردشان والے معاملے میں دن رات اپنا ہوش بھلا کر کی جانے والی کوششیں۔ ہر وہ بے ساختہ، بے اختیار اسی پر بھروسہ کرنی تھی، اسی کو بلاتی تھی۔

”اتنے برسوں سے گونگے کا گڑ کھا کے بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلے کیوں نہیں پھوٹے منہ اگلے ہی پل اس کے موبائل کا نمبر ملا کر اس سے جھگڑ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے بے وجہ آنسو رہے تھے۔“

”تم ممکنہ شدہ سب سے بلی تھیں، کسی کی امانت تمہیں، میں کیا کہتا اور کیسے کہتا؟“ وہ اسلام آباد باہر آچکا تھا اور نیکسلا کی طرف سفر کرتے ہوئے گاڑی کی اسپینڈ کم کر کے اس سے بات کر رہا تھا۔

”اور اب اظہار کا ارادہ باندھ کے تمہارے پاس آیا تھا کہ تم نے نئی زنجیریں دکھا دیں مجھے پہنا۔“ کوئی زنجیر نہیں ہے۔“ وہ بے ساختہ رد دی تھی۔

”اے خبردار! یہ آنسو میری امانت ہیں۔ خبردار! جو انہیں اتنی بے دردی سے بہایا تو۔“ ایک اشک کا حساب لوں گا۔ فوراً پوچھو انہیں، ورنہ میں خود پہنچ جاؤں گا یہ نیک فریضہ سرانجام دینے شرارت کے موڈ میں آچکا تھا۔

”کل آ جاؤ گے؟“ وہ آہستگی سے پوچھ رہی تھی۔ انداز میں عجب سی اپنائیت اور نئے نئے اقرار گھلا ہوا تھا۔

”کیوں؟ کل کہا ہے؟“

”کل ہماری زندگی کا نانا ویلا سورج طلوع ہوگا۔“ وہ مان سے بولی۔

”ہاں، کل تو لازمی ہے مگر تمہارے پاس نہیں، تمہارے پایا کے پاس۔ اس التجا کے ساتھ کہ کے ساتھ ساتھ ایک ہفتے کے اندر نکاح بھی کر دیں۔ بھئی! ہم پتی مہر لگائیں گے آپ کے اوپر بارہ بجے پتی نیو ایئر کہنے کے لیے فون کروں گا، انتظار کرنا۔“ اس نے سرگوشی کی۔

”ضرور۔“ ارسلہ نے بہت یقین کے ساتھ فون بند کیا تھا۔

☆☆☆

لو بہار آگئی

”ڈاکٹر کہاں ہے۔ ارے کوئی دہلہا کی بہن کو ڈھونڈ د۔“

اور مہندی کی تیاری کے لیے ہال سیٹ کرتے ہوئے لڑکیوں میں جس کی ڈھنڈ یا مچی ہوئی تھی وہ کچھ بعد کے اس ٹائم میں پچھلے لان میں بوسیدہ سی آثار قدیمہ ٹائپ کرسی پر بیٹھی سکون سے تیلیوں دل کو گلاب کے تختوں پر منڈلاتے دیکھ رہی تھی، یوں جیسے سرکس لگی ہو اور وہ اس کی واحد تماشا کی

”کہاں گئی؟ ابھی تو ادھر تھی۔ کہیں ہسپتال تو نہیں چلی گئی۔ اس پر ڈیوٹی ادا کرنے کا بھوت شدت رہتا ہے۔ دو ماہ ہوئے ہیں جو اس کیسے ہوئے اور ہم گھڑی بھر کی سلام دعا کو ترس گئے ہیں۔“

عالیہ، اس کی تایا زاد کرن تشویش و شرشی کا مظاہرہ بیک وقت کر رہی تھی۔

”لو بتاؤ بھلا۔ سگے بھائی کی شادی ہے اور وہ بھی چچا زاد بہن سے۔ اور اس کی لا پرواہی اور لی کا جواب نہیں ملتا۔ آج اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو۔۔۔“

اماں بی ان سب کی مشترکہ دادی، ٹھنڈی آہ بھر کر نہ جانے کیا داستان چھیڑ بیٹھی تھیں۔

”بابا ہوتے تو ہم یہاں اس شہر میں بھی نہ پائے جاتے۔۔۔“ اس نے ہال کمرے کی کھڑکی سے دائروں پر کان لپیٹ لیے تھے۔ حالانکہ یہ اس کی دور خیال تھی مگر بچپن سے جوانی تک اتنا کم آنا جانا

کدو ڈھنگ سے اس وسیع و عریض گھر اور اس کے بے شمار کیمینوں سے متعارف بھی نہ ہو پائی تھی۔

بابا کلگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پروفیسر تھے سو اپنی موت تک بیوی بچوں کے ساتھ مستقل میں مقیم رہے تھے۔ اماں بی اور اباجی کے پاس مہمانوں کی طرح سال میں ایک دو دن کے لیے

لوٹے کر ملنے آ جاتے تھے۔ پھر جب زرتاب نے میڈیکل میں داخلہ لیا تو گویا یہ رسم بھی چھٹ گئی۔

لیا پڑھائی اور بس پڑھائی۔ زرتاب نے ایم بی بی ایس کے پانچ سال ایسی ہی تعلیم ”ہندو نصائح“ لڑا ہر کیسے تھے، اس دوران انی دل کے آپریشن میں زندگی ہار کر ان سے بہت دور چلی گئی تھیں۔

نالاں سے پانچ سال بڑا اس کا بھائی ہائر اسٹڈیز کے لیے امریکہ جا بسا تھا۔

اور پھر آخری تازیانے کے طور پر بابا ایکسڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے۔ چھ ماہ پہلے کا وہ حادثہ اس

نرمل کا عظیم ترین سانحہ تھا۔ رضوان امریکہ سے واپس آ گیا۔ اول اول تو وہ لاہور چھوڑ کر اماں بی کے

پاس آنے کو تیار ہی نہیں تھی۔ اسے اس گھر سے امی اور بابا کی خوشبو آتی تھی مگر پھر رضوان کے بچہ بچھانے اور اباجی کی شفقت و حلاوت پر ان کے ساتھ آگئی۔ لاہور میں اب اس کا تھا بھی کون، پہلے وہ اور رضوان یہاں آئے تھے۔ رضوان کی بات سن سے طے تھی۔ اماں بی نے اسے شادی بدلنے میں دیر نہیں لگائی۔ کیا خبر کہ رضوان کا موڈ بدلتا اور وہ پردیس سدھار جاتا۔

اس کے قدموں کے لیے ”زنانی زنجیر“ کا اہتمام کرنا ضروری تھا۔ وہ تو زرتاب کو بھی لگام ڈالنے کے لیے بے تاب تھیں مگر وہ مان کر نہ دی۔ چونکہ اسے اپنا پشت پناہی حاصل تھی اس لیے اماں بی اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس نے سرکاری ہیز میں جاب شروع کر دی تھی۔

”بات سنئے، آپ زرتاب ہیں؟ یا ان کو جانتی ہیں؟“ وہ بڑے دھیان سے ایک بھنورے اور تکی کو تار تکی اور سرخ شید کے ترو تازہ گلاب پر پہنے کرنے کی جستجو کرتے دیکھ رہی تھی کہ عقب سے ایک تھکی تھکی سی آواز نے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سیاہ شلوار قمیص میں تھا۔ کام کی زیادتی نے کچھ بال بے ترتیبی سے پیشانی پر بکھرا دیے پاؤں میں سادہ چپل آستینیں کہنیوں تک نو لڈکی ہوئی اور چہرے پر سنجیدگی کا تاثر۔

وہ یقیناً اسے نہیں پہچانتا تھا کہ وہ شازہ بی ون کے اوقات میں گھر میں پایا جاتا تھا۔ کہیں اس پر پڑی بھی ہوگی تو گھر کے کمینوں کے میل ملاپ کے لوگوں یا مہمانوں میں شمار کرتے ہوئے وہ بیان دہی زحمت نہ کی تھی۔ لیکن زرتاب اسے دیکھ کر پہچان گئی تھی کہ وہ کون ہو سکتا تھا۔ کافی سال پہلے جب رضوان اپنے والد کے ساتھ اس پرانے قصبے میں واقعی اپنی آبائی حویلی! واواواوی سے ملنے گیا تھا تو اس نے واپس آ کر بہن کو بتایا تھا۔

”ارے بھئی زری! حویلی میں ایک عجیب و غریب کیریکٹر کا اضافہ ہوا ہے۔ مجھے تو ابھی پتا چلا۔ ورنہ یہ بات تو پرانی ہو چکی ہے۔“

”کون سی بات؟ ٹھیک طرح سے بتاؤ نا بھائی۔“

”تمہیں پتا ہے، ابو لوگ تین بھائی ہیں اور ان کی اکلوتی بہن طیبہ جنہیں ہم نے صرف تصویر میں دیکھا ہے انہیں پسند کی شادی کے جرم میں ہمیشہ کے لیے خاندان بدر کر دیا گیا تھا۔ وہ بیاہ کر شہر آ گیا ایک بیٹا بھی ہوا۔ خاوند کی موت کے بعد کسی وجہ سے پھینچو گوشہ تنہائی میں چلی گئیں اور اسے بے نیابت منت سماجت کے بعد اباجی کے حوالے کر دیا۔ اباجی نے صرف اسی صورت میں اسے گھر میں قبول کیا ہے کہ وہ ہمارے خاندان کا تعارف نہیں بنے گا بلکہ حویلی کے ملازمین کی طرح رہے گا۔ سو ہو رہا ہے۔ بے چارہ اسید ہا سادہ کم گو بندہ ہے، چچی اور تائی امی اور اماں جی کا رویہ خاصا سرد و پا ہے۔ اماں جی کہتی ہیں اسے دیکھ کر ان کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ اس کے چال باز اور مکار باپ۔ ان کی پھولوں جیسی بیٹی کو کانٹوں پر رول دیا۔ کزنز نے بھی زیادہ لفٹ نہیں کرائی۔ اصل میں وہ بندہ خود پس منظر میں رہنے کا عادی ہے۔ خاموش، تنہا اور بور، عباد بھائی کہتے ہیں صبح کی دو منٹ کی قربت بندہ کو حلق تک بے زار اور بور کر دیتی ہے۔“

اتفاق سے زرتاب جب بھی بابا کے ساتھ ایک آدھ دن کے لیے یہاں آئی اس سے براہ راست

ابا جی اپنی ساری توانائیاں رضوان کی شادی میں خرچ کر رہے تھے۔ رضوان گھر بھر کا پسندیدہ تھا۔ وہ اٹھ کر چچی کے پورشن میں آگئی۔ شرابی لجائی سمن کے چہرے پر رنگوں کی بہار چھائی ہوئی تھی وہ خود کو فضاؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ وہ زرتاب سے کرید کرید کر رضوان کی باتیں پوچھتی اور رہی، وہ واپس مرکزی پورشن یعنی ہال کی طرف آگئی۔

”کب آئیں گے کیئرنگ سروس والے، آرڈر بھی دیا تھا یا پونہی ہوا میں تیر چلا آئے ہو۔۔۔“ چچی کے بڑے سپوت اور گھر کی سیکنڈ ان کمانڈ عباد بھائی درستی سے صبح سے مخاطب تھے۔ وہ کم بھی اس سے نرمی سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ نہ جانے کیا پر خاش تھی کہ مخاطب ہوتے ہوئے ان کا لہجہ خود بخود درخونیت و خشونت سے لٹھر جاتا تھا۔

”جب کہا ہے تو آج بھی جائیں گے۔ آپ تسلی رکھیے عباد بھائی!“ نہ جانے کیوں زرتاب سے رہانہ گیا۔ اس نے دیکھا صبح کی سرخاموشی تھا نہ تائید نہ تردید، اس کی خاموشی نے زرتاب کو بولنے پر آمادہ کیا تھا۔ اسے عباد بھائی کا فرعون لہجہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ”اچھا! اور اگر موصوف بھول گئے ہوں تو؟“ اس کے دفاعی لہجے نے عباد بھائی کو چونکا دیا، ایک گہری نگاہ اس پر ڈال کر لہجہ بدل کر سوال کرنے لگے۔ ”میں اپنے کام اور اپنی اوقات نہیں بھولتا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔“ وہ اسے مشکل میں پھنسا دیا کہ جوابا بولا۔ لہجہ پُر سکون اور دھیمہ تھا۔

اسی لمحے نصیر نے کیئرنگ سروس کے بھیجے ہوئے بندوں کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ اللہ کا بندہ ”دیکھ میں نہ کہتا تھا۔“ قسم کا کوئی بھی جتنا ہوا جملہ بولے بغیر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

”اسے اس کی اوقات یاد کر اترے رہنا چاہیے۔ باغی ماں کی نشانی ہو نہ۔“ عباد بھائی نخوت سے ہر جھٹک کر آگے بڑھ گئے۔

زرتاب کے قدم زمین نے جکڑ لیے۔ گھر بھر کے روتیوں نے بتا دیا تھا کہ صبح کو ملازم سے کچھ ہی اوپر کا درجہ دیا گیا ہے اور اب اس کی یہی انداز اپنانے چاہئیں۔ خاندانی روایات کے مطابق۔

☆ ☆ ☆ شادی کے پانچویں دن ولیمہ ہوا۔ تائی کے لاڈلے سپوت خرم بھائی، ان کی بیگم اور چھوٹا بچہ یام سعودیہ میں تھے۔ یا سر پر پپ کلاس کے پرچے دے رہا تھا اس وجہ سے وہ شادی پر نہیں آسکے تھے۔ البتہ ولیمے پر ان کی شمولیت یقینی بنانے کے لیے تاریخ آگے بڑھادی گئی تھی۔ پرسوں اس کے امتحان ختم ہوئے تھے اور آج وہ لوگ پاکستان پہنچ گئے تھے۔ ولیمے کی تقریب گھر میں ہی منعقد کی گئی تھی۔

مہمان دو پہر کے کھانے پہ بلائے گئے تھے اور شام کی چائے کے بعد واپس بھیجے جانے تھے۔ ”زرتاب بی بی! آپ اس وقت بھی ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو جا کر نوں سن لیجیے۔“ وہ شامیانے کے نیچے کھانے کی میزوں کے آس پاس منڈلاتے لوگوں کو بے دھیانی کے عالم میں دیکھ رہی تھی جب پشت کی طرف سے سادہ سا لہجہ کان پڑا۔ وہ مڑی۔

صبح کے ایک ہاتھ میں بھٹے ہوئے مرغ کی ٹرے تھی جسے وہ قریبی میز رکھ رہا تھا۔ مہندی سے

”اس لیے کہ گھر میں زمینوں کا حساب کتاب رکھنے کے لیے منشی کی ضرورت تھی۔“

”زمینیں کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی تھیں۔“ اس نے ڈانٹنے والے انداز میں اسے دیکھا۔ ”پڑھائی مکمل کرنے کے بعد بھی یہ کام سنبھالا جاسکتا تھا۔“

”اور کسی کو نہ سہی مجھے خود کو تو پالنا تھا نا۔ یہ دھیان میں رہے کہ مجھے اپنے اس ننھیالی محل میں صرف نام اور کمرے کی پناہ دی گئی ہے۔ نا تا جان میرا تعارف اپنے قریبی عزیز کے بیٹے کے طور پر کراتے ہیں جسے لاوارث جان کر ازراہ ہمدردی گھر میں جگہ دے دی۔“

اس کا لہجہ بالکل ہموار، سیدھا اور پرسکون تھا۔ وہ لب بستہ کھڑی رہ گئی۔

”آپ کب تک واپس آئیں گی؟“ حالانکہ اس قسم کے حسابات رکھنا گھر کی عمر خواتین یا ذمہ دار افراد کی ہالی تھی۔ پھر وہ کس ناتے اور کس کھوج میں دریافت کر رہا تھا۔

”شاید شام کے چھ سات بجے تک کچھ کہہ نہیں سکتی۔“

وہ تقریباً سات بجے گھر پہنچی تھی۔ خلاف معمول گھر میں سناٹا تھا۔ ”کیا دیسے کی تقریب اتنی جلدی نپٹ گئی؟“ اس نے گیٹ پر کھڑے ملازم سے دریافت کیا۔ پتا چلا دو لہیا دو لہین اور دیگر مہمان دیسے سے نپٹ کر چچی کے میکے میں دعوت پر گئے ہیں، یوں بھی ولیہ ایک ہفتے بعد ہوا تھا۔ رشتہ داروں کو اپنی دعوتیں نبھانے کی جلدی تھی۔ رضوان کو واپس امریکہ جانا تھا کہ اس کی پڑھائی کا خرچہ ہو رہا تھا۔ آپ کے لیے اماں بی کا پیغام ہے کہ تیار ہو کر فوراً اوھر پہنچ جائیں۔“

وہ نیم دلی سے سر ہلا کر مرکزی پورشن کی طرف آگئی۔ سنگ روم میں ساٹھ واٹ کا ملگجا سا بالب روشن تھا۔ گھر کی زیادہ تر لائٹس آف تھیں، سنگ روم اور بچن لمحہ تھا۔ چھ کرسیوں کی میز، صوفہ کم بیڈ، ایڑی چیئر اور صوفہ چیئر کے علاوہ فریج اور ڈیپ فریزر بھی یہیں سیٹ کیے گئے تھے۔ کوکنگ ریج کے دائیں بائیں وسیع و عریض کاؤنٹر تھا اور عین اوپر کرکری کے لیے خلیف بنائے گئے تھے۔

وہ تھکی ہاری آتے ہی صوفہ کم بیڈ پر گر گئی۔ پوٹے ملستے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے دوپٹہ کھینچ کر ایڑی چیئر پر اچھالا، پھر سفید اول آل اتار کر ایک طرف ڈالا اور جسم کا کھینچاؤ دور کرنے کے لیے ایک بھر پورا انگڑائی لے کر وہم سے صوفے پر دراز ہو گئی۔

”چچی کے میکے جانا تو پڑے گا۔“ وہ ارد گرد کے ماحول پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کسل مندی سے سوچ رہی تھی۔ وہی تصنع، جبری مسکراہٹ اور پُر تکلف گپ شب۔ اس کا جی اوب گیا۔ یوں ہی سامنے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے جیسے اس کا سانس رکنے لگا۔ وہ کوکنگ ریج کے پاس کھڑا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی اور جھپٹ کر دوپٹے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”کیا میں اندھی ہو گئی تھی کہ چھٹ کا بندہ کھڑا نظر نہ آیا۔“ اس کا چہرہ تپ کر سرخ انار ہو گیا تھا اور خجالت کہتی تھی زمین شق ہو تو اس میں سما جاؤ۔

”چائے پیئیں گی آپ؟“ وہ بڑے سکون سے کپ تھا مے اوھر آ گیا۔

”اتفاقاً ہی دو کپ بن گئے۔ لیجئے نا۔“ وہ اس کی شرمندگی دور کرنے کے لیے دانستہ انجان بن رہا تھا۔ نظر بھی متاڑا اور چھکی ہوئی تھی، مگر زرتاب کی بدحواسی کم نہ ہوئی۔ یہ میرا بیڈ روم تو نہیں تھا جو بلا جھجک آکر گر گئی۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے مجھے اطمینان کر لینا چاہیے تھا کہ اندر کوئی موجود ہے۔

”کس چیز کی ڈاکٹر ہیں آپ؟“ وہ اس کے مقابل صوفہ چیئر پر بیٹھ گیا۔

”عام سی ڈاکٹر ہوں۔ اسپیشلائز نہیں کیا ابھی۔“ اس نے کپ تھا مگر کچھکچھ نظر دس سے بھاپ اڑاتی چائے پر نگاہ جمادی۔ لہجہ بہت ہی مدہم اور کترایا ہوا تھا۔

”آپ آن ایزی ٹیل نہ کریں۔ میں شرمندہ ہو رہا ہوں۔ مہمانوں کی بہتات کے باعث آج کل میرا ٹھکانا یہیں ہوتا ہے۔ اس لیے جب غلطی دونوں میں سے کسی کی نہیں ہے تو شرمساری کیوں؟ ہم کوئی اور بات کیوں نہ کریں اچھی سی۔ آپ کس میں اسپیشلائز کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟“ اس کا انداز اتنا رسانییت لیے ہوئے تھا کہ زرتاب کے کھنچے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔

”ابھی سوچا نہیں ہے۔“ وہ چائے پینے لگی۔

”دل کے امراض میں کر لیں۔“ زرتاب نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

”مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ اور آل اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے، آپ تو خفا ہو گئیں اور چائے بھی نہیں پی۔“ اس نے اس کا کپ دیکھا جو آدھے سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔

”میں خفا نہیں ہوں۔ تھکی ہوئی ہوں اور پھر ابھی چچی کے میکے بھی جانا ہے۔“ وہ بے دلی سے قدم بڑھانے لگی۔

”اگر آپ کا دل نہیں چاہ رہا تو مت جائیں۔“

”بہت سے کام ہیں دل کی مرضی اور اجازت کے بغیر کرنے پڑتے ہیں۔“ وہ مڑ کر ایک لٹلے کو مسکرائی اور پھر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

”زندگی کی سب سے خوب صورت حقیقت شادی ہے۔ مجھے تو اپنی اب تک گزری زندگی بے کار لگ رہی ہے۔ اصل رشتہ اور لطف تو شوہر کے دم سے ہے۔ دو ہفتوں میں ہی رضوان زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہو گئے ہیں۔ میری مانو تو تم لوگ بھی شادی کر لو اب۔“

”تو اچی نمٹا نہیں رہنے دے۔“ سدا کی منہ پھٹ عالیہ نے براؤن نقشی اور موتیوں کے کام سے جو جھل شرارے میں ملبوس سمن کو ایک جملے میں بھگتا دیا۔

سمن کے اٹھتے بیٹھتے شوہر اور شادی کے فوائد و اہمیت پر دیے گئے لیکچر نے انہیں حلق تک بے زار کر دیا تھا۔ زرتاب تو پھر لچل لچل میں چپ رہتی تھی، مگر عالیہ صاف منہ پر کہہ دیتی تھی۔

سمن بے چاری بھی کیا کرتی زندگی میں پہلی مرتبہ خاندان والوں کے سامنے اہمیت ملی تھی۔ ڈیگیں مارنا اس کا حق بننا تھا۔

”اسے اس کے حال پر چھوڑ دو یہ ان دنوں ہوش کھوئے ہوئے ہے۔ شروع میں تو شب کو ہی خمار چڑھا ہوتا ہے۔ بعد میں پتا لگتا ہے آٹے دال کے بھاؤ کا۔ آغاز جانم جانو اور ڈارلنگ سے ہوتا ہے اور انتقام احمق، بے وقوف عورت، مصیبت اور جان کی دشمن سے۔“ عالیہ استہزائیہ انداز میں زرتاب سے غائب ہوئی۔

شادی کیا ہوئی تھی سمن ناس پر چاڑھی تھی شنی دکھانے میں تو پہلے بھی کم نہیں تھی اب اور دھار لگ گئی تھی۔ مہارانی بنی سب کی دعوتیں بھگتا رہی تھی۔ چال میں خمر، انداز میں غرور و ناز، لہجے میں احساس برتری اور آواز میں نخوت رخصت کرنی تھی امریکہ پلٹ خوبرو و جوان مرد پیدا کئے لایا تھا آخر کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔ (اس کے نزدیک)

عالیہ اس کی شوخی و طراری پہ ہنسا کرتی تھی۔

”غریب کو پہلی مرتبہ کوئی نشان امتیاز ملا ہے۔ اب بھی بڑھکیں نہ مارے بھلا، ویسے تو معاذ اللہ ہر میدان میں صفر بانی صفر رہی ہیں۔ ایف اے میں شاندار نمبروں سے ٹپل، گھریلو معاملات میں اناڑی اور اب ایک دم اتنی خاص ہو گئی ہے۔ خاوند کا لاڈ پیار ماں ابا کی ناز برداریاں بی دہلن ہونے کے ناتے رشتہ داروں اور جاننے والوں کا ملنے کے لیے اشتیاق۔ اس کے لیے بدلی ہوئی فضا جنت سے کم نہیں ہے۔ تب ہی تو اپنے سامنے کوئی نظر نہیں آ رہا۔ اتر آئے گی تھوڑے دنوں میں خوابوں کے آسمان سے۔ دہلی دہائی گھریلو لڑکیاں شادی کے شروع کے دنوں میں اکثر مارے خوشی کے آپے میں نہیں رہا کرتیں۔ بڑی عامی بات ہے یہ۔“

عالیہ ایسی ہی تھی۔ سدا کی صاف گو۔ حالانکہ مزاجاً زرتاب بھی ایسی جیسی تھی لیکن وہ ظاہری اعتبار سے عالیہ سے مختلف تھی۔ بولنے سے پہلے تو لے کے کلیے پر کار بند رہتی تھی۔ وہ اس بات کی قائل تھی کہ انسان کو موقع محل و کچھ کر بات کرنی چاہیے۔ بے موقع کی صاف گوئی بد لحاظی میں شمار ہونے لگتی ہے۔ کچھ وہ فطرتاً بھی نرم دل، مصلحت کو ش اور امن پسند لڑکی واقع ہوئی تھی۔

”سمن ڈیر! تم اپنی خوشی میں مست رہو۔ ہماری فکر چھوڑو۔ شادی ایک دن سب کی ہونی ہے۔ کچھ کی جلدی ہو جاتی ہے کچھ کی دیر میں اس میں اتنا اتلاؤ لا ہونے کی کیا ضرورت ہے بھلا اور اگر تم خواہو بار بار ہماری شادیوں کا ذکر کر کے ہمیں احساس کمتری میں مبتلا کرنا چاہتی ہو تو اطلاع عرض ہے کہ کم از کم مجھے اور زری کو تم جذباتی پسند اڈال کر شکار نہیں کر سکو گی۔ ہم دونوں اپنی ایک واضح شناخت پا چکے ہیں، زندگی میں اک مقام، ایک نام رکھتے ہیں اور اپنا آپ منوانے یا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے شوہر کے نام کی ضرورت نہیں ہے۔“

عالیہ کے دونوں جواب پر سمن بلبلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیسی گھٹیا سوچ ہے تمہاری۔ میں ایسا تھوڑی جھکتی ہوں۔“

”تو پھر یہ بہانے بہانے سے اپنی خوش گوار و دومان پرور زندگی کی جھلک دکھا کر ہماری بردقت شادیوں کا تذکرہ کرنے اور در پردہ ہم پر ترس کھانے کی روٹن بند کرو۔ انسانوں کی طرح رہو۔ جذب برداشت بھی کوئی چیز ہوا کرتی ہے۔ اتنا سا مرتبہ ہضم نہ ہوا، نیویارک جاؤ گی تو شاید ہمیں دوسرے درجے کی مخلوق سمجھنے لگو۔“ اس کے بھڑکنے کا عالیہ پر کوئی اثر نہیں ہوا، اس کا لہجہ بے نیازی لیے ہوئے تھا۔ سمن تلملا کر پیر پٹنے لگی۔

”زری! دیکھ رہی ہو اپنی لاڈلی دوست کے تیور۔ جلتی ہے یہ مجھ سے ہونہر۔“ جب عالیہ کے منہ کو نہ اسکی تو نندی امداد طلب کر لی۔ زرتاب بیچ میں پھنس کر رہ گئی۔

”عالیہ تمہاری بھی دوست اور کزن ہے۔ چلو دونوں سیز فائر کر لو عالیہ! تم تو شاید اپنا لیکچر تیار کرنے جا رہی تھیں۔۔۔“

عالیہ مقامی کالج میں لیکچرار تھی۔ زرتاب نے کسی طرح معاملہ رفع دفع کر دیا۔

رضوان آج کل ویزے کے چکروں میں الجھا ہوا تھا۔ وہ ایک ہفتے بعد واپس جا رہا تھا۔ فی الوقت سمن کو ساتھ لے جانا ممکن نہیں تھا۔ اس کی اسٹڈیز مکمل ہونے میں چھ ماہ باقی تھے پھر اس کے بعد جاب ڈھونڈنے اور سیٹل ہونے میں مزید وقت لگتا۔ رضوان نے فیصلہ کیا تھا کہ سمن کو ایک سال بعد اپنے پاس نیویارک بلائے گا تا کہ اپنی فیملی کو سپورٹ کرنا اس کے لیے مشکل نہ رہے۔ سب بڑے اس کی تجویز پر متفق تھے۔ یوں بھی خاندان میں اکثر ایسا ہوتا آیا تھا۔ بیویاں پاکستان میں شوہر کی اولاد اور گھر سنبھالتی تھیں اور مرد مل ایٹ یا امریکہ میں کمائی کرتے تھے۔ سال میں ایک دوسرے پاکستان آ جاتے تھے یہ فیصلہ سمن پر بچی بن کر گرا۔ وہ رضوان کی بری طرح عادی ہو چکی تھی اب اس کے لیے اس کی محبت، اس کی قربت سے دور رہنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ رورو کر وہ آدھی ہو گئی مگر رضوان کی بھی مجبوری تھی۔

”یار! تم پہلے بھی تو رہتی تھیں نا۔ اب کیا انوکھی بات ہو گئی۔“ رضوان اس کے آنسو پونچھتے ہوئے تسلی دیتا۔ ”پہلے کی بات ادھر تھی، مجھے اپنی محبت کا عادی بنا کر اب چھوڑ کر جا رہے ہیں؟“

”مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے۔ تم سے بچھڑنا میرے لیے بھی امتحان سے کم نہیں ہے۔ مگر مجبوری ہے ڈارلنگ! اچھے مستقبل کے لیے کچھ قربانیاں تو دینا پڑتی ہیں نا۔ میں چاہتا ہوں جب تم نیویارک میں اپنے گھر میں قدم رکھو تو تمہارے پاس زندگی کی ہر ضروری سہولت موجود ہو۔“

جانے والوں کو جانا ہی ہوتا ہے۔ لاکھ دلو جی کیے باوجود کم وقت رخصت بلک پڑی۔

زرتاب بھی اپنے دل میں اواسی محسوس کر رہی تھی۔ ماں باپ کے بعد وہی اک مضبوط ترین رشتہ رہ گیا تھا اور اب وہ بھی ساتھ چھوڑ رہا تھا۔

رضوان کی دن کی فلائٹ تھی، اتفاق سے زرتاب کی بھی صبح کی ڈیوٹی تھی مگر رضوان کو اللہ حافظ کہنے کے لیے اس نے اپنی ڈیوٹی اپنی ساتھی ڈاکٹر طوبی سے بدل لی تھی۔ اب اسے شام چھ بجے سے رات گیارہ بجے تک ڈیوٹی دینا تھی۔

☆☆☆

”کیا ہو رہا ہے ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔!“

وہ حسب معمول پچھلے صحن میں پھولوں کی باڑھ پہ پھنوروں کا قصص انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ عباد بھائی ادھر نکل آئے۔

”کچھ نہیں عباد بھائی! بونٹی اندر بیٹھی بور ہو رہی تھی تو ادھر آ گئی۔ عالیہ ابھی تک کالج سے نہیں لوٹی اور میرا ڈے آف ہے، اس لیے گھر پر نظر آ رہی ہوں۔“

”سرکاری ہسپتال کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ لمبی چوڑی ڈیوٹیاں نہیں بھگتانی پڑتی۔ بند بے وجہ پریشاںز ہوتا ہے بندہ۔ پرائیویٹ ہسپتال کے ڈاکٹر زکو زیادہ ٹائم دینا پڑتا ہے۔“ وہ مسکرائے۔

”یہ بات نہیں ہے، جاب بہر حال جاب ہوتی ہے۔“

”مستقبل کی کیا پلاننگ ہے تمہاری؟“

”کچھ نہیں اسپیشل نر کر دوں گی اور اس کے بعد ظاہر ہے اپنا کلینک سیٹ کرنے کا انتظام کر دوں گی۔“

”عماد بھائی کچھ دیر تک اس کے چہرے کو بغور دیکھتے رہے۔“

”باہر چلو گی سیر کرنے۔“

”ضرور چلوں گی، مگر اس وقت یہ آفر دینے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔“ وہ ان کی عجیب و غریب آواز پر حیران رہ گئی تھی۔

”ہر بات کی وجہ سمجھ میں آنے لگے تو کوئی مشکل مشکل نہ رہے بہر حال آؤ۔۔۔“

”کچھ دیر انتظار کر لیں عباد بھائی! عالیہ بھی آتی ہوگی۔ مل کے چلتے ہیں بلکہ آپ اپنی بہن سمن سے بھی پوچھ لیجیے۔ اس کا دل بھی بہل جائے گا۔“

”میں نے سب کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔“ وہ بے طرح چڑ گئے۔ ”آخر تمہیں دے رہا ہوں سارے نمبر کو نہیں کہ اٹھ کر ساتھ چل دیں۔“

”زرتاب کو عجیب سا محسوس ہوا۔“

”چچا کے یہ بیٹے مزاج میں بھی تو کبھی ماشہ کی حیثیت سے مشہور تھے۔“

”آج کل گھر میں ان کی شادی کے تذکرے چل رہے تھے۔“

”زمینوں کا کام انہوں نے ہی سنبھالا ہوا تھا اور اباجی کے دست راست کی حیثیت سے مشہور تھے۔“

☆☆☆

”عالیہ! ایک بات تو بتاؤ۔“ وہ وارڈ روب سے ٹائیٹ سوٹ نکالتے ہوئے عالیہ سے مخاطب ہوئی۔ عالیہ اور وہ ایک ہی بیڈروم میں سوتے تھے۔

”یہ فصیح کی امی یعنی ہماری پھوپھی آج کل کہاں ہوتی ہیں اور اگر چیچ زندہ ہیں تو فصیح کو اپنے ساتھ شہر کیوں نہیں لے جاتیں۔ مجھے اس شخص کو دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے۔ وہ عمر جو کچھ بننے کچھ کر دکھانے کی ہوئی ہے وہ یہاں غلامی میں تباہ کر رہا ہے۔ تیرے میرے کے احکامات کے پیچھے بھاگنا، گھر کا سودا سلف، زمینوں کا حساب کتاب، ٹوٹی چیزوں کی مرمت کرنا اور آئے گئے کا خیال کرنا۔ یہ کام اس پرزب نہیں دیتے۔ اتنا توانا اتنا بھرپور جوان آدمی ہے۔ اس عمر کے مرد تو تعلیم سے فراغت پا کر کسی اچھی نوکری کی تلاش میں بھاگ دوڑ کر رہے ہوتے ہیں اور یہ ابھی تک بی اے کے پیپر نہ بھی نہیں دے سکا اور نہ ہی غالباً اسے اس بارے میں سوچنے کی فرصت ہے۔“

”ارے بابا! کیسے سوچے اس کے کام دھندے ختم ہوں تب نا۔“

عالیہ اگلے دن کے لیے انگلش لٹریچر کا لیکچر تیار کر رہی تھی۔ وہ رائٹنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی ہوئی تھی۔

”مگر گھر والے تو اس کے مستقبل کے بارے میں سوچ سکتے ہیں نا! اباجی، اماں جی، اس کے نانا نانی ہیں وہ بھی سکے۔ ان کا فرض بنتا ہے کہ اپنے لاوارث نواسے کے اچھے مستقبل کے لیے اس کی چیخ

مت میں رہنمائی کریں۔ اسے دوسرے درجے کے افراد کی طرح ذلیل مت کریں۔“

”تم اپنا ننھا سا دماغ اس مسئلے پر مت کھپاؤ میڈم! یہ بڑے گجھک اور پیچیدہ مسائل ہیں۔ اماں جی اور اباجی اس مسئلے پر کسی کی بات سننے کے روادار نہیں ہیں۔ دیکھتی نہیں ہوں دونوں کے رویے فصیح سے کس قدر تغیر آمیز ہوتے ہیں۔ اماں جی تو صاف کہتی ہیں کہ اسے دیکھ کر اپنی بیٹی کی بربادی کا نقشہ آنکھوں میں کھینچ جاتا ہے اور اباجی کا بس چلے تو اس کا خون پی جائیں۔ تم دیکھیں نہیں کہ جان بوجھ کر اس سے کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ اسے اس کے باپ کے گناہوں کی سزا دینے کے لیے۔“

عالیہ نے کتاب کا دوسرا صفحہ پلٹا۔

”مگر کیا جرم ہے اس کے باپ کا۔ یہی نا کہ اباجی کی بیٹی اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی اور ایسی دیوانی ہو گئی کہ اسے پانے کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا۔ اباجی نے کہا تھا اسے چھوڑ دیا مجھے چھوڑ دو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ بیٹی نے محبت پانے کے لیے باپ کو چھوڑ دیا اور یہاں سے بہت دور چلی گئی۔

”شادی کے کچھ عرصہ بعد فصیح کا باپ مر گیا اور طیبہ پھپھو موت سماجت کر کے فصیح کو اباجی کے سپرد کر کے خود روپوش ہو گئیں۔ اس سارے قصے میں فصیح کا کیا تصور نکلتا ہے۔ اباجی اور اماں جی کو طیبہ پھپھو سے شکایت ہوئی چاہیے نہ کہ فصیح اور اس کے مرحوم باپ سے۔“

”اس کی وجہ کیا ہے یہ تو میں نہیں جانتی مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اس گھر میں اس موضوع پر بات کرنا سخت ممنوع ہے۔ وہ طیبہ پھپھو کا حوالہ سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ نہ امی اور چچی پسند کرتی ہیں اور عباد بھائی کا تو تمہیں پتا ہے انہیں تو یوں بھی فصیح سے اینٹ کتے کا بیر رہتا ہے۔“

”مگر یہ غلط ہے عالیہ! جو کچھ بھی ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے۔ فصیح بے قصور اور غیر جانبدار ہے اس معاملے میں۔ اس کی زندگی کا کیریئر بیڑ تباہ کر کے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی جا رہی ہے۔ اس زیادتی کا کوئی ازالہ ہونا چاہیے۔“

”مثلاً کیا؟“ عالیہ غور سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔

”ہماری آنکھوں کے سامنے ایک شخص کا مستقبل دم توڑ رہا ہے عالیہ! کیا ہم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹھٹھنے لگی۔

”کیا مدد کرو گی اس کی؟ کیا اپنے ہسپتال میں وارڈ بوائے لگوادو گی! کیا کر دو گی۔ ایک بندہ جس کا لہاسے بھی مکمل نہیں ہے اور جس کے پاس کوئی ہنریافن بھی نہیں ہے اسے تم کہاں اور کس شعبے میں فٹ کر سکو گی۔“

”کچھ نہ کچھ تو بہر حال کروں گی۔“ وہ دل ہی دل میں اپنا ارادہ مضبوط کر رہی تھی۔

”مگر کس ناتے سے؟“ عالیہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”انسانیت کے ناتے سے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

☆☆☆

”فصیح! ادھر آؤ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔“

زرتاب نے پچھلے کھن میں پیڑ کے پاس کھڑے انہماک سے کچھ سوچتے فصیح کو اپنے پاس بلا یا تھا۔

”میں اس پیڑ کے مرجھائے ہوئے پتوں کو دیکھ رہا تھا۔“

”کبھی اپنی مرجھائی ہوئی زندگی پر بھی غور کیا ہے۔“ زرتاب کا لہجہ تیز اور ناراض تھا۔
”صبح نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر بہم سا مسکرایا مگر بولا کچھ نہیں۔“

”زندگی جیسی قیمتی چیز یوں بے کار گنوانے کے لیے نہیں ہوتی۔ یہ آزمائش کے لیے دی گئی ہے
ہر ایک کو اپنی اپنی توفیق اور استطاعت کے مطابق اس آزمائش پر پورا اترنا ہوتا ہے۔ پھر تم کنارے
کیوں کھڑے ہوا بھی تک۔ پار اترنے کے لیے چھلانگ کیوں نہیں لگاتے کیا سوچ کر خاموشی تان
بیٹھے ہو۔“

وہ اس کی ٹھیک ٹھاک کھپائی کرنے کے موڈ میں تھی۔

”میری خاموشی ہی میری عافیت ہے، زرتاب بی بی! کاش آپ سمجھ سکیں۔“ وہ کہیں دور ویکو
تھا۔

”میری مثال اس قیدی پر بندے کی سی ہے جس نے خود کو باور کرا دیا ہے کہ اس کے پر ہی نہیں
کہ وہ اڑ سکے۔ اسی لیے وہ اپنے سالم پروں کو پھڑ پھڑانے کا رسک نہیں لیتا۔ مبادا ایسا کرنے کے بعد
اڑ ان بھرنے کو جی چل اٹھے اور وہ بے قابو ہو جائے۔ انسان جب تک صبر کرتا ہے، سکھ میں رہتا ہے
صبر چھوڑ دو تو ایسی تڑپ جاگتی ہے کہ ایک ایک لمحہ گڑا رن عذاب بن جاتا ہے۔ اور میں اس عذاب میں
کو مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔“

زرتاب دم بخور رہ گئی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی وہ سطحی سوچ رکھتا ہے، گہرائیاں ناپنے کا فن نہیں جانتا
وہ تو جانتے زندگی کی کن پہنائیوں میں اتر کے سطح پر آیا تھا۔

”جب اتنا سمجھتے ہو تو یہ بھی مان لو کہ انسان ڈوبے یا تیرے اسے رسک تو بہر حال لینا ہی
ہے۔ بھلا کنارے پر کھڑے ہو کر کب تک رویا کا بہاؤ دیکھتے رہو گے۔ لہریں گتے رہو گے۔“

”آپ مجھے یہ سہانی نصیحتیں نہ کریں زرتاب بی بی! زندگی کے بارے میں سوچنا اور اسے خوش
زاویے سے دیکھنا آپ کے لیے آسان ہے مگر میرے لیے از حد مشکل ہے۔ آپ کا دماغ آزاد
میری سوچیں بندھی ہوئی ہیں۔ آپ کے خیالوں پر کسی کا پہرہ نہیں میری ہر سانس مشروط ہے۔“ وہ ہونہ
چبار ہا تھا۔

زرتاب مضطربانہ ہاتھ ملنے لگی۔

”آپ تو بس اچھی اچھی باتیں کیا کریں۔ اپنے جیسی نرم اور میٹھی۔“ یک لخت وہ کھل کر مسکرا
اور بغور اس کی صورت دیکھنے لگا۔

”تم سے کس نے کہا میں بہت نرم ہوں۔ ارے میں تو بڑی سخت اور روکھی پھسکی سی لڑکی ہوں۔“
”کس نے کہا۔“ وہ بے اختیار بولا۔ ”میری نگاہ اور دل تو ایسا نہیں کہتے۔“ باقی جملہ دل میں مکمل
کیا۔

زرتاب کو اس کی خود پر جی چمکتی ہوئی نگاہوں سے گھبراہٹ ہونے لگی۔

”ایک بات کہوں زرتاب بی بی؟“ وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

”ہاں کا کردار بہت فیئر ہونا چاہیے۔ ایک عورت کو اپنا وقار، اپنی عزت اور اپنے شفاف کردار کا
زیادہ خیال رکھنا چاہیے کیونکہ اس پر دھبہ پڑے گا تو آنے والی نسلوں کا غرور و فخر بھی اس سیاہی کی
بوجھ جائے گا۔ ایک لڑکی جب پیار پانے کے لیے اپنے گھر والوں سے بغاوت کرتی ہے اور انہیں چھوڑ
بھرتے نکلتی ہے تو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ جب وہ ماں بنے گی تو اس کا کیا اس کی اولاد کو کس کس موڑ پر
نہاؤں گے۔“

صبح کی نظر نیچی، چہرہ سرخ اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”ماں باپ خوش نام اور صحیح اطوار کے مالک ہوں تو اولاد سینہ تان کر معاشرے سے اپنا حق وصول
تی ہے، خود کو منوانی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو اولاد کا سر ہمیشہ جھکا ہی رہتا ہے۔ آپ کہتی ہیں میں زندگی
اپنا حصہ لوں اور میں کہتا ہوں زندگی نے مجھے جو دینا تھا وہ مجھے مل چکا۔ اس سے زیادہ میرا اس میں
نہیں ہے۔“

صبح کے پیروں میں چپل تھی اور وہ انگوٹھے سے اس کی سطح کرید رہا تھا۔

”صبح! ارے بھی کہاں مر گیا یہ چھو کر۔ جب کام کی باری آئے تو غائب ہو جاتا ہے۔ کونے
دروں میں گھس جاتا ہے۔ نکلتا نہیں کا۔“

چچی کی تیز جھپٹی ہوئی آواز پر صبح اس پر ایک تھکی ہوئی نظر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔

وہ کم کم کیفیت میں کھڑی کچھ سوچنے لگی۔

☆☆☆

”بھلے وہ تین سال بعد آئے یا تین ہزار سال بعد بس اتنا یاد رکھو ہرہ خاتون! وہ اس حویلی کی دہلیز
چھونے کی حق دار بھی نہ ہوگی۔ میں اسے یہ اختیار بھی نہیں دوں گا کہ وہ اس قصبے کی زمین پر قدم بھی
لگے۔ اس سے کہنا خود کو وہیں کہیں شہر میں غرق کر لے۔ لاہور چھوٹا موٹا شہر نہیں ہے۔ اسے بھی کہیں نہ
میں پناہ مل ہی جائے گی۔ آخر اتنا عرصہ بھی تو رہی ہے نا۔“

ہال کمرے میں اباجی کی گھن گرج نے جہاں بہت سوں کو متوجہ کیا وہاں ناشتے کے لیے نیچے آتی
باب کو بھی قدم اس طرف موڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے دیکھا ہال کمرے میں کوئی بھی نہیں جا رہا
سب آس پاس بظاہر کسی بے کار سے کام میں مشغول تھے۔

اندر صرف اماں جی اور اباجی تھے۔

”میں جانتا ہوں تم مجھ سے چھپ کر اس چھوکرے کے ساتھ جاتی رہی ہو اس سے ملنے۔ لیکن ایک
نہ کان کھول کر سن لو زہرہ! وہ اس گھر میں آئی تو میں زہرہ کھالوں گا۔“

”خدا نہ کرے۔“ اماں جی ہول کر رہ گئیں۔

”لیکن میری بات تو سنئے۔ وہ اتنے برن بعد باہر نکلے گی۔ پیسہ، دھپلا، روزی روٹی کہاں سے
رے گی وہ۔“

اماں جی کے لہجے میں منت تھی۔

”کیوں! اتنے سال سے جیل میں ہے۔ خوب بنی سیکھ گئی ہوگی زندگی گزارنے کے ڈھنگ۔“

اور بے تم و پکھنا چند سال بعد رہا ہو کر آئے گی تو کیسی ”گنوں“ والی بن چکی ہوگی۔ جیل میں کس نام پر عورتیں ہوتی ہیں تمہیں نہیں معلوم کیا! جرائم پیشہ، چرپی، شرابی، دھندے والی، جعل ساز، چور۔۔۔“

اباجی کے لہجے میں طنز اور خنکی تھی۔

زرتاب کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔

اس نے آہٹ پر گردن موڑ کر دیکھا۔ صبح نہ جانے کب سے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

سووے سلف کا بھاری تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ آنکھیں لہوڑ تھیں اور چہرہ خطرناک حد تک پیلا۔

اس نے اذیت کی تیز لہر کو دبانے کے لیے ہونٹ بھیج رکھے تھے۔ زرتاب کو اس بد قسمت ٹھٹھ جی بھر کے رحم آیا۔

تقدیر نے اس کے ساتھ کیا مذاق کیا تھا۔

غالباً وہ یہی بتانا چاہ رہا تھا کل۔

”معاشرے نے مجھے جو کچھ دینا تھا دے دیا۔ اس سے زیادہ میرے لیے اور کچھ بھی نہیں ہے۔

زرتاب کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھیں۔

”عالیہ! تم جانتی تھیں یہ سب۔۔۔؟“ اس نے موقع پاتے ہی اسے پکڑ لیا۔

”قسم لے لو جو گھر میں بھی ایسا ذکر بھی ہوا ہو۔۔۔“ وہ نگار نگارہ گئی تھی۔

”ہمیں تو یہی پتا ہے کہ طیبہ پیچھو کہیں روپوش ہو گئی تھیں۔ اصل حقیقت سے امی اور چچی لوگ واقف ہوں گے اماں جی اور اباجی کے علاوہ۔ لیکن وہ جیل کیوں گئیں؟ کس جرم میں اور اتنے

سارے سال۔ اوہ مائی گاؤ۔۔۔“

اب وہ اس پتھر میں بھی کہ صبح سے سچ اگھوایے۔

”کیا کریں گی آپ یہ سب کچھ جان کر۔“ صبح کا لہجہ سخت اور قدرے غصیلا تھا۔

”کیا کروں گی؟ ارے بھئی وہ میری سگی پیچھو ہیں۔ ان کے ساتھ جو بیتی ہے اس کو جانے کا

پورا حق حاصل ہے۔“

”تا کہ ن کر میری بے بسی اور لا چاری کا مزید مذاق اڑا سکیں۔“ وہ استہزاء سے گویا ہوا۔

اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ سنا ہوا تھا۔ شاید وہ یہ سب کچھ زرتاب سے چھپانا تھا، شومی قسمت کہ اباجی کی زبانی اس پر سب کچھ افشا ہو گیا۔

”پلیز فصیح! مجھے بتاؤ۔ طیبہ پیچھو کے ساتھ کیا ہوا۔ پلیز مجھے اپنا ہمدرد سمجھو اور ایک بات جا تمہارا ماضی کچھ بھی رہا ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ تم ہم میں سے ہو۔ تمہاری عزت اور وقار اتنا ہی اہم ہے کہ اس گھر کے کسی فرد کا تم خود کو اس گھر سے یہاں کے مکینوں سے الگ کیوں سمجھتے ہو۔ پلیز فصیح!

بتاؤ تا کہ صورت حال کو سمجھنے میں مدد ملے۔“

”کیا بتاؤں؟“ وہ ہار کر بولا۔ ”میرے پاس بتانے کو کچھ بھی اچھا نہیں ہے زرتاب بی بی۔“

اب وہ اس کی طرف پشت کر چکا تھا۔

”میرے والد کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ وہ شہر میں رہتے تھے۔ آپ کی طیبہ پیچھو اس زمانے سے ایف اے کر رہی تھیں۔ ابو ایک ہول میں منیجر تھے۔ کہیں اتفاق سے ان کی ملاقات ہو گئی اور بات پسندیدگی میں بدل گئی۔ اباجی نہیں مانے اور امی گھر چھوڑ کر ابو کے پاس آ گئیں، شادی پھر میں پیدا ہوا۔ میں اس وقت چھ سات سال کا ہوں گا جب امی ابو کے چھٹڑے انتہاؤں کو لگے۔ یہ چھٹڑے تو شادی کے ابتدائی سال میں ہی شروع ہو گئے تھے مگر اب مجھے بھی اس کے سمجھنے کی تھی۔ ایک دوسرے پر الزامات تم نے مجھے تباہ کیا، تمہاری وجہ سے میری زندگی برباد ہوئی۔ تم ہی کے آئی تھیں میرے پاس، تم نے ورغلا یا تھا مجھے وغیرہ وغیرہ۔

پھر ابو کی اور عورت میں دلچسپی لینے لگے۔ اس سے دوسری شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ امی نے آتش فشاں بن گئیں۔ آئے دن لڑائیاں مجھے یاد ہے اس روز ابو اپنے پہلو میں ایک سخی حسین عورت کو لیے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ اس نے سرخ کا مدار کپڑے اور ڈھیروں زیور لٹا تھا۔

امی اس وقت تیز دھار چھری سے سبزی کاٹ رہی تھیں۔ انہوں نے پتھرائی ہوئی نظروں سے چہرہ اور پہلو میں دہن لیے کھڑے ابو کو دیکھا پھر ہر منظر ان کی نظروں میں دھندلا گیا۔ چھری بے زنجی وہ انھیں۔ چھری والا ہاتھ پشت پہ تھا۔ ابو کے قریب آئیں۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ چھری سیدھا ابو کے پیٹ میں اتار چکی تھیں۔ ابو کے لیے یہ افتادنا گہانی جب تک سمجھ پاتے زخمی ہو کر گر چکے تھے۔

”میں نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے عبدالاحد! میں نے کہا تھا نا میں ساری کشتیاں جلا کر تمہارے پاس دوں۔ واپسی کا ہر دروازہ بند کر کے۔ اگر تم نے مجھے دھوکا دیا تو میں تمہاری جان لے لوں گی اور اس

ماجیرا گھر برباد کرے گی۔“ وہ وحشت کے عالم میں بول رہی تھیں۔

وہ خاموش ہو گیا۔

”پھر کیا ہوا۔۔۔؟“ زرتاب نے جھر جھری لے کر پوچھا تھا۔

”پھر کیا ابو موقع پر دم توڑ گئے۔ وہ عورت تھانے چلی گئی۔ امی کو گرفتار کر دوا یا۔ مقدمہ چلا۔ امی ان کے لواحقین کا یہ لیا گیا تو انہوں نے جانے کیا سوچ کر اس حویلی کا انڈر لیس وے دیا۔ اباجی اور ماموں کو انڈر لیس پر۔ اماں جی اپنی بیٹی کو سلاخوں کے پیچھے دیکھ کر نیم پاگل ہی ہو گئی تھیں۔

بڑے ماموں نے اونچا وکیل کروا کے امی کو سزائے موت سے نوبالیا مگر عمر قید مع جرمانہ بہر حال انقدر ٹھہری۔ جرمانہ اباجی نے ادا کر دیا تھا۔

بڑے ماموں کے اصرار، اماں جی کی آہ و زاری اور چھوٹے ماموں کی رضامندی کے بعد اباجی ناخواتر مجھے جیل سے گھر لے آئے۔ ایک اور بڑی جیل میں جہاں میرا جسم تو آزاو ہے مگر روح قید

”اس نے گہری سانس خارج کی تھی۔ وہ ابھی تک اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔

زرتاب دھڑک دھڑکے چلتی اس کے سامنے آئی تو دھک سے رہ گئی۔

وہ اونچا لمبا کڑیل مرو آنسوؤں سے رو رہا تھا۔

تقدیر نے کیا کاری دار کیا تھا اس پر۔

”میں ہر ماہ ان سے ملنے جاتا ہوں۔ کبھی بکھارا ماں جی بھی چھپ کر میرے ساتھ چلی جاؤ۔ پچھلی ملاقات میں امی نے بتایا کہ ان کے اچھے چال چلن اور جیل میں عورتوں کو پڑھانے کے باوجود حکام نے ان کی سزا میں دو سال کی تخفیف کر دی ہے۔ یعنی اب وہ تین سال بعد رہا ہو گی۔“ وہ دھیرے سے گالوں پر بے پانیوں کو تھیلی میں چن کر ایسے ہو گیا جیسے کبھی یہ دل مرد نہ ہو۔

”میں تو کہتا ہوں کیا ضرورت ہے رہا ہو کے آنے کی، وہیں رہیں۔ اس دنیا میں اب ان کیار کھا ہے۔“ وہ بے رحمی سے بولا۔

”بہت بری بات ہے! تم اس درجہ مایوس اور بد دل کیوں ہو۔“

”آپ میری جگہ ہوئیں تو میں آپ سے پوچھتا۔“ وہ سنجی سے بولا۔

”جانتے ہو میری تمہاری جگہ ہوتی تو کیا کرتی؟“

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس کے انداز میں ارادے کی شفاف چمک نمایاں تھی۔

”میں تمہاری جگہ ہوتی تو بھی دنیا کی باتوں کی پروا نہ کرتی، بھلے وہ آپ کو ایک قاتلہ ماں دھوکے باز عیاش باپ کی اولاد کہتی رہتی۔“

وہ سرخ طنز یہ نگاہیں اس پر گاڑ کے بولا۔

”کسی کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل بات اپنے ضمیر کے سامنے بہادری سے کھڑا ہونا۔“

تم ضمیر کی عدالت میں قصور وار نہیں ہو تو دنیا سے ڈرنے یا ان سے چھپ کر پس منظر میں چلے جا کوئی ضرورت نہیں۔ جب میں جاتی ہوں کہ میں نے غلط کام نہیں کیا اور میں کسی طرح بھی بچ

ٹھہرتی ہوں تو میں دنیا کی باتوں کو سوچ کر اپنے دل کو تکلف نہیں پہنچاؤں گی بلکہ حوصلے کے ساتھ دیکھوں گی۔“

”صحیح کی سوالیہ نگاہ اس پر جمی رہیں۔“

”اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو میں سب سے پہلے معاشرے میں ایک باعزت مقام حاصل کے لیے جدوجہد کرتی۔ جس کا سب سے اہم اور اولین ذریعہ تعلیم ہے۔ تعلیم مکمل کر کے ایک اچھی

”بہت خوب۔“ وہ حد ورجہ تلخی سے اس کی بات کاٹ کر گویا ہوا۔

”اپنے بیک گراؤنڈ میں اتنی ساری خوش نماؤ گریاں اور سرٹیکٹ سجا کے میں اس معاشرے

باعزت مقام حاصل کر سکتا ہوں۔ کیا مذاق ہے۔ کیا لطیفہ ہے۔ یہ میرا بھیا تک ماضی اور اس کے دار

پچھا نہیں کریں گے؟ کیا معاشرے میں عزت حاصل کرنے دیں گے؟ محترمہ زرتاب صاحبہ! کس مستقبل کی بات کر رہی ہیں۔ ہونہ۔“ وہ طنز اسر جھٹکنے لگا۔ جیسے کسی چھوٹی بچی نے بچکانہ

کہہ دی ہو۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔“ وہ زور سے چلائی تھی۔

”بہت کچھ ہوتا ہے اس دنیا میں۔ لیکن سب ریت پہ لکھا نقش ثابت ہوتا ہے جو وقت کی اگلی ہی تیز

پاؤں جاتا ہے۔ جب کسی قابل بن جاؤ گے تو کوئی نہیں پوچھے گا تم سے تمہارا بیو بیٹا۔ سب مرتے

نات کو سلام کرتے ہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو اس شہر میں نہ سہی کسی دوسرے شہر میں جا کر جاب کر لو،

لہرے لو کرائے پر۔ امی جیل سے رہا ہو کہ آئیں گی تو انہیں بھی خاموشی سے وہیں لے جانا اور نئے

سے زندگی شروع کرنا وہاں کوئی تمہارے ماضی کو نہیں جان سکے گا جب تک کہ تم خود منہ سے نہیں

کہو۔“

وہ خاموش ہو گئی۔

”فصیح بہت دیر تک مسمرائز ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ یک ٹک اسے دیکھتا ہوا جانے خیال کے گھوڑے کہاں کہاں دوڑا رہا تھا۔

”اور۔۔۔ اگر۔۔۔ بہت دیر بعد اس نے آہستگی سے سوال کیا۔

”اگر کسی جاننے والے سے آنا سامنا ہو گیا تو۔۔۔؟“

اس کے انداز سے واضح تھا کہ زرتاب کا آئیڈیا سیدھا اس کے دل کو لگا تھا۔

”تو کیا ہوگا؟“ وہ سختی سے پوچھنے والی کے طے جملے انداز میں بولی۔

”تمہارا کیا خیال ہے کوئی آشنائے گیا تو وہ تمہارے گھر کے آگے مجمع لگا کے چیخ چیخ کر لوگوں کو

ی اور تمہاری امی کی اصلیت بتائے گا؟ ارے کچھ بھی نہیں ہوگا بے وقوف آدمی! وہ تم سے سلام دعا

لے گا یا زیادہ سے زیادہ طنز کرے گا اور اپنی راہ لے گا اور یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے جس پر گہری

”چاکی جائے۔“

”پھر بھی آخر کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو پتا چل سکتا ہے جہاں میں رہوں گا یا جاب کروں

۔۔۔“

وہ متذبذب تھا۔

”بے شک دنیا اتنی بڑی نہیں ہے مگر اب اتنی چھوٹی بھی نہیں ہے کہ ہر دوسرے موڑ پر آپ کو جان

نا کا بندہ ٹکرا جائے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ بدنام زمانہ لوگ ایک محلے سے اٹھ کر دوسرے محلے میں

نہیں تو اپنی نئی شناخت اور مقام بنا لیتے ہیں اور لوگ بلا جیل و جنت کے اس پر یقین بھی کر لیتے ہیں

پھر تم تو شہر میں بدل لو گے ایسا کرنا اسلام آباد یا پنڈی جا کر رہائش پذیر ہو جانا۔ اور یوں بھی آج کل تو

اے کو ہمسائے کی خیر خبر نہیں ہوتی تم شہروں کی بات کرتے ہو، کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تمہیں صرف اور

نہ ایک مضبوط ارادے اور ایک بھرپور مقصد کی ضرورت ہے۔“ فصیح بے یقینی سے اس کی طرف

”ٹھیک۔“

”اچانک ہی آرو گردو کے سارے منظر صاف ہو گئے تھے۔ سوچوں پہ لگے جالے ہٹ گئے تھے اور

”آپ نے تو اپنی باتوں سے مجھے مسحور ہی کر ڈالا زرتاب بی بی! میں خود کو کسی دوسرے سیارے

”اگر بالفرض اسے گھسیٹ گھسیٹ کر کھڑا کر بھی دیا تو کہاں تک چل پائے گا، وہ اب یہ تو نہیں
 تاکہ لہ دین کے چراغ کا جن دنوں میں اس کی حالت بدل دے اور پھر تمہارے مقابل آنے تک
 بہت وقت لگے گا اور تم مزید انتظار کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ اباجی آج کل میں تمہارا عباد بھائی سے
 یہ پکا کرنے والے ہیں۔ پھر کیوں ایک سادہ دل انسان کو آس دلا کر اسے عمر بھر کے لیے ملال بخشی
 “

”شٹ اپ عالیہ۔“ وہ اشتعال سے کانپنے لگی۔
 ”نہ میرا فتیخ سے ایسا کوئی ریلیشن ہے اور نہ عباد بھائی کے سلسلے میں میرا کوئی رجحان ہے۔ کہہ دینا
 ا جی سے۔“ وہ بری طرح ہونٹ چبا رہی تھی۔
 ”وہ تو جب مجھ سے تم سے پوچھیں گی تب ہی بات ہوگی مگر جو میں پوچھ رہی ہوں اس کا تمہارے
 ن کیا جواب ہے؟“ عالیہ سابقہ پرسکون موڈ میں تھی۔
 ”اس کا اور تمہارا کوئی میل نہیں زرتاب! یہ بھی ممکن نہیں ہو سکے گا۔“
 ”میرا دماغ ابھی اتنا خراب نہیں ہوا۔“ وہ گھور کر عالیہ کو دیکھنے لگی۔
 ”اگر نہیں ہوا تو بہت اچھی، بہت ہی اچھی بات ہے اور اگر ایسے کسی چور جذبے نے خفیہ طریقے
 سے تمہاری سوچوں تک سرنگ بنائی ہے تو اس جذبے کو فوراً ختم کر دو، پنپنے سے پہلے ہی اس کا گلا گھونٹ
 داسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“
 ”اگر تم نے دوبار ایسی بات کہی تو میں تمہاری صورت نہیں دیکھوں گی آئندہ۔“ وہ غضب ناک ہو
 گئی۔

”اوکے، اوکے بابا! میں سمجھ گئی۔“ عالیہ ہاتھ اٹھا کر مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”بی بی
 خدمت خلق! جو بھی کرنا اپنا دامن بچا کر کرنا۔ اچھا آؤ ذرا باہر کا ایک چکر تو لگا کے آئیں۔ آج میں تمہیں
 اپنی ڈرائیونگ کے جوہر دکھائی ہوں۔“
 ”کیا تم نے ڈرائیونگ سیکھ لی؟“

”اور کیا یار! عباد بھائی کی تھوڑی سی منت خوشامد کے بعد ان سے ڈرائیونگ کی الف بے کی
 ٹریننگ لے لی۔ تم بھی ان سے سیکھ لو نا۔ تمہیں تو وہ خوشی خوشی سکھائیں گے۔“
 عالیہ نے شرارت سے ایک آنکھ بند کی، زرتاب نے غصے سے کشن اٹھا کے دے مارا تھا۔

☆☆☆

”بہار کا موسم کیا ختم ہوا قہر بھرا موسم گرما جاں کو آ گیا۔ سردیاں کھرا آلودہ ہوتی ہیں اور گرمیاں قہر آلود،
 کیا بات ہے بھئی۔“

عالیہ قہقہہ پیٹے ہوئے خود ہی اپنی بات سے محظوظ ہوئی تھی۔ وہ سینے میں شرابور ہو رہی تھی۔
 ”وہ جو تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں تمہاری یہ بھٹکے اڑانی حالت دیکھ لیں تو شاید دروازے سے ہی
 پلٹ جائیں۔“

کمن نے ناک چڑھا کر عالیہ کو دیکھا تھا۔

سے آیا ہوا تصور کرنے لگا ہوں۔ یوں لگ رہا ہے کہ اتنا عرصہ میں کسی تاریک دنیا میں صبح و شام
 ہوں آج زمین پر آیا ہوں اور قدم جمار ہا ہوں۔“

وہ بہت ہلکے ہلکے انداز میں مخاطب تھا۔
 ”یاد رکھو ایک بار پھر۔“ وہ مڑتے مڑتے دوبارہ بولی۔
 ”زندگی یوں بے کار گنوانے کے لیے نہیں ہوتی۔“
 ”صحیح کہا آپ نے۔“ وہ صدق دل سے بولا۔
 ”یہ تو آپ جیسی چیز کو حاصل کر کے دل میں چھپانے کے لیے ہوتی ہے۔“ یہ جملہ اس
 میں کہا تھا۔

☆☆☆

”تم کیا کر رہی ہو زری! کن چکروں میں پڑ گئی ہو۔ جانتی ہو اباجی یا گھر کے کسی اور
 بھٹک بھی پڑ گئی تو تمہارے ساتھ اور صبح کے ساتھ کتنا برا ہوگا۔“ وہ بی اے کی انگلش لٹرچر کی بک
 کی سہری بنا رہی تھی۔ جب عالیہ نے کڑے تیور لیے اسے مخاطب کیا تھا۔
 ”جو راستہ تم اس کو دکھا رہی ہو وہ تمہارے لیے بھی خطرناک ثابت ہوگا اور اس کے لیے بھی
 اب وہ پریشانی کے عالم میں اس کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔
 ”ارے بھئی پیچھے ہٹ کر بیٹھو۔ بلا دیا ناچین۔“
 ”جہاں بیٹھ کر بھی بات کروں گی یہی بات ہوگی آج۔“ عالیہ نے اس کے ہاتھ سے رجز
 سائیڈ پر رکھ دیا۔

”تم کیوں اباجی اور چچا لوگوں کی مخالفت میں چل رہی ہو۔ جانتی ہو گھر میں فصیح سے
 نفرت آمیز سلوک کیا جاتا ہے؟“ وہ اسے ڈپٹ رہی تھی۔
 ”اور تم ہو کہ صاحب کا مستقبل سدھارنے کی فکر میں ہلکان ہو رہی ہو۔“
 ”میں کچھ نہیں کر رہی۔ میں نے تو صرف راستہ دکھایا ہے۔ اس پر چل تو وہ رہا ہے۔“
 ”مگر تم ہر قدم پر اس کا ساتھ دے رہی ہو۔“

وہ خفگی سے زرتاب کو گھورنے لگی۔
 ”اگر یہ غلط ہے تو یہ غلطی میں کر رہی ہوں لیکن بغیر کسی لالچ یا فائدے کے، ایک قدم
 آنکھوں کے سامنے ضائع ہو رہا تھا۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو۔ اباجی ایک مرد کا سہارا
 عورت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عورت ٹوٹے ہوئے ٹپڑا
 گرے ہوئے مرد کے کچے حوصلوں کو جمع کر کے اسے پھر سے تناور درخت بنا دیتی ہے۔“ زرتاب
 ٹھوس تھا۔ عالیہ غور سے اسے دیکھنے لگی۔

”تمہاری کیا دلچسپی ہے اسے تناور درخت بنانے میں، سچ بتاؤ؟“
 ”حد ہو گئی قسم سے۔“ وہ بری طرح تپ کر کرسی سے اٹھی تھی۔ مگر عالیہ پر اس کے بھڑکے
 اثر نہیں ہوا۔

”کچھ خبر تو رکھتیں۔ کہیں ایسے دیسے کے ساتھ نہ رخصت کر دیں۔“ زرتاب کو پریشانی لاحق

ہوئی۔ ”جو میری قسمت میں ہوگا اس سے فرار بہر حال ممکن نہیں ہوگا، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“
”خدا کرے اچھا ہی دیکھنے کو ملے۔“ زرتاب نے دعا کی۔

☆☆☆

عالیہ کی متغنی دھوم دھام سے کی گئی تھی، یہاں کے رواج کے مطابق لڑکے دالوں کی ساری برادری اور ابا جی اور اماں جی کے پچاس ساٹھ جاننے والے رشتہ داروں اور دوست احباب کو بمعہ فیملی دعوت دی گئی تھی۔

شام ہی سے لڑکیوں بالیوں نے ڈھولک سنجال لی تھی اور زرتاب حسب عادت اس دھوم دھڑکے والے پنجابی گانوں کے شور سے بچنے کے لیے پچھلے صحن میں پناہ لے چکی تھی۔
”کیا بات ہے۔ آپ یہاں آکر کیوں بیٹھ گئیں؟“ فصیح اسے ڈھونڈتا ہوا پچھلے صحن میں آیا تھا۔ وہ بانٹا تھا وہ اسے یہیں ملے گی۔

”مجھ سے شور برداشت نہیں ہو رہا تھا۔“

”کیا آپ کو شادی بیاہ کے گانے پسند نہیں ہیں؟“ فصیح نے بغور اس کا سراپا دیکھا۔

”سناہنیش کے سوٹ میں اس کا چہرہ کم روشنی میں بھی دمک رہا تھا۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا۔۔۔؟“ وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

”آپ رضوان صاحب کی شادی پر بھی یہیں آکر چھپ گئی تھیں۔ میری اور آپ کی بالمشافہ

ملاقات یہیں ہوئی تھی۔“

”اوہ۔۔۔“ اسے سمجھ میں نہ آیا اس بات کا کیا جواب دے۔

”تمہارے بی اے کے پیپر ز کیسے ہوئے؟“

”بہت اچھے، اکنائکس کا تو بہت ہی اچھا ہوا، اور انگلش لٹریچر کی تو ساری تیاری آپ نے ہی کروائی تھی۔ ویسے پرچے دیتے ہوئے مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ اٹھائیس سال کی عمر میں بی اے کے امتحان میں بیٹھنا بہر حال ایک پرمزاح تجربہ ہے۔“ وہ ہنس پڑا۔

”مجھے امید ہے تم بہت اچھے نمبروں سے بی اے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اب زلزل کا انتظار نہ کرو اور ایم اے اکنائکس کا کورس شروع کر دو۔ اگلے سال تمہیں پارٹ دن اور پارٹ نوڈ دونوں کے پیپرز اکٹھے دینے ہیں۔ یہ تمہاری ول، تمہاری محنت اور ہمت کا امتحان ہے۔ مشکل تو بہر حال پیش آئے گی مگر مجھے یقین ہے یہ سال گزرتے دیر نہیں لگے گی اور تم خود کو ثابت کرنے میں ضرور کامیاب رہو گے۔“

اور فصیح نے اس کی امیدوں پر پورا اترنے کے لیے جان لڑادی۔ اس کی اتنی بے رنگ، پھیکٹی اور دیوان زندگی میں یہی تو ایک پُر بہار درجہ تھا۔

وہ اس کے لیے سرتاپا بہار کی علامت تھی۔ جیسے بہار آتی ہے تو ہوائیں ٹھنڈی پہنچاتی ہیں۔ وہ اس

”کیوں کیا ان کے ہاں گرمیاں نہیں آئیں یا انہوں نے بچن میں بھی اسے سی لگوار کر ہیں؟“

عالیہ تنک کر بولی۔

”یہ تو اب تم ان ہی سے پوچھنا۔ بائی دادے چھکا چک ٹرین سے آرہے ہیں یا اپنی گاڑی استعمال کریں گے۔“

”ابھی دائر لیس پہ رابطہ کر کے پوچھتی ہوں۔“ عالیہ فرمانبرداری سے برجستگی کا مظاہرہ کر گئی۔
”مٹن کڑا ہی کے لوازمات جمع کرتی زرتاب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ سمن نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔ یوں بھی آج کل حد سے زیادہ چڑی ہو رہی تھی۔ رضوان سال بعد ایک ماہ کی چھٹی گزار کر پھر واپس امریکہ چلا گیا تھا۔ اسے ساتھ لیے بغیر اس کی پڑھائی مکمل نہیں ہوئی تھی۔

انتظار کی آگ میں جلتی سمن کے لیے آنے والی تنہا اور انتظار سے بوجھل گھڑیاں مزید طو اور مہیب ہو گئی تھیں۔ وہ دن بھر بے قرار اور بے چین پھر کرتی۔ راتوں کو نیند کی گولیاں لے کر سوتی تھی۔

”بہت غصہ آ رہا ہے مجھے تمہارے بھائی پر۔“ وہ پلٹ کر خواہ زرتاب سے الجھ گئی تھی۔

”لو سنا تمہندیں بھابیوں پر حاوی رہا کرتی ہیں۔ یہاں بھابی مند کے کان کتر رہی ہے۔“ عالیہ نے ٹھٹھا لگایا۔

”اب وہ پڑھائی مکمل کر کے لوٹے گا مائی ڈیر بھابی سمن جی!“ زرتاب نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

”یہ پڑھائی تو میری سوتن ہی بن گئی ہے۔“ وہ پیر پختی بچن سے باہر آ گئی۔

”بے چاری۔“ زرتاب کی افسوس بھری نظروں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ ”میرا بس چلے تو رضوان بھائی کو کان سے پکڑ کے لے آؤں۔ میں اسی لیے اتنی جلدی شادی کے حق میں نہیں تھی۔ میں چاہتی تھی پہلے رضوان پڑھائی مکمل کر کے وطن واپس آجائے اور یہاں آکر سیٹل ہو جائے تو شادی کا سلسلہ شروع ہو۔ مگر ابا جی اور اماں جی کو بے اعتباری تھی۔ بے وجہ اس غریب کی سیدھی سادی زندگی کو انتظار اور اضطراب کا نمونہ بنا دیا ہے۔“

”خیر ان صاحبہ کو کبھی خوب ہی آفر آئی ہوئی تھی۔ بس نہیں چل رہا تھا کل کی ہوتی آج ہو جائے اب بھگتے جلد بازی میں کی گئی شادی کا خمیازہ۔“

عالیہ صاف گوئی سے بولی۔

”یہ جو تمہیں دیکھنے آرہے ہیں یقیناً ابا جی یا اماں جی کے جاننے والے ہوں گے۔“ زرتاب۔ بات کا رخ بدلا۔

”ظاہر ہے۔“ عالیہ انہماک سے شامی کباب کی ٹکیاں بنا رہی تھی۔

”لڑکا کیا کرتا ہے۔۔۔؟“

”یہ بھی ابا جی یا اماں جی کو ہی معلوم ہوگا۔“ عالیہ نے کندھے اچکائے۔

کے دل کی ٹھنڈک تھی۔

بہار آتی ہے تو پھول رنگ اور خوشبو نکھرتے ہیں۔ وہ اس کی سوچوں کے آئینے کا پھول تھی۔
بہار آتی ہے تو نرم گرم سی دھوپ سارے منظر روشن کر دیتی ہے۔ وہ اس کی سرود و برقی صحوں کی
تروتازہ اور حرارت بخش دھوپ تھی۔
وہ صرف اس کا تصور کر کے بٹاش ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

”پہلے تو تم اپنی تنخواہ میری ہتھیلی پر رکھا کرتی تھیں۔ اب اتنے عرصے سے ایک دھیلا بھی نہیں دیا
کیا کرتی ہو اتنے پیسوں کا۔۔۔؟“
اماں جی بہت غور سے زرتاب کی صورت دیکھ رہی تھیں۔ وہ اپنے پلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھی
تھیں۔ انہوں نے عالیہ کے ہاتھ پیغام دے کر زرتاب کو بلایا تھا۔
زرتاب کو ان کی نفی نشی نظروں اور جارحانہ لب و لہجے سے خوف آنے لگا۔
”وہ اماں جی! اصل میں چیک ملتا ہے نا۔ میں وہیں سے اپنے بینک میں جمع کرا دیتی ہوں۔“
ہٹکا کر بولی۔
”تو پھر فصیح کی کتابوں اور امتحان میں بیٹھنے کے لیے داخلہ فیس کون جمع کراتا ہے۔“

اماں جی بہت گہری نظروں سے اس کا چہرہ ٹٹول رہی تھیں۔
زرتاب پسینے میں نہا گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ تاہم کچھ دیر بعد اس نے خود
سنبھال لیا۔

”لو بتاؤ ہماری ناک کے نیچے کھیل کھیلا جاتا رہا اور ہم بے خبر رہے شک تو مجھے بھی کئی بار ہوا تھا کہ
وہ بد بخت بہانے بہانے سے تمہارے گرد منڈلاتا رہتا ہے مگر تمہارے مزاج اور رکھ رکھاؤ کو دیکھتے ہوئے
میں نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا تھا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے اماں جی! میں نے صرف ہمدردی کے نائے اس کی مدد کی ہے تاکہ
کچھ بن جائے۔ اپنے لیے کچھ کر سکے۔“

”اس نے جو بنا تھا وہ بن چکا۔“ وہ درشتی سے بولیں۔ ”وہ کچھ بھی بن جائے رہے گا ہمارے
قدموں کے نیچے۔ کون سی پٹیاں پڑھانے چلی ہو اسے بی بی! اہوش کے ناخن لو۔ اگر یہ صرف
ہمدردی ہے تو عباد کے رشتے سے انکار کیوں کر رہی ہو؟ بہانے بہانے سے ٹال رہی ہو نہیں۔
اب تو تمہارا اسپشلا نریشن بھی ہو گیا۔ اب کیا رکاوٹ ہے بولو؟“ وہ ان کے لہجے کی سختی سے
خائف ہو گئی۔

اماں جی۔۔۔! کچھ دیر بعد وہ جھکتے ہوئے ان سے مخاطب ہوئی۔

”میری بات چھوڑیں۔ صرف فصیح کی بات کریں۔ اماں جی! وہ آپ کا نواسہ بھی تو ہے۔ صرف
میبہ پھپھو کے شوہر کا بیٹا نہیں ہے، طیبہ پھپھو کا بھی بیٹا ہے۔ اور پاپا بتایا کرتے تھے کہ آپ طیبہ پھپھو
ب سے زیادہ چاہتی تھیں۔ بہت لاڈلی بیٹی تھی وہ آپ کی۔ پھر ان کی نشانی، ان کی اولاد کے ساتھ آنا

خاترات آمیز سلوک کیوں؟“ اماں جی کے کلیجے پر ہاتھ پڑا تھا۔

”مرگئی میرے لیے وہ۔۔۔“ وہ بھرائی ہوئی ناراض آواز میں گویا ہوئیں۔

”مرگئی ہیں تو پھر چوری جیسے ان سے ملنے جیل کیوں جاتی ہیں؟“ اس کی بات سن کر اماں جی کا چہرہ
دھواں دھواں ہو گیا۔ ان کے ہاتھ واضح طور پر کانپنے لگے۔

”ہمیں تو مار ہی دیا ہے اس نے۔ گھر چھوڑ کر شادی کرنا کیا کم رسوائی تھی جو اس کو قتل کر کے جیل کی
سلاخوں کے پیچھے عمر برباد کر کے ہماری رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی۔“

”تو آپ نے ان کی ضد پر ان کی خود شادی کیوں نہ کرائی۔“ اس نے جرح کی۔
”ہم سمجھ رہے تھے گھر چھوڑ جانے کی دھمکی سن کر وہ خاموش ہو کر بیٹھ جائے گی، مگر وہ تو سچ سچ
ہمیں چھوڑ گئی۔ ہمارے مقابلے میں اس شیطان کو چن لیا، کیا ملا، خود بھی تباہ ہوئی اور ہمیں بھی منہ
دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ اس لڑکے کو دیکھتی ہوں تو اپنی بیٹی کی بربادی کا زخم پھر سے تازہ ہو جاتا
ہے۔“

”جو سلوک آپ لوگ فصیح سے کر رہے ہیں، یہ تو طیبہ پھپھو کو مزید برباد کرنے اور ظلم ڈھانے کے
مترادف ہے۔ ان کا لاڈلا بیٹا یہاں ملازموں سے بدتر حالت میں پڑا ہوا ہے۔ ملازموں کو تو پھر مہینے بھر
بعد تنخواہ مل جاتی ہے اس بے چارے کو یہ آسرا بھی نہیں۔ اگر میں نے اس کی ضرورتیں دیکھ کر چند ہزار
اسے دے دیے تو آپ کو اتنا ناگوار گزرا کہ آپ نے اٹلے سیدھے الزامات کی بوچھاڑ کر دی؟“ اب کے
اماں جی خاموش رہیں۔

”آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ وہ کمپری اور بے بسی کے عالم میں آپ کے پاس کیوں چپکا
ہوا ہے۔ وہ جوان ہے۔ عاقل و بالغ ہے۔ ہاتھوں پیروں میں طاقت ہے۔ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ وہ
یہاں سے جانا چاہتا تو اسے کون روک سکتا تھا۔ وہ یہاں رہنے کا پابند تو نہیں تھا وہ صرف آپ سے
وابستگی، آپ سے محبت اور رشتے کے مان کی خاطر آپ سے جڑا رہا۔ آپ کا کیا خیال ہے آپ نے
اسے قید کر رکھا ہے؟ یا اگر وہ یہاں سے گیا تو اسے کہیں پناہ نہیں ملے گی؟ آپ کی غلط فہمی ہے اماں
جی! وہ کہیں سے بھی اپنی زندگی شروع کر سکتا تھا مگر اس نے اپنوں کے ساتھ کو ترجیح دی۔ وہ کوئی لڑکی
تو نہیں تھا جسے زمانے کی گرم ہوا مر جھا دیتی؟ مرد کے لیے اس دنیا میں بڑی جگہ ہے اماں جی! اس کا
ماضی کچھ بھی رہا ہوا ہے بھولنے میں یہ دنیا بس چار دن ہی لگاتی ہے۔ ہاں لڑکی کا معاملہ البتہ الگ
ہے۔“

”بہت بولتی ہو تم، بہر حال تم اس لڑکے کے معاملے سے دور ہی رہو تو بہتر ہوگا۔ خواہو اپنے ابا
جی کے عتاب کو دعوت نہ دو اور عباد کے رشتے کے لیے۔۔۔“

”پلیز اماں جی! رضوان کو تو آنے دیں۔ میرا ایک ہی تو بھائی ہے اس بھری دنیا میں۔ کیا میری
منگی یا شادی اپنے سب سے قریبی خونی رشتے کی غیر موجودگی میں ہو سکتی ہے؟“

اس نے بہت سوچ سمجھ کر جذباتی بلک میلنگ کا یہ نکتہ استعمال کیا تھا جو بہر حال کارگر ثابت ہوا۔
”ٹھیک ہے اب کے رضوان آیا تو اس کے آتے ہی تمہارا فرض ادا کر دوں گی۔ غضب خدا کا اپنی

عمر تو دیکھو۔ اس عمر میں تو لڑکیاں دودھ بچوں کی مائیں بن جاتی ہیں۔ ارے دقت گزر گیا تو کوئی نہیں پوچھے گا لڑکی؟“
 ”اچھا اماں جی!“ وہ خطرہ ملتے ہی شکر کرتے اٹھ کھڑی ہوئی، اب اسے رضوان کی لمبی مدت تک واپس نہ آنے کی دعا مانگتی تھی۔

☆☆☆

”یہ کیا غضب ہو گیا بھی میں تو تمہاری اس قدر عادی ہو گئی ہوں کہ سونے سے پہلے تمہیں سارے دن کی کھانا سالوں تو چین نہیں پڑتا۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے سوتی ہوں۔“
 عالیہ بری طرح بوکھلا گئی تھی۔

”یہ عادت تو تمہیں یوں بھی بدلنا ہی تھی۔ شادی کے بعد تو بہر حال میں تمہاری یہ خدمت نہیں کر سکتی تھی۔ چند ماہ کی تو بات ہے۔ پھر تم اپنے نئے گھر روانہ ہو جاؤ گی۔“
 زرتاب سوٹ کس میں احتیاط سے اپنے کپڑے رکھ رہی تھی۔

”ارے تمہیں ذرا دکھ نہیں ہو رہا یہاں سے جانے کا؟“ عالیہ نے تپ کر اس کے ہاتھ سے ہینگر چھین لیا۔

”کیا کروں، سرکاری آرڈر آیا ہے۔ ٹرانسفر ہوا ہے میرا، نوکری میں ایسا تو بہر حال ہوتا رہتا ہے۔ کوئی نئی بات تھوڑی ہے جس پر حیرت کے سمندر میں غوطہ لگانے لگوں۔“ وہ پرسکون انداز میں پیکنگ کرتی رہی۔

”تم سرکاری نوکری چھوڑ کر اپنا ذاتی کلینک کیوں نہیں سیٹ کر لیتیں؟ یہاں ویسے بھی اچھے کلینک کی کمی ہے۔“

”وہ بعد کا منصوبہ ہے۔ فی الحال تو نوکری کروں گی۔“
 ابا جی اور اماں جی بڑی مشکل سے اسے اکیلا بھیجنے پر راضی ہوئے تھے۔ نوکری چھوڑنے پر بھی حتی الوسع زور ڈالا گیا۔

عباد بھائی بہت مشتعل نظر آ رہے تھے۔
 ”آخر کیا چاہتی ہو تم؟“ وہ غصے کے عالم میں اس کے پاس چلے آئے۔
 ”کیوں خواہ مخواہ معاملہ لگا رہی ہو۔ واضح جواب کیوں نہیں دیتی ہو؟“
 ”کیا جواب دوں۔ یہ تو بڑوں کے معاملے ہیں، یوں بھی ابھی رضوان واپس نہیں آیا۔ وہ آجائے نبات آگے بڑھے گی۔۔۔“

وہ مصلحت سے کام لینے پر مجبور تھی۔
 ”آپ جارہی ہیں۔۔۔؟“ صبح موقع پا کر اس کے پاس آیا تھا۔ اس کے لہجے میں عجیب سی رت تھی۔

”ہاں جانا تو ہوگا، میرا پنڈی ٹرانسفر ہو گیا ہے۔“
 ”میرے سفر کو ادھورا چھوڑ کر جارہی ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں شکایت تھی۔

”کیونکہ مجھے یقین ہے باقی کا سفر تم بڑی سہولت سے طے کر لو گے۔ دقت کم ہے۔ ایم اے کے امتحانات سر پر ہیں۔ اس دقت سب کچھ بھول جاؤ اور پوری توجہ پیپرز پر رکھو۔ اس کے بعد یہاں یا کسی اور شہر میں اچھی جاب کی تلاش شروع کر دینا۔“
 ”یہ مراحل آپ کے بغیر کیسے طے کروں گا؟“ وہ واضح طور پر اس دکھائی دے رہا تھا۔

”اب یہ سارے مرحلے ہی آسان ہیں۔“
 ”مگر میں خود کو کیسے سمجھاؤں کہ آپ کا ساتھ صرف اندھیر دل تک میرے ساتھ تھا، روشنی آتے ہی آپ مجھے اس چکا چوند میں الجھا کے خود سائیڈ پر ہو گئی ہیں۔“
 ”اچھا چھوڑ دینا باتیں، کچھ اور کہو۔“

”کہہ دوں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔
 تم جو بل بھر کو ٹھہر جاؤ تو یہ لمحے بھی آنے والے کئی لمحوں کی امانت ہو جائیں
 تم جو ٹھہر جاؤ تو یہ رات یہ مہتاب
 یہ بزمہ، یہ گلاب اور ہم دونوں کے خواب
 سب کے سب ایسے مبہم ہوں کہ حقیقت ہو جائیں
 تم ٹھہر جاؤ کہ عنوان کی تفسیر ہوتم
 وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پڑھ رہا تھا۔ زرتاب کا دل یوں کانپا جیسے شدید طوفان باد دیا پراں میں گھرا ڈالتا ہوا جہاز۔

تم سے کئی اوقات کا موسم بدلے
 رات تو کیا بدلے گی حالات تو کیا بدلیں گے
 تم جو ٹھہر جاؤ تو میری ذات کا موسم بدلے
 مہرباں ہو کے نہ ٹھہر دو تو پھر یوں ٹھہرو
 جیسے بل بھر کو کئی خواب تمنا ٹھہرے
 جیسے درویش مدح نوش کے پیالے میں کبھی
 ایک دو پل کے لیے کئی دنیا ٹھہرے
 تم ٹھہر جاؤ کہ مدارات کے مے خانے سے
 چلتے چلتے کوئی ایک آدھ سبو ہو جائے
 اس سے پہلے کہ کوئی لمحہ آئندہ کا تیر
 اس طرح آئے کہ پوست گلو ہو جائے
 ”پلیز صبح!“ زرتاب نے بہت سنجیدگی اور خفگی سے قدم آگے بڑھا دیے۔
 ”میں نے تو صرف ایک نظم سنائی ہے۔“ وہ انجان بن کر سادگی سے وضاحت کرنے لگا۔
 ”آپ کو کیا لگا؟“ اس نے مبہم نگاہ اس پر ڈال کر چہرہ موڑ لیا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ خائف سی ہو کر باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

پنڈی ٹرانسفر کے بعد اس کی زندگی بہت مصروف ہو گئی۔ وہ وہاں ہاسٹل میں رہتی تھی اکثر دو بیٹے بعد ویک اینڈ پر گھر آ جاتی تھی۔ وقت کچھ آدرا گئے سرکا۔ رضوان کو ابھی تک واپس آنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ عالیہ کی شادی ہو گئی اور بالآخر فصیح نے ماسٹرز کے پرچے دے دیے تھے۔ اور جب چھ ماہ بعد رزلٹ آیا تو فصیح کو اپنی اس کامیابی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ بڑے اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا۔

اسے آج اپنا آپ بہت مضبوط اور مکمل محسوس ہوا۔ یوں لگا جیسے اب اس کے پاس سر اٹھا کر چلنے کی طاقت آ گئی ہے۔

”اب میں اپنے لیے اور اپنے سے وابستہ رشتوں کے لیے کچھ کر سکتا ہوں۔“ اس نے طمانیت سے سوچا۔ زرتاب نے جانے سے پہلے کہا تھا۔

”تمہاری جگہ یہاں نہیں ہے فصیح! تمہارا گھر وہ ہوگا جو تم اپنے لیے اور اپنی ماں کے لیے بناؤ گے۔ یہاں تم ایک مہمان ہو اور مہمانوں کو گھر والوں پر غیر ضروری بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہیے۔ تمہاری ٹہلی تمہاری ماں کے ساتھ مکمل ہوتی ہے۔“

”اور تمہارے ساتھ بھی۔“ اس نے سوچا۔

”صاحبزادے کے بڑے پرنکل آئے ہیں۔ ذرا پوچھیں تو نواب زاوے سے آج کل شہر کے بار بار چکر کیوں لگائے جا رہے ہیں؟“ عباد کا لہجہ نفرت سے سلگ رہا تھا۔

اباجی نے کافی گبڑے تیوروں سے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ جہاں عباد بھائی پہلے سے موجود تھے۔

”کیوں بھی خبیث کے پتر! کہاں دفع ہوتے ہو روز روز۔۔۔“ اباجی بھڑک کر شعلہ بن گئے۔

”میں نوکری کی تلاش میں جاتا ہوں۔“ ادب مانع تھا اس لیے سر جھکا کر جیسے اپنے جرم کا اعتراف کیا۔

”بہت خوب، اب یہ دو نکلے کا انسان نوکری کرے گا۔ اپنی مرضی کرے گا۔“ عباد بھائی نے طنز سے اس کی طرف دیکھا۔

”کس سے پوچھ کر تم یہ سب کر رہے ہو۔“ اباجی نے دانت پیس کر پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔

”یہ جو تم نے ہماری نافرمانی کر کے اپنی ضد سے پرچے دے دیے یہ تمہارے لیے بہت کافی ہے۔ یہاں رہنا ہے تو پھر ہماری مرضی اور شرطوں کے مطابق رہنا ہوگا۔ ورنہ دفع ہو جاؤ جہاں جی چاہے۔“ وہ بہت ناراضی سے گویا تھے۔

”تمہارے ذمے جو کام لگائے گئے ہیں وہی تمہاری نوکری ہے، ہمیشہ کے لیے سمجھ گئے؟“ عباد

آئی حقارت سے بولے۔

”صبح کو اپنے دل و دماغ ٹھنڈا رکھنے کے لیے بہت جدوجہد کرنی پڑی۔

”جس تعلیم کو اتنی تاخیر سے حاصل کیا ہے اسی کو استعمال میں لانا چاہتا ہوں۔“ اس نے احترام ملحوظ طر رکھتے ہوئے احتیاط سے اپنا منہ عابیان کیا وہ چاہتا تو ضد یا ہٹ دھرمی سے بھی کام لے سکتا تھا مگر وہ

سنان فراموش نہیں کہلاتا چاہتا تھا۔ کچھ بھی تھا اس حویلی نے اسے اس وقت پناہ دی تھی جب وہ بھری دنیا کا ایکلا بھٹکنے کو تھا۔ گوکہ اس احسان کا تاوان وہ ابھی تک ادا کر رہا تھا۔

”میں جانتا ہوں تمہارے منہ میں کس کی زبان بول رہی ہے۔ اس نے کچھ ترس کھا کے پڑھائی

لہائی کا سامان کیا کر دیا خود کو ہیرو سمجھنے لگے، اباجی میرا تو خیال ہے اس کی زرتاب پر نیت خراب ہے۔

ن بھولی بھائی لڑکی کو اپنے چنگل میں پھنسا کر مجھ سے بدظن کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے تو وہ مجھ سے شادی سے بدک رہی ہے۔“

”بس کریں عباد بھائی!“ وہ بری طرح پھٹ پڑا۔ اب بات اس کی برواشت سے باہر ہو گئی تھی۔

”ایسے گھناؤنے الزام لگاتے ہوئے آپ کو شرم آتی چاہیے۔“ اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا

تھا۔

”میرے ساتھ بدتمیزی کرتے ہو، میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔ گندی ماں کی گندی اولاد۔“

وہ چنگھاڑتے ہوئے اس کے پاس آئے اور گریبان میں ہاتھ ڈال کے دوسرے ہاتھ سے زوردار

چٹل لگانا چاہا۔ مگر ان کا ہاتھ ایک جھٹکے سے فصیح نے روک لیا تھا۔

”بس عباد صاحب! بہت ہو گیا۔ بہت سہ لیے آپ لوگوں کے طنز اور طعنوں کی مار، بہت لے لیا

اپ نے میری برواشت کا امتحان۔ آپ نے کوئی جانور نہیں پالا تھا گھر میں۔ نہ میری ماں نے تاوان کی

سورت میں مجھے آپ لوگوں کو سونپا تھا کہ ہر طرح کے بدترین سلوک کا حق دار سمجھا جاتا۔ اباجی اگر میری

اں کے گناہوں کا کفارہ پورا ہو گیا ہو اور آپ کے سینے میں ٹھنڈک پڑ گئی ہو تو مجھے اجازت دیجیے گا۔ میں

یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔“

وہ عباد بھائی کا ہاتھ جھٹک کر پرے کرنے کے بعد سرخ آنکھیں لیے اباجی کے پاس آکا، اس

کے لہجے میں درد تھا۔

”تیزی تو۔۔۔ ہمارے ٹکڑوں پہ پلٹنے والے کتے۔“ عباد بھائی کف اڑانے لگے۔

حیرت انگیز طور پر اباجی ابھی تک خاموش کھڑے تھے۔ فصیح سلگتے ہوئے اعصاب لیے ایک ان

دیکھے الاؤ میں جلتا ہوا ہار اگیا تھا۔

پھر اس نے وہاں سے نکلنے میں دیر نہیں لگائی۔

اس کی اگلی منزل پنڈی کا جنرل ہاسٹل تھا۔ جہاں زرتاب ان دنوں تعینات تھی۔ اتفاق سے وہ

ٹولی آؤر میں ہی اسے مل گئی۔

”تم یہاں۔۔۔؟“ وہ حیران تھی۔

”یوں اچانک آ گئے؟ کیا نوکری ڈھونڈنے آئے ہو؟“

”اس کے لیے شاید اتنی جلدی نہ آتا۔ مگر اب حالات ایسے ہو گئے تھے کہ آنا ہی پڑا۔“ وہ خود کو بہت حد تک پرسکون کر چکا تھا۔ تمام واقعات اس کے گوش گزار کرنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

”یہاں کہاں رہو گے فصیح؟ اور وہ بھی پیسوں کے بغیر۔“

”اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”مجھے کچھ رقم چاہیے ادھار، اتنی کہ جس سے ایک کرا کر اے پر لے کر رہ سکوں اور جب تک نوکری نہیں ملتی اپنے کھانے پینے اور رہنے کا بندوبست کر سکوں۔“

”کیوں نہیں؟“ اس نے بیگ سے چیک بک نکال کر دس ہزار کی رقم لکھی اور اسے چیک تھا دیا۔ ”مجھے یقین ہے بہت جلد تم یہ قرض لوٹانے کے قابل ہو جاؤ گے۔“ وہ خوش دلی سے مسکرائی تھی۔

”شکر یہ سفر اتنا اہل بھی نہیں تھا۔“ دو ماہ گزر گئے جوتیاں چٹاتے پھر تیسرا مہینہ بھی شروع ہو گیا۔ اور جب وہ مایوس ہونے لگا تھا تو اچانک ہی قسمت مہربان ہو گئی۔ اسے بلیو ایریا میں ایک ٹریول ایجنسی میں بہت اچھی جاب مل گئی۔

اس دن وہ بہت خوش تھا خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ لیے مٹھائی کے ڈبے سمیت وہ شام کو زرتاب کے ہاسٹل میں موجود تھا۔

”یہ باوقار زندگی کی طرف جانے والے راستے کا پہلا پڑاؤ ہے۔ ایسے بہت سے نئے موڈ کی منزلیں تمہاری منتظر ہوں گی۔ بس ہمت نہ ہارنا۔“

”اگر آپ جیسا کوئی ہمیں ہمت بندھانے والا مل جائے تو۔“ اس نے اچانک اپنی زبان دانتوں تلے دبالی۔

”بہت زیادہ بولنے لگے ہو تم۔“ وہ غصے سے گھور کر مٹھائی کا ڈبا کھولنے لگی تھی۔

☆☆☆

فصیح کا گھر چھوڑ کر جانا قصہ پارینہ بن چکا تھا۔

گھر میں جس جس نے بھی اس کے اچانک گھر سے جانے کی خبر سنی تھی اس نے اس عمل کو اپنی مال کے نقش قدم پر چلنے سے عبارت کیا تھا۔

کچھ عرصے تک لعنت ملامت کرنے کے بعد اب سب ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ کام کاج کے لیے ایک اوپر عمر ملازم رکھ لیا گیا تھا۔ کسی کو اس کے جانے سے فرق نہیں پڑا تھا،

اماں جی بہت گم صم ہو کر رہ گئی تھیں۔

”طیبہ کی امانت تھا وہ ہمارے پاس۔ ایسے کیسے جانے دیا اسے، جہاں اتنا عرصہ رکھا دہاں۔“ وہ اکثر خود کلامی کے سے انداز میں کہتی تھیں۔

”اس کے ساتھ جا کے طیبہ سے دو گھڑی کو مل لیتی تھی۔“ اماں کو اپنے اکلوتے نواسے کے اس طرز چلے جانے کا بڑا رنج ہوا تھا۔ ”جانے کہاں اور کن حالوں میں ہو گا۔“

پھر ایک دن زرتاب نے آکر بتایا۔

”وہ تو خیرت سے ہے اماں جی! گزشتہ آٹھ نو ماہ سے پنڈی میں رہ رہا ہے۔ اسے اچھی نوکری بھی ملے۔“

اماں جی کے چہرے پر دے روشن ہو گئے۔

”شکر ہے خدا کا، مگر تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”میں ملی ہوں اس سے۔“ اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔

وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہیں۔ غالباً اس کی شکل سے بات کی گہرائی جانچنا چاہ رہی تھیں۔

پھر ایک گہری سانس لے کر وہ مہربان ہو گئیں۔

”رضوان ماہ بعد آ رہا ہے اس کے آتے ہی تمہاری شادی ہو جائے گی۔“

”ہوں۔“ وہ ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔

وہ سوچ رہی تھی رضوان کو گھر سے فون کرے یا باہر پی سی او سے، رضوان امریکہ میں پلا بڑھا تھا۔ دی رائے کا قائل تھا۔ اس نے بڑے محل سے ساری بات سنی تھی۔

”تم فکر نہیں کرو۔ تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو گا۔ اور شادی بیاہ زبردستی کے سودے تو نہیں ہوا تے۔“

زرتاب نے سکون کا سانس لیتے ہوئے ریسیور رکھا تھا۔

☆☆☆

”اباجی! بے شک آپ ہمارے بزرگ ہیں آپ کو ہر فیصلے کا حق ہے مگر اس فیصلے میں فریقین کی نامی شامل ہونی چاہیے۔“

رضوان بہت ٹھوس دلائل، اعتماد اور سکون کے ساتھ اباجی کے ہر سوال اور غصیلے تیروں کا جواب دے رہا تھا۔ وہ پرسوں امریکہ سے آیا تھا۔

اس کے آتے ہی من کا موڈ گل و گلزار ہو گیا تھا۔ اباجی اور اماں جی نے یہ سنہری موقع ہاتھ آتے ہی نین چار سال پرانا بکھیرا بنانے کی تحریک شروع کر دی تھی۔

”ہم نے کبھی کسی معاملے میں فیصلہ کرنے میں اتنی تاخیر نہیں کی نہ ہی کسی کے بہانے سنے ہیں۔ اب ان سے کہو ہماری دی ہوئی آزادی اور محبت کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ ہم صرف اس لیے برداشت لیتے ہیں کہ بن ماں باپ کی بچی ہے، نادان ہے۔ مگر اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ شادی کی عمر نکلی ہے اور سال دو سال بعد ڈھنگ کا رشتہ نہیں ملے گا۔“

اباجی نے آغاز بڑی گھن گرج کے ساتھ کیا تھا۔

”جورشتہ آپ کی نظر میں ہے، زرتاب کی ادھر مرضی نہیں ہے۔“

”تو پھر اور کدھر مرضی ہے اس کی؟“ وہ جلال میں آگے اور دانت پیس کر گویا ہوئے۔

”ہمارے یہاں آج تک لڑکوں کو اپنی مرضی بتانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ یہاں کل کی چھو کر کی مرضی بتائے گی ہمیں۔“

”اگر یہ حق نہیں دیا گیا تو غلط کیا گیا۔ یہ باعثِ فخر نہیں، باعثِ افسوس ہے۔“ رضوان بہرہ سے گویا ہوا۔

”آپ لوگوں کی ضد نے مجھے اور سن کو وقت سے پہلے باندھ دیا جس کی وجہ سے وہ تین سال انتظار کا عذاب کاٹ رہی ہے۔ شادی کا ٹائم تب تھا جب میں مکمل طور پر سٹبل ہو جاتا۔“ اس کا لہجہ کے روایتی جذباتی دماغ کو شکست دے گیا تھا۔ وہ غضب ناک ہو کر گرجنے برسے لگے۔ زرتاب لپیٹ میں آئی، لیکن ہوا وہی جو رضوان نے چاہا۔

اس نے بہت اچھے طریقے سے بہن کا مقدمہ لڑا تھا۔

”جیسا تم نے چاہا ویسا تو ہو گیا۔ مگر تم نے ”وجہ“ سے نہیں ملوایا مجھے۔“ جاتے سے وہ زرتاب مخاطب ہوا۔

”پلیز رضوان! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ شپٹا گئی۔

”اوکے مان لیا مگر ایک بات یاد رکھنا جب بھی ایسی کوئی بات ہو مجھ سے ضرور ڈسکس کر میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے یقین ہے میری بہن جو فیصلہ کرے گی خوب سوچ سمجھ کر کرے گی۔“

اس نے زرتاب کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی اور پھر ہنستا ہوا اللہ حافظ کہہ کر چلا گیا۔

”اف میرا بھائی سلامت نہ ہوتا تو اب جی تو جھونک دیتے مجھے اپنی مرضی کے جہنم میں۔“ اس نے لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا۔

☆☆☆

”طیبہ بھپھور ہا ہو کر آگئی ہیں۔ فصیح انہیں اپنے ساتھ لے آیا ہے۔ کیا آپ ان سے ملیں گی؟“

اماں جی کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھلک گیا۔

اس دیک اینڈ پر آئی تو اماں جی کو سنانے کے لیے اس کے پاس گرما گرم خبر تھی۔ وہ بہت غور ان کے چہرے پر خوشی اور دکھ کے گھٹنے بڑھتے سائے دیکھ رہی تھی۔

”اگر آپ ان سے ملنا چاہتی ہیں تو میرے ساتھ جانے کے بہانے پنڈی چلی چلیں۔ کہہ دیجئے میرے والے ہسپتال سے کچھ ٹیسٹ کرانے ہیں۔ فصیح وہیں پنڈی میں رہتا ہے۔ اب تو اسے ڈیڑھ ہو گیا ہے جب کرتے ہوئے۔“

اماں جی کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ پھر دو گرم آنسو گالوں کے موم پر ٹپکے۔

”کیا کروں گی اس کی اجازت اور ویران حالت دیکھ کر۔“ انہوں نے سرد آہ بھری۔

”اب تو کافی بہتر ہو گئی ہیں۔ جب آئیں تو بالکل سوکھ کے کاٹا ہو رہی تھیں۔ ایک ماہ ہو گیا انہیں فصیح کے ساتھ رہتے ہوئے۔ بیٹا، ماں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ اس نے اسلام آباد میں آئی ٹین ایک پورشن کرائے پر لے لیا ہے۔ تھوڑا بہت فربہ بھی ڈال لیا ہے۔ سال بعد اس کی تنخواہ بھی بڑھ گئی۔ دو ماں بیٹا ہی تو ہیں بڑی اچھی طرح گزارا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے پھپھو کو فروٹ

بی کھانے کھلاتا ہے۔ دودھ باقاعدگی سے رات کو پلاتا ہے۔ ان کے لیے بے شمار کپڑے رے رکھے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں گھر کے کام کاج اور سودا سلف کا حساب کتاب رکھنا کر کام آگیا ہے اس نے بڑے اچھے طریقے سے اپنا گھر سنبھال رکھا ہے۔“

وہ شرارت سے ہنس دی۔

اماں جی مسکرا بھی نہ سکیں۔ وہ تو ماضی میں کھو گئیں تھیں۔ زرتاب ویک اینڈ گزار کر واپس پنڈی آئی ام ملاکہ طیبہ بھپھو کا دوبار فون آچکا تھا۔ پیغام یہ تھا کہ فارغ ہو کر گھر کا چکر لگاؤ وہ ڈیوٹی پوری کرنے بد ہاشم جانے کے بجائے مری روڈ سے ٹیکسی لے کر آئی ٹین آگئی۔

ٹیکٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر چلی آئی۔ اس کے پاس داخلی دروازے کی ایک ڈپٹی کیٹ موجود فصیح تو پانچ بجے آفس آتا تھا۔ وہ یقیناً اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ طیبہ بھپھو اپنے کمرے میں رہیں۔

وہ اندر آئی تو وہ واش روم میں تھیں۔ چھوٹا سا کیٹ پلیئر درمیانی آواز میں بج رہا تھا۔ کوئی بہت اغزل چل رہی تھی۔

اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا

جانے کیوں آج تیرے نام پہ رونا آیا

زرتاب کے پاؤں سن ہو گئے۔ اس نے مضطرب نظروں سے واش روم کے بند دروازے کی دیکھا تھا۔

یوں تو ہر شام امیدوں میں گزر جاتی تھی

آج کچھ بات ہے، جو شام سے رونا آیا

زرتاب کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ خود کو سہارا دینے کے لیے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ دماغ کہیں بھٹکنے لگا تھا۔

کبھی تقدیر سے شکوہ تو زما۔ اب سے گلہ

منزل عشق کے ہر گام پہ رونا آیا

”ارے تم کب آئیں بھی۔“

کچھ دیر بعد طیبہ بھپھو تولیے سے چہرہ تھپتھپاتی ہاتھ روم سے باہر آئی تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ ہمیشہ خوش ہو جاتی تھیں کہ فصیح کے بعد واحد خونی رشتہ تھا جو رہائی کے بعد ان کو دیکھنے کو ملتا تھا۔

”کل اماں جی کے ہاں سے واپس آئی تھی۔ آج ڈیوٹی دینے کے بعد آپ کی طرف چلی آئی۔

تازہ دست بھوک لگ رہی ہے پھپھو! یہ بتائیے کیا بنا یا ہے۔“

”تمہاری پسندیدہ دال چاول اور ہری مرچ کی چٹنی بنائی ہے چلے گی؟“

”چلے گی، دوڑے گی، ٹنڈاٹ دے دیجئے بس۔“

طیبہ بھپھو کو اس کی بے تکلفی اور اپنائیت پر مارے خوشی کے رونا آنے لگا۔ جیل میں رہ کر وہ ان

بے جذبات کو جیسے بھول ہی گئی تھیں۔

زرتاب وہی گیت دوبارہ سننے لگی۔

”یہ کیسٹ کون لایا تھا؟ آپ یا فصیح؟ وہ بچن میں بیسن پر ہاتھ دھوتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
”بہت بہت پرانی کیسٹ ہے اور کیسٹ پلیئر بھی۔ میں جیل میں سنتی تھی۔“
”کیا وہاں اجازت تھی ایسی تقریحات کی؟“ وہ متعجب ہوئی۔

”تھی تو نہیں مگر جب بندہ طویل مدت تک جیل میں رہتا ہے تو وہ گہری لگنے لگتی ہے۔ جیسا ہی گویا ”شریک“ بن جاتے ہیں وہ شریکا جو رشتے کی لاج نبھانے کے موڈ میں ہوتو ہر سہولت دے ہے۔“ وہ اس کی ہنسی لیے گویا تھیں۔

”اور جب سے یہ فصیح کے ہاتھ لگی ہے وہ دن رات یہی سنتا ہے۔“

وہ خاموش ہو کر ان کی ناخن سے میز کی سطح کھرچنے لگی تھی۔

”پھپھو! ایک بات بتائیں گی۔“ وہ اچانک ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

”اتنی طویل مشقت زدہ زندگی گزار کے آپ نے کیا پایا۔۔۔؟“

”پچھتاوے۔“ ان کا جواب برجستہ تھا۔

”لیکن انسان جب محبت کر رہا ہوتا ہے یا اس کے حصول کے لیے سرگرم ہوتا ہے اس وقت

اپنے آپ کو سو فیصد حق پر سمجھتا رہا ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔“

”میں تو اس نتیجے پہ پہنچی ہوں زرتاب کہ رشتہ وہی ہوتا ہے جو معاشرتی حدود و قیود اور تاء

ضابطوں کے ساتھ استوار ہو۔ بزرگوں سے لڑنے کے مخالف چل کر اکثر نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔“

”مگر ہر کیس میں ایسا نہیں ہوتا۔“ وہ بے ساختہ بولی۔

”بے شک ہر کیس میں ایسا نہیں ہوتا والدین کسی ذاتی خواہش یا ضد یا انا پرستی کے چکر میں

بچوں کی تقدیر کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔“ وہ بروہاری سے بولیں۔

”ایک بات اور، اپنے شوہر کو مل کر تے وقت ایک لمحے کو آپ کا دل نہیں کانپا؟ آپ کو اس

مارتے ہوئے کیسا لگا جو آپ کا مجازی خدا تھا۔ آپ کی محبت تھا اور جس کا جرم بہر حال اتنا بڑا نہیں

انے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔“

”پلیئر۔“ وہ زردروس جیسی رنگت لیے مرتضیٰ سانسوں سمیت ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”برسوں تک جیل کی تاریک راتوں میں وہ لمحہ، اس لمحے سے وابستہ دکھ کی شدت اور اپنے

ضمیر کی شدید لعنت پھنکار میری سوچوں کا مرکز رہی ہے۔ میں راتوں کو سونا بھول چکی ہوں زرتا

پچھتاوے کی آگ میں مرتے دم تک سلگتے رہنا میرا مقدر ہے۔“

اچانک ان کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ تورا کر گریں اور جب تک زرتاب اٹھ کر انہیں سنبھالتی

کے کونے سے سرنگرا کر فرش پر بے سدھ ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

سب کچھ اچانک ہو گیا۔

ایک طویل مدت جیل میں گزارنے کے بعد وہ آزاد و دنیا میں آئیں تو اس آزادی کو ایک ما

محسوس نہ کر پائیں کہ ان کا دل گھبرا گیا۔

اور کچھ ایسا گھبرا یا کہ ان کی روح نفس غصری سے پرواز کر گئی، فصیح نے ان کی موت کی اطلاع
جو ابھی تک طیبہ پھپھو کی یہی وصیت تھی کہ کم از کم آخری وقت میں انہیں باپ اور بھائیوں کا کندھا

جانے والی چلی گئی تھی تو پھر کہاں کی انا، کہاں کی لغزشیں، دشمنیاں تو زندہ لوگوں سے کی جاتی ہیں۔

ابا جی پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے بیٹی کا آخری دیدار کرتے ہوئے۔ پہلی بار فصیح کو پورے دل

گلے لگایا تھا۔

پھر زندگی کا عنوان کچھ اور ہو گیا۔

”تم چاہو تو حویلی واپس آ سکتے ہو اور ہمارے ہاں ایک فرد کی حیثیت سے رہ سکتے ہو۔“

چلتے جاتے انہوں نے آہستگی سے فصیح کو مخاطب کیا تھا۔

وہ لوگ فصیح کے گھر میں ہی ٹھہرے تھے اور یہ بھی جانچ چکے تھے ان تین چار سالوں کی کڑی

ت نے فصیح کو اس قابل کر دیا تھا کہ اب وہ معاشرے میں مقام حاصل کرنے کی دوڑ میں برابر کا

بن چکا تھا۔

”شکریہ ابا جی! میری جاب بہت اچھی ہے اور اس میں ترقی کے امکانات بھی واضح ہیں۔ اس

میں یہاں بہت مطمئن ہوں۔“

اس نے تابع داری سے جواب دیا تھا۔

ابا جی ہونٹ چبانے لگے۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔

ٹھیک ایک ماہ بعد فصیح کو حویلی بلوایا گیا۔

ابا جی نے اپنی جائیداد اپنے چاروں بچوں تین بیٹوں اور ایک بیٹی میں شرعی لحاظ سے تقسیم کر دی۔

ب اور رضوان کے مرحوم باپ کا حصہ ان دونوں کو ملا تھا اور طیبہ پھپھو کے حصے کی جائیداد ان کے

وارث فصیح کے نام کر دی گئی تھی۔

”یہ لاکھوں کی پر اپنی ہے۔ چاہو تو بیچ لیتا اور چاہو تو کرائے پر اٹھا دینا، کسی مصرف میں لے آنا یہ

مال تمہارا حصہ ہے۔“

ابا جی نے کاغذات کی فائل فصیح کے سپرد کر دی۔

فصیح گو وہیں بڑے ان کاغذات کو خالی الذہنی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ ایک آنسو چپکے سے دائیں

سے لڑھکتا ہوا اپنی کے بالوں میں گم ہو گیا تھا۔

”یہ حویلی جہاں کی ایک انچ پر میرا قدم پڑنے پر یہاں کے کینوں کے دل میں شعلے اٹھنے لگتے

آج وہی مجھے میرے حق سے نوازا رہے ہیں؟“

کتے ہی تذلیل آمیز، نفرت بھرے رویے، اور چہرے اس کی نظروں میں گھومنے لگے تھے۔

☆☆☆

زرتاب کی ٹرانسفر دوبارہ لاہور ہو گئی تھی۔

وہ جانے کی تیاریوں میں تھی، جب ہاسٹل میں اس کے لیے فصیح کا فون آیا تھا۔

”اگر آپ فارغ ہوں تو میں آپ سے ملنے آ جاؤں؟ آپ نے تو گزشتہ چھ ماہ سے میرے گھر میں

قدم رکھنا گناہ تصور کر لیا ہے۔“

”جن کے لیے آئی تھی وہ نہیں رہیں تو۔۔۔ بہر حال تم آ جاؤ۔“ وہ پیکنگ کر کے فصیح کے انڈر میں ہاسٹل کے لان میں پہنچ کر بیٹھ گئی۔

مارچ کی دس تاریخ تھی اور بہار کے سارے ہی رنگ لان میں جابجا بکھرے نظر آتے تھے۔

نرم گرم ہی جانفزا ہوا

سبز چمکتے ہوئے ننھے ننھے نو خیز پتے

ہری ہری گھاس

تروتا زہ پیر

پھولوں سے لدی شاخیں

مہکتی کیاریاں

اور چہچہاتے ہوئے رنگ برنگے پرندے

سب چیخ چیخ کر اسے کہہ رہے تھے

لو بہار آگئی ہے

وکیو بہار آگئی ہے

”السلام علیکم!“ آہٹ کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔

وہ نیوی بلیو پینٹ اور لائٹ بلیو شرٹ میں لباس تھا تھکا تھکا سا، اور بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

”میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

وہ خاموشی سے اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

”ہمارے ڈپارٹمنٹ میں کچھ جاہل لڑکیاں ہیں دوپٹی کے لیے۔ میں نے بھی اپلائی کر دیا۔ اتفاق۔

میرا نام لسٹ پر آ گیا ہے۔ میں اگلے ماہ دوپٹی جا رہا ہوں۔ چھ سال کا انٹریکٹ ہے۔“ وہ فضاؤں میں ہکا بھکا ہوا تھا۔ ایک معنی خیز سا ناما حول پر طاری ہو گیا۔

”اچھی بات ہے، مجھے یہ بتانے آئے ہو؟“ وہ اچانک طیش میں آگئی تھی۔

”میں یہ کہنے آیا تھا کہ۔۔۔“ فصیح کے انداز میں شکست خوردگی نمایاں تھی۔

”کانٹریکٹ تم نے اپنی مرضی سے قبول کر کے اپلائی کیا۔ اپنی مرضی سے جا رہے ہو۔ پھر مجھے؟

بتاتے ہو۔ اطلاع کرنی ہے تو اپنے گارجین سے کرو۔ اب تو وہ تمہاری سنتے ہیں، تمہیں اپنے برابر؟

پہچان اور مقام دیتے ہیں۔“ وہ نہایت رکھائی سے گویا ہوئی۔

”آپ اتنی ناراض کیوں ہو رہی ہیں؟“ وہ اس کے اس طرح بھڑکنے پر پریشان ہو گیا۔

”میں ہر ایرے غیرے سے ناراض نہیں ہوا کرتی۔“ وہ اجنبیت سے بولی۔

”چار ساڑھے چار سال تک میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک ایک قدم چلنا سکھاتی رہیں، حتیٰ کہ وہ

کے میدان میں مقابلے میں شامل کر دیا اور اب کہتی ہیں ایرا غیرا، آپ بہت پتھر دل ہیں زرتاب

بہت بے درد ہیں۔ کیا اتنے برسوں تک میرے جذباتوں نے کبھی بھی آپ کے دل کو نہیں چھوا؟ میں

مخصوص مدت تک ان کو دل میں چھپائے رکھنے پر مجبور تھا مگر کیا آپ تک کبھی ان کی خوشبو نہیں

”ہی؟“

وہ شکایت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”بالکل ہی احمق اور گدھا ہے، یہ اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتا کہ اتنے قیمتی برس کیوں بھاڑ میں جھونکتی

ہوں میں۔“ وہ دل ہی دل میں دانت پیس رہی تھی۔

”امی نے محبت پانے کے لیے بزرگوں سے بغاوت کا جو غیر مناسب اور غلط طریقہ اختیار کیا۔ اس

انہیں جیل کی ذلت آمیز سزا دینا میں رسوائی اور اپنوں کی نفرت و دوری تک پہنچا دیا۔ ساری عمر انہوں

انگاروں پر بسر کی۔ یہ انجام مجھے یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ میں آپ کو اس الاؤ میں نہ دھکیلوں،

لیے میں نے پسپائی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے آپ سے دور چلے جانے کا راستہ اختیار کیا ہے۔ میں

اہوں۔ اباجی بھی راضی نہیں ہوں گے اس رشتے پر بلکہ وہی کیا گھر کا کوئی فرد بھی مجھے آپ کے شوہر

اپنے داماد کے روپ میں دیکھنا گوارا نہیں کرے گا۔ اس لیے میں ان کی مرضی کے خلاف قدم

اٹھاؤں گا نہ آپ کو مجبور یا پابند کروں گا۔ میں آپ کے ذریعے اپنی ماں کی تاریخ نہیں دہرانا

تا۔“ وہ پرسکون انداز میں گویا تھا۔ اس کے لہجے میں کرب اور تکلیف نمایاں تھی، مگر وہ اپنے ارادوں پر

نہیلی سے قائم تھا۔

زرتاب نے ایک طویل سانس خارج کی۔

”ٹھیک فیصلہ کیا تم نے، اچھا اب تم جاؤ۔ میں پیکنگ کروں گی۔ ملک سے باہر جانے سے پہلے

لاہ ضرور کرنا۔“ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

اور اس سے پہلے کہ فصیح مزید کچھ کہتا وہ تیز تیز قدم اٹھائی اندر چلی گئی۔

☆☆☆

زرتاب نے اگلی شام بی سی او سے امریکہ رضوان سے بات کی تھی۔

”سوچ لو، اس کا بیک گراؤنڈ کیا تم اس کے ساتھ سروائیو کر لوگی سوسائٹی میں؟“ کافی دیر تک

موش رننے کے بعد رضوان نے استفسار کیا تھا۔

”ہر گزری ہوئی چیز پر وقت کی گرد پڑ جاتی ہے رضوان! یہاں ایک ساتھ ایک گھر میں رہتے

سے دوسرے کے بارے میں خبر نہیں ہوتی اور پھر وہ چھ سال کے لیے دوپٹی میں رہے گا۔ اس کے بعد

بہم واپس آئیں گے تو بہت کچھ بدل چکا ہوگا۔“

”ہم؟ یعنی شادی کر کے اس کے ساتھ جانا چاہتی ہو؟“ اور وہ بے اختیار جھینپ گئی تھی۔

”میرا مطلب ہے۔۔۔“

”ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا تمہارا مطلب، فصیح کے بارے میں تم سے سب معلوم ہو چکا ہے۔ وہ

اسے خاندان کا ایک حصہ ہے۔ خون کا رشتہ ہے ہمارا اس سے اور سب سے بڑی اور ہم بات یہ ہے کہ

ہم ساروں میں خود کو تمہارے قابل بنا چکا ہے۔ خود کو اہل ثابت کر چکا ہے اس لیے محض اس کے ماں

پ کے مامی کی بنیاد پر اسے شکر انا درست نہیں لگتا۔“

”اور وہ اباجی اور ماں جی۔“ وہ جھجک کر پوچھنے لگی۔

”انہیں بہر حال میں قائل کر لوں گا۔ ان کی اجازت لے کر ہی یہ شادی انجام پائے گی۔ میں اگلے

ماہ آ رہا ہوں۔ سمن کا نکلت اور دیر ابھی ساتھ لاؤں گا، اپنے چندرہ دن کے قیام میں تمہاری شادی چاہا سمن کو ساتھ لے کر امریکہ واپس آ جاؤں گا۔ تم صبح سے کہو اپنی دوشی روائی کو اگلے دو ماہ تک لیں گے۔ اس دوران تم اپنا پاسپورٹ بھی بنالو اور ویزے کے لیے اپلائی کر دو۔“

”آپ کے خیال میں اباجی آسانی سے راضی ہو جائیں گے؟“

”آسانی سے ہوں یا مشکل سے۔ بہر حال یہ وعدہ رہا کہ وہ شادی اپنے ہاتھ سے کریں گے اور خود تمہیں رخصت کریں گے۔ میں ماضی کی کوئی رخ روایت دہرانا پسند نہیں کروں گا۔ نہ طیبہ بچھو والی اور نہ اپنی اسمن کی طرح کی۔ مجھے صبح کا نمبر دو آفس کا۔ میں ذرا اس رشتے کی تحقیقات کرنا چاہتا ہوں۔“

اور اسے رضوان پر پورا بھر دسہ تھا۔

☆☆☆

”السلام علیکم! بڑی مشکل سے فرصت نکال کر آپ کو رخصت کرنے آئے ہیں۔ آج تو آپ رخصت کر رہے ہیں اور کچھ ہی دن کی بات ہے جب آپ کو ہمارے ساتھ رخصت ہو کر ہمیشہ کے لیے ہمارے دل اور گھر میں آباد ہو جاتا ہے۔“

وہ سامان لے کر ہوٹل سے روانہ ہونے کو تھی کہ فصیح نے اسے موبائل پر کال کر کے وہیں رکنے کو کہا تھا اور مزید چندرہ منٹ بعد وہ آچکا تھا۔

”نی الحال تو یہ چھوٹی سی سینڈ ہنڈ بایک ہی سواری کے لیے پیش کر سکتے ہیں۔ ہاں عنقریب جب ہم باہر جا کر پیسے کمائیں گے تو آپ کی خدمت میں آپ کی مرضی کی شاندار سواری پیش کریں گے۔ ویسے تو اس کام کے لیے ہمارے بازو بھی حاضر ہیں۔“

زندگی کے تمام شوخ رنگوں سے بھرپور، جاندار لب و لہجہ، پُر جوش آنکھیں جو جگنوؤں کی طرح دک رہی تھیں، بھلا زرتاب ان کا سامنا کیسے کر سکتی تھی۔

اس نے گھبرا کر پلکیں جھکالیں اور مصنوعی ناراضی سے رخ موڑ لیا تھا۔

”شریف لڑکیوں کو سر عام تنگ کرتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی؟“

”بالکل آتی ہے۔ اسی لیے تو ہم شرما شرمی میں آپ کی پلکوں کے سائے تلے چھپنا چاہتے ہیں۔ آپ کی زلفوں کے سائے میں آنا چاہتے ہیں۔“ وہ شوخ جانے مزید کیا کہے جا رہا تھا۔ اس کی بس بکھا سمجھ میں آیا کہ ”فل انشاپ“ کی غرض سے بایک پر سوار ہو جائے۔

”میری ٹرین نکل جائے گی جلدی کرو۔“ اس نے بیگ گود میں رکھ کے سختی سے حکم دیا تھا۔

”مگر میں نے اپنی زندگی کی ٹرین پکڑ لی ہے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں اب۔“

وہ سرشاری کی ترنگ میں تھا۔ اس کا ایک ایک عضو پکار پکار کے داستان سنار ہا تھا کہ اس نے زندگی سے اپنے حصے کی ساری بہاریں چرائی ہیں۔

☆☆☆

آگئے ہیں نکھار کے موسم

”آخر بکرا کب آئے گا ہمارے گھر میں؟“ اتنے شور شرابے میں بھی احمد کی چلائی ہوئی آواز بڑی کے اس وسیع و عریض اور گنجان آباکوشی کے مینوں کے کانوں تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔

”بکرے پہلے کیا کم ہیں ہمارے گھر میں۔“ عبیر جل کر بولی تھی۔

”افوہ۔ گھر والو! جاگ جاؤ، عید قربان یعنی کہ بکرا عید یعنی کہ بقر عید سر پہ آکھڑی ہوئی ہے اور یہاں کسی کو کوئی احساس ہی نہیں ہے۔“ احمد سے چھوٹا احراس سے بھی بلند آواز میں شور مچا رہا تھا۔

”بقر عید کی تیاریاں اور روٹیاں کب شروع ہوں گی ہمارے ہاں۔“ احسن نے اپنا بریف کیس ٹیبل پر اچھال کر آہ بھرتے ہوئے لہجہ کو مزید دردناک بنایا۔

”اماں جی! میں کہتا ہوں اس بار پورے چھ بکروں کا جلوس نکلتا چاہیے ہمارے گھر سے تاکہ محلے والوں کو پتا چلے اور۔۔۔“

احمد نے جوش کے ساتھ اماں جی کے کندھے دبائے۔

”لوگوں کو دیے ہی اچھی طرح خبر ہے کہ اس گھر میں ایک ندو پورے ”چھ“ بکرے رہتے ہیں۔“

عبیر نے بھٹا کر گوہر افشانی کی۔

”ایک تو اس کو خواخوہ مرچیں لگی رہتی ہیں۔“ احسن نے غور سے تمللاتے چہرے اور بگڑے تیروں والی عبیر کو دیکھ کر تبصرہ کیا۔

”اباجی آئیں گے تو ان کے سامنے کرنا میری شکایتیں۔“ وہ اسے دیکھ کر غرائی۔

”اوہو جل گئی، جل گئی۔“ احمد ہنسنے لگا تھا۔

”فصیح کیوں سوار رہتا ہے تمہاری اس مٹھی ہی ناک پہ؟“

احسن چھیڑنے سے باز کیسے رہ سکتا تھا۔ یوں بھی اسے عبیر کو چھیڑ کر بہت مزا آتا تھا۔ اس کے تمللاتے روپ کی لالیاں اور آنکھوں میں لپکتے غضب کے شرارے چھرا بن کر سیدھا اس کے دل پر لگتے تھے۔ (ان کی بات بچپن سے طے تھی۔) وہ جی بھر کر حظ اٹھاتا تھا۔

”دیکھ رہی ہیں تانی امی آپ۔“ اس نے اپنی ”متوقع“ ساس سے رجوع کیا۔

”احسن! کیوں چھیڑتے ہو بچی کو۔“ تانی جان اپنی روانی میں مٹر چھیلنے ہوئے بے ساختہ کہہ گئیں۔

”تو اور ”کے“ چھیڑوں۔“ احسن کا معنی خیر قہرہ اپنے تعاقب میں بہت سے مردانہ قہرہوں کو لے کر آیا تھا۔

عجیب کا یہاں ٹھہرنا دو بھر ہو گیا۔

وہ جبر تھکے ہوئے ہال کمرے سے نکل گئی۔

”کیوں ستاتے ہو میری بیٹی کو اتنا۔“

اپنے آپ میں گم، سادہ دل، مختص اور با آسانی بلیک میل ہو جانے والی تائی جان سب کی ہی پسندیدہ تھیں۔ چار جوان جہان بیٹیوں اور دو بیٹیوں کی ماں تھیں اور اس کوٹھی کے نیچے والے پورشن میں مقیم تھیں۔ اور پر والے پورشن میں چچی جان رہتی تھیں۔ اپنے دو بیٹیوں اور دو بیٹیوں کے ساتھ جن میں سے ایک عائشہ کی شادی ہو چکی تھی۔ دوسری عجبیر کی احسن سے بات طے ہو چکی تھی، اس لیے چچی جان بیٹیوں کے معاملے میں کافی حد تک مطمئن تھیں کہ دونوں ٹھکانے لگ چکی تھیں۔

چچا جان کی وفات کے بعد تائی جان یعنی اباجی ہی گھر کے ”مردانہ سربراہ“ تھے۔ ”زنانہ سربراہ“ دادی جان تھیں جنہیں لڑکوں کی قوم لاڈ سے اماں جی بھی کہتی تھی۔

”پتا ہے امی! اس کا چہرہ اور اس کے انداز پکار پکار کر کہتے ہیں۔ آؤ مجھے چھیڑو، آؤ مجھے ستاؤ، میرا دل جلاؤ، مجھے غصہ دلاؤ۔“ احسن ہنس رہا تھا۔ اس کے لہجے میں غیر کے لیے جوا پنایت چھپی تھی، اس سے سب ہی واقف تھے۔

”بھابھی! عائشہ کا فون ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔“ چچی جان سیڑھیوں کے نیچے رکھے ٹیلی فون اسٹینڈ کے پاس کھڑی بلارہی تھیں۔ تائی جان لیک کر اٹھیں۔

”کھانا کب لگے گا لڑکیو۔“ احمد نے بڑی مظلوم آواز بنا کر صدا لگائی۔

”صبر کرو، اباجی تو آئیں اور دادی اماں بھی نماز پڑھ رہی ہیں۔“ سارا نے ڈپٹ کر کہا۔

”سارا! او سارا! بھئی سارے کا سارا کھانا خود نہ کھا جانا، کچھ ہمارے لیے بھی رکھنا۔“ وہ احمد کی کیا جوسب کی گت نہ بنائے۔

”پکایا کیا ہے؟“

”حسن منزل“ میں ہمیشہ سے رات کھانے پر خاصا اہتمام ہوتا تھا اور خاص طور پر ہفتے کی شام تو گویا بقول سارا کے من و سلوی اتر آتا تھا میز پر کیونکہ اس دن دستور کے مطابق سب چھپڑے ہوئے ایک جگہ جمع ہوتے تھے۔ عائشہ سسرال سے آئی تھی۔ دادی کی دونوں بیٹیاں صبا اور نور ماں سے ملنے آڈ تھیں۔ رات کو بہت رونق میلہ لگتا تھا۔ سارے مہمان رات کو یہیں رہتے تھے۔ دیر تک جاگا جاتا، کچر لگتیں، چائے، کافی، کولڈ ڈرنکس، چپس اور ڈرائی فروٹس کے وقفے وقفے سے سلسلے چلتے رہتے۔ یور اتوار کی صبح اماں جی کے علاوہ سب ہی دیر سے اٹھتے تھے اور صبح کا ناشتا بارہ بجے سے پہلے نہیں بناتا تھا۔ دوپہر کا کھانا چار بجے لگتا۔ کھانا کھا کے شام کو سب حسب معمول اپنے اپنے گھر کی راہ لیتے تھے۔

آج بھی ہفتے کی شام تھی اور گھر والوں کو اپنے معزز مہمانوں کا انتظار تھا۔

عجیب، سارہ اور مدیحہ نے چچی جان کے ہمراہ کچن سنبھالا ہوا تھا جبکہ تائی جان ”رائیٹرل“ فراہ کرنے کی ذمہ دار تھیں۔ سبزیاں دھو کے کاٹ دیں، گوشت صاف کر کے دیا، چاول یا دال چن دی۔

”اصولاً گھر کے کچھ کام ان مسنڈوں کے بھی ذمے ہونے چاہئیں۔“ عجیب ہر ویک اینڈ پر ان یوں کی ٹانگ پہنتی تھی۔ ”اور نہ سہی تو کم از کم ہفتہ اتوار تو انہیں کام میں ضرور ہاتھ بٹانا چاہیے۔“

”کیوں نہیں بٹاتے ہم۔“ احمد جوا بھی ابھی سودا سلف لے کر آیا تھا، ہاتھ نچا کر چمک کر گویا ہوا۔

”سارا سودا میں ڈھو کے لایا، بھری منڈی میں اچھا خاصا جھگڑا کر کے آلو، پیاز اور دوسری سبزیوں کے ریٹ کم کرائے پھر گوشت والی دکان پر لمبی قطار کوٹوڑ کے قصائی صاحب سے گوشت کٹوایا اور پھر بھاری کے پاس پہنچ کر تمہارے لکھے ہوئے مسالے نکلوائے پھر فروٹ منڈی میں جا کے اچھا مال پائٹ کے نکلوایا پھر۔۔۔“

احمد صاحب ایک بار شروع ہوئے تو پھر ان کو اسٹاپ کرنا مشکل ہو گیا۔

”بس بس رہنے دو لڑکے! اپنے کام کاج کے قصیدے۔ توبہ۔۔۔ نماز پوری کرنا دو بھر کر دیا تم نے۔ جاؤ دیکھو، صبا ابھی بے یائیں۔“ کہو، اماں جی بلارہی ہیں۔“

اماں جی نماز ادا کر کے ہال کمرے میں داخل ہوئیں۔

”توبہ توبہ۔۔۔ صبا پھپھو کو جگانا یعنی ان کی نیند میں خلل ڈالنا۔ اس کی مجال نہیں ہے مجھے۔ مجھے تو ن کی کلف لگی نہایت پر تکلف اور خطرناک حد تک سنجیدہ شخصیت سے ویسے ہی بہت خوف آتا ہے۔“

احمد نے کانپنے کی ایکٹنگ کی پھر ایک دم کونے میں بیٹھی اتنی دیر سے خاموشی ان کی باتیں سنتی روحا لود کچھ کر جمل سا ہو کر پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

”ہوں ہوں۔“ چچی جان نے روحا کو متوجہ دیکھ کر گھور کر احمد کو دیکھا۔

روحانے احمد کی بات سنی تھی اور چچی جان، یعنی اپنی چھوٹی ممانی کی تنبیہی نظروں کا بھی بخوبی شاہدہ کیا تھا۔ اس نے نمی کے بارے میں احمد کے یہ منکس سن کر قطعاً برا نہیں مانا۔ اس کی می ایسی ہی تھیں۔ بہت اکیٹو، ہر دم مضروف، ہر وقت جلدی میں رہتیں۔ مقابل کو خود سے زیادہ فری ہونے کا موقع مل دیتی تھیں۔ ان کے چہرے پر چھائی سرد مہری، جمود اور ایک پر خوف سا سکوت خود روحا کو بوکھلا دیتا تھا۔ سب ان سے بات کرتے ہوئے نہایت محتاط ہو جاتے تھے۔

”میں دیکھ آئی ہوں، وہ ریٹ کر رہی ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ وہ ڈنر ٹائم تک نیچے آئیں گی۔“ کچھ دیر بعد سارا نے آکر تازہ ترین اطلاع بہم پہنچائی۔

”یوں اکیلی کونے میں لگ کر کیوں بیٹھی ہو بیٹا! اپنے بہن بھائیوں میں ہنسو کھیلو۔“ اماں جی نے اپنی اس گوری گلابی سیاہ جینز اور وائٹ جرسی میں ملبوس ریزرو بلکہ بوری بیٹھی نواسی کو دیکھ کر نرمی سے تجھایا۔ ادھر ادھر سے کھی کھی شروع ہو گئی۔

”ہاں بھئی، امریکن کزن! آؤ ہم سے ہنسو کھیلو۔“ شرارتی احمد تو فوراً ہی بول پڑا۔

روحا بری طرح بزل ہو گئی مگر اپنی عادت کے مطابق کچھ کہہ نہیں سکی۔ یوں بھی اس کی اردو صاف تو تھی مگر اتنی با محاورہ ہر گز نہیں تھی کہ وہ کلمہ توڑ جواب دے سکتی۔ پچھلے سال ہی تو وہ لوگ امریکہ سے مستقل پاکستان شفٹ ہوئے تھے۔ اس کی بڑی بہن شہلا کی امریکہ میں ہی شادی ہوئی تھی۔

بڑے بھائی سمیر نے کئی سال پہلے امریکہ سے واپس آکر آرمی جوائن کر لی تھی۔ وہ اب میجر تھے۔

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اتنے سارے جانوروں کی موجودگی میں مزید لانے کی کیا ضرورت ہے۔“ عیبر نے محل کر حساب چکاتا کیا۔
 ”بھئی، سمجھا کر دنا۔“ مدیحہ کھلکھلائی تھی۔ ”یہ زبان دالے ہیں، وہ ”بے زبان“ ہوں گے۔ آخر اپنی تو ہونی چاہے ناگھر میں۔“

”یہ علی اور دلی ابھی تک نہیں آئے انسٹی ٹیوٹ سے۔“ چچی جان کو اپنے دونوں سپوتوں کی فکر ورہی تھی۔ دونوں نے بی بی ایس کے بعد کسی کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔
 ”چھٹی کا ٹائم تو ہو چکا۔“ احسن نے گھڑی دیکھی۔ ”آتی ہوگی ان کی پھٹ پھٹی۔ اگر راستے میں ہمیں خراب نہ ہو، تو مزید پانچ منٹ بعد پہنچ جائے گی۔“

اور یہی ہوا، پانچ سات منٹ بعد بغیر سائنسر کے ان کی موٹر بائیک گیٹ پر ہارن دے رہی تھی۔
 احمر نے جا کر دروازہ کھولا۔

”آگئے مہمان گرامی۔“ علی نے پورچ میں کھڑی صابھپھو کی گاڑی دیکھ کر خود ہی اندازہ کر لیا۔
 ”ہاں بھئی، امریکن تو پہنچ گئے، البتہ اپنے بلوچی مہمان نہیں پہنچے۔“
 احمر کا اشارہ نور پھپھو کی طرف تھا جن کے میاں کا اعلق بلوچ قبیلے سے تھا۔
 ”وہ پہنچنے والی ہیں۔“

”اور عائشہ آئی؟“ ولی نے اپنی بڑی بہن کے بارے میں استفسار کیا۔
 ”ان کا ابھی فون آیا تھا۔ چنگی کی طبیعت خراب ہے، اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہیں۔ انہوں نے اس بار آنے سے معذرت کر لی ہے۔“
 ”اوہو، ویسے آپ اور ان کے میاں سے چھیڑ چھاڑ کا اپنا ہی ایک مزا ہوتا ہے۔“ ولی ان کے ساتھ ماتھ چلتا ہال کمرے میں آ گیا۔

”السلام علیکم ذیہ کزن!“ علی اور دلی نے باری باری روحا سے سلام دعا کی۔
 ”جی، وعلیکم السلام۔“ وہ مختصر اکہہ کر چپ ہو گئی بلکہ اسے چپ لگ گئی۔
 ”آگئے خیر سے کمپیوٹر کی دنیا میں حشر برپا کر کے۔“ مدیحہ نے استقبالیہ مسکراہٹ سے نوازا۔
 ”یہ دلی کا بچہ تو انٹرنیٹ کھول کے بیٹھ جاتا ہے اور اللہ معافی دے، جانے کیسے کیسے خانے کھولتا ہے۔ استخار میری تو نظریں ہی نہیں اٹھتیں۔ یہی اپنے گناہوں کی گھڑی کو بھاری کرتا رہتا ہے۔“
 ”ہاں ہاں، تم تو بڑے بببے، بڑے سادہ اور نیک نفس لڑکے ہو۔ تب ہی تو ایسے ویسے خانوں کے اسے میں پوری پوری معلومات رکھتے ہو۔“ احسن نے اس کے کان پھینچے۔
 ”نور پھپھو آئیں۔“ سارا کے کان باہر رکنے والی فون کی آواز پر لگے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی غم دین بھی ہو گئی۔ ”آئیے آئیے، ڈڈو کا روالے پھو پھا جی۔“

نور پھپھو اور انور پھو پھو بہت ہی سادہ مخلص اور ہنسوز قسم کے میاں بیوی تھے اور بچوں کے فیورٹ بھی تھے، سو گرما گرم استقبال ہوا۔ وہ سب طرف سے ہاتھوں ہاتھ لیے جا رہے تھے۔
 روحا خاموشی سے مشاہدہ کر رہی تھی اس کی ممی اور ابو کو کبھی اس طرح خوش دلی

اور کچھ سال پہلے ان کی شادی ایک کرٹل کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ وہ چکالہ اسکیم تھری میں رہائش پذیر تھے اور مزاج میں وہ ممی سے بھی دہاتھ آگے ہی تھے۔ سخت انداز، لہجہ تنقیدی اور انداز خشک۔ دوسرے نمبر کے بھائی عیبر امریکہ میں ایم بی ایے کر رہے تھے۔ ابو کا بزنس امریکہ میں تھا اور اب پاکستان آنے کے بعد یہاں بھی ایک برانچ کھول لی تھی۔ سودہ بھی امریکہ ہوتے تھے اور بھی پاکستان۔
 ردحا کا پاکستان میں بالکل بھی دل نہیں لگتا تھا۔

ایک سال سے وہ بھٹی ہوئی روح کی طرح اسلام آباد کی بڑی سی کوٹھی میں تنہائی کے بے زار اور یاسیت بھرے شب در در گزار رہی تھی۔

یہاں ”حسن منزل“ نانی کے ہاں آتی تو اس کا ڈپریشن اور بڑھ جاتا تھا۔ ہنستے کھیلتے، بے فکر اور محبت بھر ماحول میں پردر ش پانے والے بے پردا سے کزنز اور ان کے چٹکے۔ ان کی گرما گرم غفلتیں، لڑکیوں کی آپس کی رازداریاں اور خوش گپیاں۔ وہ چاہنے کے باوجود خود کو ان میں غم نہیں کر پاتی تھی۔ ممی کے حکم کی مجبوری پاؤں نہ باندھتی تو وہ بھی ویک اینڈ پر یہاں نہ آتی۔

بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ ردگردانی کرنا اسے سکھایا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ بے شک امریکہ میں پڑ بڑھی تھی مگر ماں کی تربیت، باپ کی شروع سے بیٹیوں کو خود سے دور رکھنے کی ادا اور بھائیوں کی حاکما: فطرت نے اس کے اندر سرکشی و بغاوت کو ابھرنے نہیں دیا۔ وہ خود کو واضح نہیں کر سکتی تھی، نہ اعتماد اور فخر چٹنگی اس کے نصیب میں جگہ گا سکتی تھی۔

شاید اسی لیے ظاہری جھلملاتی خوب صورتی کے باوجود اس کی شخصیت بے کشش تھی اور اس کی صحبت بوریت اور بے زاری کا باعث تھی۔ وہ کسی جگہ پر اپنی کسی خوبی کی بنا پر امتیازی حیثیت نہیں حاصل کر پاتی تھی۔ نہ اس کی آواز اور انداز میں شگفتگی تھی، نہ لہجے میں برجستگی تھی۔ نہ اتنی ہمت تھی کہ خود سے بڑھ کر کوئی کام کر سکے۔

لڑکے کمروں کی خرید کے لیے اماں جی سے بحث کر رہے تھے۔
 ”ارے بھئی! باری باری بولو، میں ایک وقت میں ایک بندے کی آواز سن سکتی ہوں۔“
 سب کی اپنی اپنی بولیاں تھیں۔

”دادی جان ایک بات آپ ہم لڑکیوں کی طرف سے بھی سن لیں پلیز۔“ عیبر اپنی مخصوص خفا خفا سی آواز میں مخاطب ہوئی۔

”جی ہاں، انہوں نے بھی کوئی ”مشترکہ اعلامیہ“ جاری کیا ہے۔ ان کے ٹولے کی رائے بھی پوچھ لیجیے ذرا۔“ مقابل عیبر ہو تو احسن اپنی شرارت سے کیونکر باز رہ سکتا تھا۔

”بکرے عید سے ایک دن پہلے آئیں گے۔ پچھلی مرتبہ کی طرح ایک ہفتہ پہلے ہرگز نہیں آئیں گے۔ یہ لڑکے محلے میں شوبارنے کے لیے تو خوش خوشی انہیں چکا لٹکا کے رسیاں پکڑ کر باہر لے جاتے ہیں لیکن ان کے چارے، پانی اور گندگی صاف کرنے کے لیے ہم لڑکیاں ہی رہ جاتی ہیں۔“ عیبر نے کہا۔
 ”یہ تو ہم لوگوں کا کام ہے۔ گھر کی صفائی اور ہمارے ”چائے پانی“ کا خیال بھی تو ہم ہی رکھتی ہو۔“ احمد کی زبان میں جھلکی ہوئی۔

اور بے تکلفی سے ویکم نہیں کیا گیا بلکہ ان کے سامنے سب ریزر اور وارنٹل سے رہتے ہیں۔
 ”نور خالہ کو کیسے دل و جان سے سب سر آنکھوں پہ بٹھا رہے ہیں۔“ اس نے دل میں محرومی کا احساس ابھرتا محسوس کیا۔

”مئی بھی تو سب سے فاصلے پر رہتی ہیں۔ نہ کسی سے بے تکلف ہوتی ہیں، نہ کسی کے مذاق پر مسکراتی ہیں بلکہ مذاق کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر ناراض ہو جاتی ہیں، اسی لیے کوئی ان سے مذاق کی جرات نہیں کرتا۔ خود بھی خاندان میں مقبولیت حاصل نہ کر سکیں اور مجھے بھی اس اعزاز سے محروم ہی رکھا مگر کیا کیا جائے۔ مئی کے ناپ تول کے پیمانے بہت مختلف ہیں۔ وہ ”خاندانی“ پسندیدگی کو کسی کھاتے میں ہی نہیں رکھتیں۔ وہ ان لوگوں کو اپنے پائے کا ہی نہیں سمجھتیں کہ بے تکلف ہوں۔ وہ تو خود کو کسی اور ہی پیمانے سے ناپتی ہیں۔ اپنا کیریئر، اپنی کامیابیاں، اپنی فٹنس، اپنے دونوں پارلرز کی روز بروز بڑھتی مقبولیت اور آمدنی اور ابو کے بزنس کی بیرون ملک بننے والی مضبوطی ساکھ۔

وہ حسرت بھری نظروں سے نور خالہ اور ان کی فیملی کے لیے خیر مقدمی کلمات و انداز ملاحظہ کرتی رہی۔ ان کے بچے رابعہ اور قیصر اپنے کزنز کے ساتھ کھل گئے تھے، اس سے بھی سرسری سلام دعا کی پھر وہ آپس میں ہنسی مذاق میں لگ گئے۔
 ”تو اصل بات یہ ہے کہ مجھ میں ایسی صلاحیتیں ہی نہیں ہیں کہ میں دوسروں میں کھل مل سکوں، ان کے ساتھ دوستانہ بے تکلفی برت سکوں۔“ وہ اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ اٹھ کر اوپر بیٹرس پر چلی گئی۔
 حاضرین میں سے کئی ایک نے مز کر اس کو خاموشی سے باہر نکلتا دیکھا تھا۔

”ارے یہ ہماری امریکن نک چڑھی کزن کو کیا ہو گیا۔“ احمد نے حیرانی سے سب کی طرف دیکھا۔
 ”غور ہے، مجھے، سرتاپا غور ہے اور غور و برحق بھی ہے۔“ احسن گھٹنوں کے نیچے کھنکھار کر ایزی ہوا۔
 ”اتنا بے تحاشا حسن اور پھر اس پر امریکہ میں پلنے بڑھنے کا فخر یہ احساس اور سونے یہ سہاگہ۔ اتنے رئیس ماں باپ کی اولاد ہے۔ صبا پچھو کے دونوں پارلرز اسلام آباد کے سب سے پوش میکسٹر میں ہیں۔ جہاں سے ان کی روزانہ آمدنی فی پارلر کم از کم چھ سات ہزار سے نیچے نہیں آتی۔ حیات پھو بھا کا بزنس تو ویسے ہی کب کا کروڑوں کے ہندسے کو چھو چکا ہے اتنا پریش بیک گراؤ نڈ۔ بھی، اگر اس پر بھی وہ غور نہ کریں تو یہ ان کی زیادتی ہوگی۔“ احسن نے بڑے دلچسپ انداز میں اظہار خیال کیا۔
 ”ہم نے تو اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے محترمہ کو اپنے ساتھ کس کرنے کی مگر وہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتیں۔“ عمیر نے شانے اچکائے۔

”میرا خیال ہے، وہ کم گو ہے۔“ سارا نے سادگی سے کہا۔
 ”اور یہ کم گوئی اس کے احساس برتری کا نتیجہ ہے۔“ احسن نے برجستہ کہا۔
 ”اور یہ برتری والدین کی طرف سے ورثہ میں بھی مل سکتی ہے۔“ مدیحہ بولی۔
 ”بالکل، ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“

”مجھے تو صبا پچھو کو سلام کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔“ سارا نے جھرجھری بی بی۔
 ”یہ لوگ تو لگتا ہی نہیں ہے کہ ہمارے خاندان سے ہیں۔ نہ ان کی ادنیٰ حیثیت سے ہم متوجہ کھاتے ہیں نہ ان کی پر تکلف انداز سے ہمارے مزاج ملتے ہیں۔“

”اچھا بھئی، اب کچھ کھانا دانا ہو جائے۔ میرا خیال ہے تمام نشستیں پوری ہو چکی ہیں۔ یعنی ”کورم“ بڑا ہو چکا ہے۔“ احمد بھوک کا بہت کچا تھا۔
 ”اؤنہ، اسامہ بھائی کے بغیر یہ ”کورم“ کیسے پورا ہو سکتا ہے۔“ سارا نے بہت پیار سے اپنے بڑے بھائی کو یاد کیا۔

”ارے، آج تو ان کا ڈرامہ بھی آنا تھا۔ وہی جو سلسلے دار آ رہا ہے کراچی مرکز سے۔“ ڈراموں کی یقین مدیحہ نے ایک دم ہلڑ مچا دیا۔

”ہاں بھئی، آج ہفتہ ہے۔ یاد ہی نہیں رہا۔ چلوٹی وی آن کر دو۔“ سب ٹی وی کی طرف متوجہ دگئے تھے۔
 ”دیکھنا تو سہی، بھائی کی کس اور نقوش ادا کار نعمان اعجاز سے کتنے ملتے ہیں۔“ مدیحہ نے بڑے شوق سے نظریں اسکرین پر مرکوز کیں۔

”اسامہ بھائی نے مارون گولڈ والوں کی طرف سے منعقد کی گئی کارریلی میں بھی توجہ لیا تھا۔“ قیصر نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں بھئی اور ہر سال کی طرح اب بھی انہوں نے ہی یہ ریس جیتی ہے۔ ان کا تو ارمان ہے کہ کس طرح ”بیرس ڈاکار ریلی“ میں حصہ لیں اور اپنی ڈرائیونگ کے بہترین جوہر دکھائیں۔“
 ”ان کی ٹیکچر رش کیسی چل رہی ہے۔ ایچ ایٹ کالج میں پڑھا رہے ہیں نا۔“ رابعہ نے تصدیق پائی۔
 ”ہاں، بوٹنی کے ٹیکچر ہیں۔“ سارا نے فخریہ کہا۔

”اور ہمارے بھائی شو بڑے وابستہ ہونے کے باوجود بہت شریف، نمازی اور دین دار انسان ہیں۔“ احسن کے چہرے پر چمک تھی۔

”ویسے یقین نہیں آتا کہ ایک انسان میں اتنی ساری خوبیاں اور صلاحیتیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں۔ ایم ایس سی بوٹنی، ٹیکچر، کارریلی کے باقاعدہ والینٹر، شو بڑے مقبول ہیرو اور اس کے ساتھ ساتھ مذہبی احکامات کی بھی مقدور بھر پابندی کرتے ہیں۔“

رابعہ کے لہجے میں بے یقینی سی تھی۔ اسامہ کے ذکر پر رابعہ کا چہرہ جھلما اٹھا تھا۔
 ”بس دیکھ لو۔“ سارا تاز سے بولی۔ ”اسامہ بھائی بہت غیر معمولی انسان ہیں۔“

”میں نے سوچا تھا، بھائی اچھی اچھی ہیر وینس پھنسا میں گے تو ہماری بھی بات بن جائے گی مگر وہ تو سیٹ سے اترتے ہی اپنی ساکھی ادا کاراؤں سے یوں اجنبی بن جاتے ہیں، جیسے بھی جان پہچان ہی نہ ہوئی ہوتی بھائی جان کو ادھر ادھر منہ مارنے کی عادت نہیں ہے۔“ سارا نے گھور کر بھائی کو دیکھا۔

”ہاں بھئی، وہ تو اتنی گوری چینی، کم عمر امریکن کزن کو بھی لفٹ نہیں کراتے۔“ احسن نے سرگوشی کی اور سب کے قہقہوں نے اس کی بات کی تائید کی تھی۔

☆☆☆

”اسامہ بیٹے! اسلام آباد سائیڈ پہ جارہے ہو تو ایف سیون تھری بھی ہوتے جانا۔ تمہاری صبا پچھو کے لیے کچھ چیزیں رکھی ہیں، اسے پہنچا دینا۔ اس ویک اینڈ پر مصروفیت کی بنا پر انہیں سکی تھی۔“

”آئی ایم سوری اماں جی! میں بی بی وی ہیڈ کوارٹر جاؤں گا۔ ایف سیون کی طرف نکلنا نہیں بنتا۔ آپ احمد یا علی سے کہہ دیجیے گا۔“ وہ شائستگی سے گویا ہوا۔

”لو، وہ تو کب کے قح کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔“ اماں جی نے بتایا۔

”کرکٹ میچ ہے کسی دوسرے شہر کی ٹیم سے۔ وہ صبح صبح چھ بجے گراؤنڈ میں پہنچ گئے تھے۔ پریکٹس بھی تو کرنی ہے۔“ چچی جان نے وضاحت کی۔

”اچھا۔“ وہ مجبور ہو گیا۔ ”لایئے، وہ سبھی پھر۔“ وہ کالا شاپرے لے کر گھر سے نکل گیا۔

اپنی گرین خیر اشارت کی اور بی بی وی ہیڈ کوارٹر چلا آیا۔ شناخت کی تو اسے ضرورت نہیں تھی کہ اس کا چہرہ ازخو اس کی پہچان تھا۔ وہ سیدھا پروگرام منیجر کے پاس پہنچا جو سرکاری طور پر پروڈیوسر کے عہدے سے منجنگ کی طرف آیا تھا۔ وہ اسے ایک تاریخی ڈرامے میں رول دینا چاہتا تھا۔ ایک زمانے میں جب وہ پروڈیوسر تھا تو اس کے بنائے گئے دو کامیاب ڈراموں کا مین ہیرو اسامہ ہی تھا۔

”اپنا بخاری صاحب یہ ڈرامہ کر رہے ہیں اور انہوں نے آپ کا انتخاب کیا ہے میرے کہنے پر۔ ہمیں سپہ سالار کے رول میں جو تمانت، جرأت اور عزم و استقلال چاہیے وہ تمہارے چہرے پر واضح طور پر نمایاں ہے۔ میرا خیال ہے، اس کردار کے لیے تم سے زیادہ اور کوئی موزوں نہیں رہے گا۔“

”اوکے۔“ وہ زیادہ حیل و دجٹ کرنے کا عادی نہیں تھا، نہ ہی کسی رول کے لیے کسی پروڈیوسر، ڈائریکٹر کی خوشامد اور چالوئی کرنے کا قائل تھا۔

اتفاقاً ہی اس فیلڈ میں آگیا تھا۔ اس کے اسٹوڈنٹ کا باپ پروڈیوسر تھا۔ وہ سالانہ امتحانات کے موقع پر اسے نیچے کارزلٹ ڈسکس کرنے کا کالج آیا تو اسامہ سے ملاقات ہوئی۔ اسے بی بی وی میں کام کرنے کی پیشکش کی۔ بعد ازاں خود فون کر کے ایک رول آفر کیا۔ اسامہ نے قبول کر لیا۔ اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا اور یوں اوکاڑی کا سلسلہ راز ہوتا گیا۔ اچھا رول ازخو دل جاتا تھا تو وہ کر لیتا تھا، نہیں تو اپنی ساری توجہ پھر رشپ اور کارریس کے لیے پریکٹس کرنے میں صرف کر دیتا تھا۔

”کل بخاری صاحب سے کسی وقت مل کر ٹائمنگ طے کر لیتا۔ میرا خیال ہے تمہارا ایک اور کامیاب ڈرامہ بھی آن ایئر جا رہا ہے کراچی کے مرکز سے۔“

”جی۔“ اس نے ایک بار پھر مختصر جواب دیا۔

”اس ڈرامے کی ہر قسط ایک ہفتے پہلے تیار کی جاتی ہے، اس لیے اس کے ساتھ مسلسل انگیج رہنا پڑتا ہے۔ آپ بخاری صاحب سے کہہ دیجیے گا کہ میرے اس شیڈول کو مد نظر رکھیں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے، میں کہہ دوں گا۔ چائے یا کوئلڈ ڈرنک منگواؤں۔“

”نوسر، جھینک یو۔“ وہ اللہ حافظ کہہ کر کمرے سے باہر آگیا اور لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر پہنچ کر اس نے پارکنگ ایریا کی راہ لی۔

”ارے اسامہ جی! آپ یہاں کہاں؟“

ابھی وہ کوریڈور سے آگے احاطے میں آیا ہی تھا کہ اسے معروف اداکارہ نشاء مل گئی۔ سرخ کڑھائی کے سیاہ جاکٹ کے ٹیس سوٹ میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ اپنی خوب صورتی اور دلکش اداؤں کے

ظہن کا دل موہ لیتی تھی۔ اچھے متمول طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کا رکھ رکھاؤ بڑے گھروں کی بڑی مگر زیادہ سادگی اور پراعتماد لڑکیوں کی طرح تھا جو اپنی نزاکت، ذہانت اور اعتماد کی بنا پر اپنی بی بی ہیں۔

”جھجھ پر وگرام منیجر صاحب نے بلایا تھا، کسی نئے تاریخی ڈرامے کا رول ڈسکس کرنے۔“ اسامہ نے مخصوص اور محتاط طبیعت کے مطابق مختصر اور جامع جواب دیا۔

”بہت خوب، جھجھ بھی اسی مقصد کے لیے کال کیا گیا ہے۔“ نشاء مسکرائی۔ ”اس کا مطلب ہے، مے میں بھی میں اور آپ ساتھ کام کریں گے۔“

”بی۔“ اسامہ بولا۔ جو ڈرامہ آج کل آن ایئر جا رہا تھا، اس کے ٹائٹل رول وہی دونوں کر رہے

”اجازت دیجیے گا، میں ذرا جلدی میں ہوں۔“

”بی ضرور۔“ اس کی سنجیدہ فطرت اور شائستہ و متین انداز کی بدولت نشاء اس کی بہت عزت کرتی

اسامہ وہاں سے ایف سیون تھری آیا، جہاں صبا پھپھو کی کوٹھی واقع تھی، وہاں سڑک کے ایک نوٹو اساکر اوٹو اس کے پیچھے بڑے بڑے بلند و بالا سرسبز پہاڑ تھے۔ مارگلہ ہلز کا قریب سے رنے کے لیے یہ جگہ بہت موزوں تھی۔ دوسری طرف پورا ایف سیون تھری کا سیکٹر تھا۔ اصل میں ہوکا گھر سیکٹر کے بالکل اختتام پر بنائی جانے والی قدرے سنسان روڈ پر واقع تھا۔ اس جگہ پر اتنی اور سکون طاری رہتا تھا کہ اگر کوٹھیوں کے گیٹ کے باہر کیمین بنا کر بیٹھے سیکورٹی گارڈ نظر نہ آتے تو بادی النظر میں یہی لگتا تھا کہ یہ علاقہ غیر آباد ہے اور انسانی وجود سے مبرا ہے۔ ہاں، کبھی کبھار گزرنے والی گاڑیوں کے بارن اس سکوت میں خلل ڈالتے تھے۔

پارلر کی وجہ سے گیٹ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ باہر سرسبز قطعہ باڑ، لگا کر کور کیا گیا تھا۔ باڑھ کے پاس گاڑی اپنی رائفل ہاتھ میں لیے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”جی صاحب! آپ کو کس سے ملنا ہے؟“

”صبا پھپھو سے۔ ان سے کہیے، اسامہ آئے ہیں حسن منزل سے۔“ اس نے گاگلز اتار کر جیب

الٹے ہوئے کہا۔

”مالکن تو گھر پہ نہیں ہیں۔“

”کہاں گئی ہیں؟“

”وہ دوسرے پارلر گئی ہیں۔ تین سے چھ تک وہ ایف سکس والے پارلر میں بیٹھتی ہیں۔ یہاں پارلر

ان کی اسٹینٹ لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ جب مالکن آجاتی ہیں تو ان لڑکیوں کی چھٹی کردی جاتی

گاڑی نے تفصیلی جواب دیا۔

”گھر میں اور کون ہے؟“ کچھ سوچ کر اسامہ نے سوال کیا۔

”بس بے بی ہوتی ہیں اور تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ صاحب اکثر باہر ہی رہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، انہیں بلا دیں۔“
”سوری صاحب! بے بی کو مالکن کی غیر موجودگی میں گیٹ سے باہر آنے کی اجازت نہیں۔
گارڈ نے معذرت کی۔“

”اچھا بھئی، مجھے تو اندر جانے کی اجازت ہے ناکہ وہ بھی نہیں ہے۔“ وہ جھلکا۔
”جی جی صاحب! آپ ان کے کزن ہیں، آپ ضرور اندر جائے۔ آپ پہلی بار آئے ہیں
لیے بتا دوں کہ ڈرائنگ روم اوپر ہے۔ نیچے ڈرائنگ روم کی جگہ پارلر بنایا گیا ہے۔ آپ سائیڈ والا
کھول کر اندر داخل ہوں گے تو سامنے میز ہیاں ہیں، سیدھا اوپر چلے جائے گا۔ ویسے تو اندر گھر کی
بھال اور کام کرنے والی دولڑکیاں موجود ہیں، وہ خود ہی آپ کو گائیڈ کریں گی۔“
گارڈ ایک سانس میں بتاتا گیا۔

اسامہ نے خاموشی سے ہونٹ پیچھے، قدم آگے بڑھا دیے۔ اسے زیادہ بولنے والے لوگوں
کر بہت کوفت ہوتی تھی۔
فرنٹ ڈور کے اوپر پارلر کی تختی لگی تھی۔ سائیڈ ڈور گیراج میں کھلتا تھا۔ اس نے دروازے کا
کھینچا تو وہ از خود کھل گیا۔

وہ بہت جلدی میں تھا، اس لیے ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھا سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ سیڑھوں
اختتام پر بڑا سالانہ ٹیپ ہال تھا، جہاں دو صفو سیٹ مع ڈیکوریشن ترتیب سے لگے ہوئے تھے۔
سائیڈ پر چونسٹھ انچ کالی دی رکھا ہوا تھا، اس کے نچلے خانے میں سی ڈی پلیئر نظر آرہا تھا۔
بائیں دیوار پر دو دروازے تھے۔ ایک کھلتا تھا اور اندر سے ایک بیڈ روم کا پورا پورا سین نمایاں
بالکل سامنے ڈبل بیڈ تھا جس پر خوب صورت بیڈ کور بچھا ہوا تھا۔ سامنے والی دیوار پوری کا
سے بھری ہوئی تھی۔ جو ٹیپ سے چپکائے گئے تھے۔ بیڈ کی پائنتی کے مقابل بڑی سی رائٹنگ ٹیبل تھی
پر کتابوں کے بجائے سی ڈی ریک۔ بیڈ روم کے امپورٹنڈ ڈیک، آڈیو سیسٹم اور کچھ سجاولی اشیاء رکھی
تھیں۔ میز کے دائیں جانب خالی جگہ پر کٹن رکھ کر اس پر بے شمار اسٹنٹ ٹوائز سجائے گئے تھے۔
ٹیڈی بیر بیڈ کے درمیان میں استراحت فرما رہا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر بھی ایک جدید کیسٹ پلیئر رکھا ہوا
جس کے دو بڑے بڑے اسپیکر دونوں بیڈ سائیڈز پر چھوٹی میزوں پر رکھے تھے اور اس وقت
آواز میں انگلش میوزک کمرے میں گونج رہا تھا۔

کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اور واش روم سے پانی گرنے کی آواز میوزک کی ہلکی بیٹ پر بچاؤ
سنائی دے جاتی تھی۔
صوفے پر بیٹھے بیٹھے اسامہ نے پورے بیڈ روم کا جائزہ لے لیا تھا۔ (اور کچھ تھا بھی تو نہیں کر
کو) دروازے کے اوپر ”ڈوناٹ ڈسٹرب“ کا غز یہ لکھ کے چپکایا گیا تھا۔ سامنے والی دیوار پر ہاتھ
نے کارٹونز اور دیگر بچکانہ جملے بھی کاغذ پر لکھ دکھائی دے رہے تھے۔ مثلاً اپنے نام کا شارٹ ”رو“
امریکن دوست کا نام ”جینی“ کچھ تصویریں بھی فریم کر کے بیڈ کی پشت پہ بنے چوڑے خانے میں
لگی تھیں۔

اسامہ اپنے مشاہدے میں مگن تھا کہ پچھلی طرف سے میز کا دروازہ کھلا، اس نے گردن موڑ کر
اٹھارہ بیس سال کی دہلی پتلی کالی بھنگ لڑکی عینک لگائے ہاتھ میں دھلے ہوئے کپڑے اٹھائے
نا سے دیکھ رہی تھی۔

”آ۔۔۔ آپ۔۔۔!“ یقیناً وہ ملازمہ تھی۔
”میں صبا پھوپھو کا بھتیجا ہوں۔ ان کے بڑے بھائی کا بڑا بیٹا۔۔۔“ اس نے اپنے مزاج کے
وضاحت سے جواب دیا۔
”میڈم تو گھر پر نہیں ہیں۔۔۔“

”ان کی بیٹی تو ہیں۔ انہیں بلا دیں۔ اماں جی نے کچھ چیزیں بھیجی ہیں ان کے لیے۔“
”جی۔۔۔ روحا بس ابھی واش روم سے فارغ ہو کر آئی ہے۔ روحا، روحا۔۔۔“ وہ بیڈ روم میں جا
ش روم کا دروازہ بجانے لگی۔

”آ رہی ہوں۔۔۔“ روحا کی غصیلی آواز پر وہ جھبک کر پیچھے ہو گئی۔
”بے بی آ رہی ہیں۔۔۔“ وہ اسامہ سے کہہ کر نیچے چلی گئی۔
تھوڑی دیر بعد ہاتھ روم کا دروازہ کھلا۔
”کیا آفت آگئی ہے۔۔۔ سرین۔۔۔“

وہ نیوی بلو ٹراؤزر، نیوی بلو ہڈ والا زیپر پہنے ہوئے تھی جس میں اس کے بھرپور متناسب جسم کا ہر
بنایاں ہو رہا تھا۔
چہرے سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے اور وہ دھلے ہوئے گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا لے
کو چھوٹے بال عجیب بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے، جیسے انہیں سلکھانے کا موقع نہ ملا ہو۔ کچھ
اچہرے پر چپکی ہوئی تھیں، باقی شانوں اور کمر پر پریشان تھیں۔

اسامہ کو اس کا حلیہ دیکھ کر اپنا غصہ ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔
وہ یوں بھی ایسی ”ماہی منڈا نا پ“ مغرور سرکش اور بد وماغ لڑکیوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اسی لیے
منازل میں کئی بار ملاقات کے باوجود اس نے اس لڑکی کو کبھی لفٹ نہیں کروائی تھی۔
”آپ کے لیے اماں جی نے یہ چیزیں بھیجی ہیں۔“ وہ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر شارپ صوفے پر
ریزی سے کھڑا ہو گیا۔

”ارے۔۔۔ آ۔۔۔ آپ۔۔۔ اسامہ بھائی، پلیز بیٹھے نا۔۔۔“ وہ اچانک اسے سامنے پا کر
تو بولکھلا ہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔

اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر شانوں پہ بکھرے بالوں کو سمیٹنے لگی۔
اس کی اس بے تکلف ادانے اسامہ کے ماتھے پر بڑی ناگواری کی شکلوں کو مزید بڑھا دیا تھا۔
”صبا پھوپھو کو بتا دیجیے گا۔“ وہ قدم بڑھا چکا تھا۔
”آپ چائے، کالی، کوئلڈ ڈرینک، کچھ تو پیجیے نا۔“ وہ پریشانی سے اس کے پیچھے سیڑھوں تک آئی۔

”نوٹھنک ہو۔۔۔“ وہ خشک انداز میں کہتا بیڑھیاں اترتا چلا گیا۔
روحابت بنی کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

اسے حسن منزل سے آئے ہوئے ایک معزز مہمان کے یوں آنا فانا بغیر خاطر مدارت کے جانے پر افسوس تھا۔

”پتا نہیں اسامہ بھائی مجھ سے اس قدر ناراض کیوں رہتے ہیں۔ ایسے دیکھتے ہیں جیسے کسی بجز گھور رہے ہوں۔ اول تو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔“ وہ پشمرہ سوچوں میں گھری بیڈروم میں واہ آ گئی۔

”آخر سب لوگ مجھ سے اس قدر ناراض کیوں رہتے ہیں۔ کوئی خلوص دل سے میرا دوست نہ بنتا۔“

وہ افسردگی سے سوچتی رہی۔

کالج میں بھی اس کا یہی حال تھا۔ پچھلے ایک سال سے وہ جان توڑ کوشش کر رہی تھی، اپنے گروہ کی سرگرم اور ہاتھوں ہاتھ لی جانے والی سوشل ممبر بننے کی۔ اسے لگتا تھا وہ اس معاملے میں نہایت ٹھنک اور بے تاثر ہے۔ وہ ایک دن کالج نہ آئی تو کسی کو اس کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ نہ ہی کوئی بڑھ اس سے نہ آنے کی وجہ پوچھتا تھا۔ وہ لائبریری چلی جاتی تو کوئی دوست دوسرے پیریڈ میں ملنے کے لیے اس سے وقتی غیر حاضری کا سبب نہیں پوچھتی تھی۔ نہ اس سے بے تابی کا اظہار کر کے ناراض ہوتی تھی جب کہ گروپ کے باقی ممبرز آپس میں اسی طرح مضبوط پابند بنے ہوئے تھے۔ وہ خود ان کی دیکھا دیکھ دوسروں کے لیے ایسی ہی بے تابی اور خیالی و توجہ دکھاتی تھی۔ گروپ کی کسی لڑکی کی سالگرہ ہوتی تو پرجوش مبارک باد دیتی۔ ڈھیروں تحفے دیتی، مگر پھر بھی وہ لڑکی اس کے ساتھ اس لیول پر دو تہی نہیں کرنا تھی جس طرح باقی ممبرز کے ساتھ کرتی تھی۔

وہ مایوس اور بد دل ہونے لگتی۔

”مجھ میں ایسا کیا ہے کہ میں کسی کو اپنے خلوص اور اپنی سچی محبت کا احساس نہیں دلا پاتی۔ بے شک میں نے امریکن ماحول میں پرورش پائی ہے، لیکن میری تربیت تو خالص پاکستانی اسٹائل پہ گئی ہے۔ لڑکیاں مجھے خود سے الگ کیوں سمجھتی ہیں۔ مجھ سے کوئی بات شیئر کیوں نہیں کرتیں۔ میرے بھی وہی طوطا طریقے ہیں جو ان کے ہیں۔ مجھے بھی ان کی طرح گھر سے آسانی سے پریشانی نہیں ملتی دوستوں کے گھر جانے کی۔ میرے والدین بھی وہی سختی روا رکھتے ہیں جو دوسروں کے۔ مجھ سے بھی ایک ایک منٹ حساب لیا جاتا ہے۔ جیسے دوسری لڑکیوں سے کالج سے ویرے آنے پہ لیا جاتا ہے۔ میں بھی ان میں سے ہی ہوں۔ مگر یہ یقین ہی نہیں کرتیں۔ مجھے کوئی بہت الزام آؤ سوسائٹی کی نمائندہ سمجھتی ہیں۔ حالانکہ ایک بات ہرگز نہیں ہے۔ مٹی نے بے شک مجھے بہت آسائش دی ہیں۔ مگر آزادی بالکل بھی نہیں دی نہ ہی اتنی آزاد خیال ہیں۔

اسے لگتا تھا اس کی سہیلیاں اسے عجیب نظروں سے دیکھتی ہیں۔ بارہا انہوں نے بے تکلفی سے اس کے بوائے فرینڈز اور ڈرنک کرنے کے بارے میں پوچھا تھا۔

”ارے بھئی، بتا دو، ہم سے کیا چھپانا۔ وہاں کارہن بہن، وہاں کا ماحول، وہاں کا لباس، ہر چیز کی پوچھ تو ہے تمہاری شخصیت پر۔۔۔“ روشا نے اس کی سب سے پسندیدہ سیٹھلی کیسے دل دکھانے والے تے کیا کرتی تھی۔
وہ بہت دیر تک اندر ہی اندر جلتی کڑھتی رہی۔

☆☆☆

”روحانا! تم یونیفارم پہنچ کر کے میرے کمرے میں آؤ۔“
وہ سائیڈ والے ڈور سے اندر داخل ہوئی تو مٹی نے پارلر سے نکلے ہوئے تختی سے اسے حکم دیا۔
ان کو غصے میں دیکھ کر وہ بری طرح سہم گئی۔

اوپر گئی تو اس کے سر صوفے پر براجمان دکھائی دیے۔ وہ ان سے تینوں اختیاری مضامین کی ٹیوشن لی۔

”السلام علیکم۔۔۔ سر! آپ آج کچھ جلدی آگئے۔“

”جی مجھے آپ کے ہاں سے فارغ ہو کر ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ اس لیے آدھا گھنٹہ پہلے ہوں۔ آپ اطمینان سے پہنچ کر لیجیے اور اگر کھانا دانا کھانا ہے تو بھی۔۔۔“

”نوسر! میں نے کینٹین میں کھالیا تھا۔ میں بس پہنچ کر کے مٹی کی بات سن کر پانچ منٹ میں آ رہی تھی۔“

تھوڑی دیر بعد وہ مٹی کے روبرو تھی۔

”جی مٹی۔۔۔“

”مٹی کی بچی۔ یہ تم کالج میں کیا گل کھلا رہی ہو؟“ وہ برس پڑیں۔

”میں سمجھی نہیں۔“ وہ خوف زدہ نظر آئی۔

”تمہارے ٹیوٹر نے کہا ہے کہ آپ کی بچی کالج میں کیا کرنے جاتی ہے۔ نہ کوئی کلاس اینڈ کرتی، نہ اپنے سلیبس کی کچھ خبر ہے۔“ وہ بری طرح غصے میں دکھائی دیے رہی تھیں۔

آج کل اس کے ایگزٹام قریب تھے اور مٹی نے سر سے درخواست کی تھی کہ ان تین سبجیکٹس کے وہ دوسرے جنرل مضامین بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ اگر روحا کو اس میں سے کچھ پوچھنا ہو تو سمجھا دیجیے۔

کل اس کا پاکستان اسٹڈیز کا پیپر تھا۔ سر نے پرسوں سے اس کی تیاری شروع کرائی تو پتا چلا کہ موز کو چیپٹرز کے نام تک نہیں آتے۔ ٹاپک کی ڈسکشن تو ایک طرف رہی۔

ٹیوٹر نے صاف کہہ دیا تھا۔

”میڈم! اونکا کوئی بھی ٹیوٹر ایک دن میں کتاب کو گھول کر نہیں پلا سکتا۔ میرا تو خیال تھا، انہوں نے عمومی اسٹڈی کر رکھی ہے۔ صرف کچھ ٹاپکس میں پرائیم ہو رہی ہے۔ لیکن انہیں تو پاکستان اسٹڈیز کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں آتا۔ اب میں ایک دو دن میں انہیں کیسے اس سبجیکٹ کی تیاری کرا سکتا ہوں۔ جس کے بارے میں غالباً انہوں نے کوئی کلاس اینڈ کرنے اور کتاب کھولنے کی زحمت بھی نہیں

کی ہے۔ مجھے شک نہیں سو فیصد یقین ہے کہ انہوں نے ایک کلاس بھی اینڈنٹ نہیں کی ہوگی۔“
اور صبا سر تھام کر رہ گئی تھیں وہ بڑی بے چینی سے اس کے کالج سے واپس آنے کا انتظار کرتی تھیں۔

وہ اتنی غصے میں تھیں کہ دو تین تھپڑ بلا روخ اس کے منہ پر دے مارے۔
وہ مار کھانے کی بجائیں سے عادی تھی۔ اس کے لیے یہ کوئی حیران کن بات نہیں تھی۔ مگر ہر بار اپویشن پر وہ خوف اور ہشت کے مارے بری طرح لرزے لگتی تھی۔
”نالائق۔۔۔ کئی لڑکی! میں تمہارا وہ حشر کروں گی کہ تم یاد رکھو گی۔ آوارہ، کیا کرتی رہتی ہو سارا کالج میں۔ کلاسز اینڈنٹ نہیں کرتیں تو پھر کہاں ہونی ہو؟“

وہ اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی تھیں۔ گو کہ جس کلاس سے روحا کا تعلق تھا، وہاں عموماً نہیں ہوا کرتا۔ مگر یہ ایک انوکھا اور پیش کش کیس تھا۔ صبا بچپن سے ذرا سی بات پر اپنے بچوں کو دھک رکھ دیتی تھیں۔

خود میر بھائی اس کی کسی غلطی پر بنا دوسری بات کے سیدھا کرار تھپڑ رسید کرتے تھے۔ اور اب کہنا ہی کیا۔

بظاہر اتنے نفیس اور اعلا سماجی گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ سب اپنے سے چھوٹا جاہلوں کی طرح مارنا مار مل خیال کرتے تھے۔ یہ فیملی دوہری شخصیات رکھنے والے افراد کا مجموعہ تھی۔ کے ظاہری مہذب اور کچھ ڈاسٹل کے پس پردہ درشت کھر دے اور دحشت زدہ ردیے چھپے ہوئے تھے۔

وہ چپ چاپ تھپڑ کھاتی رہی۔
کیا بتاتی کہ اپنی دوستوں کے گروپ کو جوائن کرنے کے لیے وہ اپنی کئی کلاسز چھوڑ دیتی تھیں کیونکہ اتفاق سے وہ پیریڈ ان کے فری ہوتے تھے جب کہ روحا کا کبھی میٹن مختلف تھا۔ اس کی اینڈنٹ بہت شارٹ تھی۔ بلکہ اسے تو ڈر تھا، اس بار اس کا سینڈائیز کا فاسٹل کا داخلہ روک لیا جائے گا۔ وہ کیا کر اس کا پڑھائی میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔

کتاب کھولتی تو ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔
”تین تین سبجیکٹس کی ٹیوشن لگا کے دی ہیں، پھر بھی صاحبزادی دھڑا دھڑاٹیل ہو رہی ہے ٹیوٹر بے چارہ کیا کرے۔ وہ سمجھا ہی سکتا ہے، نہ دماغ میں زبردستی گھسا سکتا ہے۔ نہ تمہاری جگہ جا پیپر زدے سکتا ہے۔“

”مئی! سبجیکٹس بہت مشکل ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتے۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔
”جب تم دلچسپی نہیں لو گی تو خاک سمجھ میں آئے گا۔“ وہ غرائیں۔

”تم جانتی ہو، تم پر ہر ماہ کتنا خرچ ہوتا ہے؟ تمہاری ٹیوشن، تمہارے ڈرمیٹر، تمہاری دلچسپ شاپنگ، تمہارے ڈھیروں ڈھیر مہنگے تحائف کی خریداری، جنہیں بے دردی سے اپنی سہیلیوں پر لے ہو۔ اتنا پیسہ لگا رہے ہیں تم پر۔ اور جواب میں صرف ایک توقع، ایک چیز ڈیمانڈ کرتے ہیں تم سے کہ تم

نہیں تھی۔

وہ آزر دگی سے اماں جی کے پاس آگئی۔

”میں تھوڑی دیر آرام کروں گی اماں جی۔۔۔!“ صبا کچھ دیر تک گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر عادت اور پرچلی گئیں، جہاں ان کے لیے ایک کمر مخصوص کر دیا گیا تھا۔

”حسن منزل“ میں وہی رونقیں تھیں۔ وہی ہنگامے، وہی چھیڑ چھاڑ، وہی گہما گہمی۔۔۔ جہاں ہمیشہ خود کو مس فٹ محسوس کرتی تھی۔

”مزید دو بکرے آگئے۔۔۔“ علی اور احمد نعرہ مستانہ لگاتے ہوئے خوشی خوشی اندر آ گئے تھے۔

”اچھا۔۔۔ کس رنگ کے ہیں؟“ مدیحہ اور سارا نور ان کے دیدار کے لیے باہر لپکیں۔

”خوب ٹکڑے اور اونچے لمبے جن کے لائے ہیں۔ ارے بھی صبا پچھو کے بکرے ہیں آخر

ان ہی کی طرح معزز اور بیش قیمت اور۔۔۔“

ولی اپنی جھونک میں بولتا ہوا آیا تھا کہ سامنے روکا کو دیکھ کر زبان دانتوں تلے دبالی۔

”بولنے سے پہلے کچھ دیکھ تو لیا کرو۔“ سارا نے سرگوشی میں کہتے ہوئے ولی کو کہنی ماری۔ جو

نے صاف دیکھ لی تھی۔

”کب ذبح ہوں گے یہ بکرے؟“ علی نے کھڑکی سے لگ کر حسرت سے باہر چھوٹے سے

میں بندھے بکروں کی قطار کو دیکھا۔

”ہا۔۔۔ کب کھائیں گے ہم، ان کا لذیذ گوشت۔۔۔“ احمد نے آگے سے ٹکڑا جوڑا۔

”کب نہیں گے ان کے سچ کباب، جتنے بوٹی، مٹن، کڑا ہی۔“ ولی نے حاشیہ چڑھایا۔

”نی الحال تو اباجی تمہاری تلتہ بوٹی بنانے آرہے ہیں۔ صبح سے بے زبان بے چارے بھو

بندھے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے چارہ کون خرید کے لائے گا۔“ مدیحہ نے باہر سے آکر اطلاع دی۔

”گیا تو ہے احسن۔۔۔“ ولی نے کسل مندی سے پاؤں صوفے پر بٹا دیے۔

”احسن۔۔۔! وہ آج کا گیا کل لوٹے گا۔“ غیر نے سر جھٹک کر پیش گوئی کی۔

”چلو۔۔۔ وہ کہیں بھی گیا، لوٹا تو میرے پاس آیا۔ آئے گا تو سہی نا۔“ مدیحہ نے شوخی سے

کندھا مارا تھا۔

”لوٹا۔۔۔ ارے بھی کہاں ہے لوٹا۔ میں لان کے پودوں کو پانی ہی دے لوں۔“ چچی جان۔

اپنی دھن میں پکار لگاتی تھی۔

ہال کمرے میں ادھر ادھر بے ساختہ تہقبہ ابھرنے لگے۔

”اس قلعے کو لان کہہ کر آپ لان کی تو بین کر رہی ہیں چچی جان!“ احمد نے دہائی دی۔

”ہے تو سہی نا۔ جھوٹا سا ہے تو کیا ہوا۔ شکر ادا کر، اتنا بھی ہے۔“ اماں جی نے اپنے مخصوص اند

میں ڈپٹا۔

”ہاں بھئی۔۔۔“ احمد نے سراٹھا کر اوپر دیکھا۔ ”شکراً الحمد للہ۔“

”یہ بکرے بے چارے کب سے بھوکے بندھے بیٹھے تمہارے جانوں کو زور ہے ہیں۔ بر خور

ان بے زبانوں کا بھی کچھ خیال کرو۔ محض دو تین دن کے مہمان ہیں۔“

اباجی شور کرتے ہوئے اندر آئے، تو ساری جوان پودا یک دم سے نشستیں بدل کر مودب اور مستعد

ہو گئی۔

”اباجی! ابھی صبح تو ان ”صاحبان“ کو پورے گھنٹے کی سیر کرائی ہے گراؤنڈ کے سبزے کی۔“

احمد نے جھٹ صفائی پیش کی۔

”ارے بیٹے! جانور کو گاہے گاہے بھوک لگ جاتی ہے۔ ان کے آگے کچھ بھی نہیں پڑا ہوا۔ لڑکیو!

اور نہیں تو چنے کی دال اور کچھ روٹی کے ٹکڑے ہی ڈال دو۔“

”جی اباجی! میں ابھی کڑا ہی میں ڈالتی ہوں۔“ سارا پھرتی سے کچن میں گئی اور لوہے کی کڑا ہی

میں چنے کی دال ڈال کے باہر لے گئی۔

”کسی کھلے برتن میں پانی بھی رکھ دینا۔“ اماں جی نے تاکید کی۔

”اور بیٹے! تم سناؤ۔“ ٹیکسٹری کے کیا حالات ہیں۔“ اماں جی اپنے بڑے بیٹے سے مخموت گتو ہو گئیں۔

”بھلا اپنی ٹھنڈ میں بکرے پانی کیسے پیئیں گے۔“ احمد نے کان کھجائے تھے۔

”یہ تم بکروں سے جا کر پوچھ لینا۔“ غیر نے جل کر کہا تھا۔

روح آرام کی غرض سے ساتھ والے کمرے میں آگئی۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔

”ارے یہ سگریٹ کس کے ہیں۔۔۔؟“ اس نے رائٹنگ ٹیبل پر پڑے سگریٹ کے پیکٹ کو اٹھا

کراٹ پلٹ کر دیکھا۔

”کون پیتا ہوگا اس گھر میں۔۔۔؟“ وہ ایک سگریٹ نکال کر سوچنے لگی۔

”شاید احمد بھائی یا احسن بھائی۔۔۔ یا پھر اسامہ بھائی۔“

یہ نام ذہن میں آتے ہی اس نے بے ساختہ جھرجھری سی لی تھی۔

یونہی اس نے سگریٹ نکال کر اپنے لبوں سے لگالیا۔

”بھلا کیا مزا ہوگا اس فضول سی چیز میں، جس کو مر دانتا پسند کرتے ہیں۔“ اس نے لبوں سے نکال

کر اپنی خوب صورت سی ناک سکیڑتے ہوئے سگریٹ کو گھور کر دیکھا۔

پھر بے ساختہ ہنس دی اور اس طرح کھیل کھیل میں سگریٹ دوبارہ منہ میں دبالی۔

وہ میز پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی تھی۔ معاً ساتھ میں ماچس بھی نظر آ گئی۔ اس نے ترنگ میں تیلی

بلائی۔

”بھلا کیسے سلگاتے ہوں گے اسے۔۔۔ یوں۔۔۔“ وہ دل ہی دل میں شرارت کے سے انداز

میں ہنس رہی تھی۔ ارادہ یہ تھا کہ سگریٹ کو سلگا کر ہاتھ میں پکڑ کر اس کے جلنے کا نظارہ کرے گی۔ مگر اسی

لمحے دروازہ کھول کر اسامہ اندر داخل ہوا۔

آتے ہی جو سین لگا ہوں نے دیکھا، اس نے اسے سر پیر تک جھنجھنا کے رکھ دیا۔ اس کے خاندان کی

لڑکی اور سگریٹ پی رہی تھی۔

وہ جو سارا، مدیحہ اور غیر کے سر سے سر کا دوپٹہ دیکھ کر خفا ہو جاتا تھا۔ اسے سگریٹ نوشی کرتے دیکھ

کر اس کا جو رُعل ہو سکتا تھا اس کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا تھا۔

مگر ظاہری طور پر وہ بہت پرسکون اور تحمل نظر آیا۔

”آ۔۔۔ آئیے اسامہ بھائی۔۔۔!“ اسے دیکھ کر روحا کے ہاتھ سے سگریٹ گر گیا تھا۔

”شکریہ۔۔۔ نکل، ہونے کی معذرت چاہتا ہوں۔ آپ اپنا شغل جاری رکھیے۔“ وہ واپس مڑ گیا۔

روحا کا چہرہ، خفت، خوف اور خجالت سے سرخ ہو گیا تھا۔

اس نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا، اپنی حماقت اپنی شرارت کا اعتراف کرنا چاہا مگر اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔

وہ ہاتھ بڑھا کر اسے روک کر کچھ کہنا چاہتی تھی مگر وہ رکا ہی نہیں۔ ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گیا تھا۔

”اللہ! یہ کیا ہو گیا۔ اور اب اگر انہوں نے می کو بتا دیا تو۔۔۔ تو وہ مجھے جان سے ہی مار ڈالیں گی۔“ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

وہ وحشت زدہ سی باہر آگئی۔ اور ادھر ادھر گھوم کر اسامہ کو ڈھونڈنے لگی۔ وہ بکروں کے پاس کھڑا نظر آیا۔

”وہ۔۔۔ اسامہ بھائی۔۔۔ می۔۔۔!“ وہ نظریں نہیں اٹھا پارہی تھی۔

”بے فکر ہیں۔۔۔ میں آپ کی می کو نہیں بتاؤں گا۔“ وہ خشک انداز میں کہہ کر پیچھے ہٹ گیا۔

اس پر جیسے گھڑوں پانی بڑ گیا تھا۔

اس کا جی چاہا، ابھی اسی وقت زمین شق ہو اور وہ اس میں سما جائے۔

☆☆☆

آج عید کا دن تھا۔

”آؤ میرے بکرو۔۔۔ میرے راج ولا رو! دو لہا صاحبان! باری باری سب آجاؤ۔“ احسن بہت چکار کر بکروں کو ہاتھ سے تھکیاں دے رہا تھا۔ ”سب لائن میں لگ کے اپنی باری پہنچ رہے ہوں گے۔ سن لیا نا۔“

”ارے یوں تو نہ کہو۔۔۔ ان بے چاروں کو پہلے ہی چھریاں نظر آرہی ہوں گی۔ کہتے ہیں عید سے تین دن پہلے نظر آنا شروع ہو جاتی ہیں۔“

مدیحہ نے بکروں کے ساتھ از حد ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔

”مدیحہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ ولی نے بھی گھڑے جیسا سر ہلا دیا۔

”اوہو۔۔۔ بڑے بھائی چارے“ کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔“ غیر نے ولی کو چھیڑا۔

”آج تو آپ قتل کر رہی ہیں، مہارانی غیر جی۔“

احسن نے بڑے اسٹائل سے اسے تاڑتے ہوئے سیٹ ماری۔

نیلے ستاروں بھرے آنچل کو سلیقے سے شانوں پہ پھیلائے نیلے سلک کے شلوار قمیص میں نازک سی نیلی پٹیوں والی چپل میں وہ بڑی دل فریب لگ رہی تھی۔

154

”یوں غنڈوں کی طرح مت دیکھو مجھے۔“ غیر نے اس کی نظروں سے پیدا ہونے والی گھبراہٹ کو چپاتے ہوئے اسے ڈانٹا۔

”ظالم نظروں سے تم نہ مجھ کو دیکھو مگر جاؤں گا۔ اد جان جانناں مر جاؤں گا۔“ احمد نگناتے ہوئے بکروں کے گٹلے میں ہار ڈالنے لگا۔

”یار تو کیوں خواجواہ رنگ میں بھنگ ڈالنے بیچ میں گھسا آتا ہے۔“ احسن نے اس کی خبر لی۔

”اچھا خاصا رومانک ماحول بن رہا تھا۔“

”بہت خوب۔۔۔ تو آپ رومانس فرما رہے تھے۔ وہ بھی ان بکروں کے ساتھ یار مانا کہ غیر نامی بد زبان اور تلوار مار کہ لڑکی ہے مگر اب اتنی بری بھی نہیں ہے کہ اس پر ان چوپایوں کو ترجیح دینے لگو۔“

احمر نے اپنی طرف سے غیر سے ہمدردی کی تھی۔

”تمہاری اس معصومیت پر ایک عدد پھیر دینے کو جی چاہتا ہے۔“ غیر نے دانت کچکپائے تھے۔

”دیکھو تو، مہندی لگا کر بکرے کتنے خوب صورت لگ رہے ہیں۔“ اسامہ خواجواہ شور مچا رہا تھا۔

اماں جی بھی باہر آگئی تھیں اور بڑے پیار سے بکروں پر دست شفقت پھیر رہی تھیں۔ وہ آسمانی رنگ کے سوٹ میں لمبوس تھیں۔ سر پر سفید جارجٹ کا دوپٹہ تھا۔ یہ اہتمام عید کی مناسبت سے تھا۔

”ہم نے دھلائی جمع کر گرائی تھی تو خوب کی ہے اماں جی! تب ہی تو مہندی چھڑی ہے۔“ احسن نے اپنی مشقت کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھا۔

”دیکھو، پہلے صبا کے بکرے کٹوا کے گوشت ادھر بھجوا دو۔“ اماں جی نے تاکید کی۔

احمر علی اور احمد قصائی کو پکڑ کر لے آئے تھے۔

”لیکن صبا پھپھو تو یہاں آئی ہوئی ہیں۔ گوشت کون سنہیالے گا؟“ احمر نے سوال کیا تھا۔

”گھر میں ملازم ہیں، وہ صاف کر کے فریز کر دیں گے۔“ اماں جی کہہ کر پلٹ گئیں۔

”صبا بیٹی! آج تو عید کا دن ہے۔ سیر اور اس کی بیوی کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں یہاں۔“ اماں جی نے حسرت سے کہا۔

”عسیر اور شہلا تو چلو پرویس میں بیٹھے ہیں۔“

”وہ اپنی جگہ مصروف ہیں اماں جی! رمیضہ (سیر کی بیگم) کے گھر میں فنکشن ہے۔ وہ رات کو میری طرف آئے گا۔“

”اس سے کہنا، جس منزل کا چکر بھی ضرور لگائے۔“ اماں جی نے تاکید کی۔

”جی بھائی صاحب! میں کہہ دوں گی، آگے اس کی مرضی۔“

”بیٹا! میں ہمیشہ آپ کو کونے میں الگ تھلک بیٹھے دیکھتی ہوں۔ کتنی بار کہا ہے کہ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ اٹھو بیٹھو۔ ان کے ساتھ مل کر ہنسو، بولو۔“ اماں جی نے پیار سے روحا کو بازوؤں میں میٹا تھا۔

”اس کی شروع سے یہی عادت ہے۔“ صبا نے غور سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے بے تاثر انداز میں ماں سے کہا تھا۔

”مگر اب اس عادت کو بدلو بیٹی! اور نہ تمہارا دل کیسے لگے گا یہاں۔ رہنا تو تمہیں اب پاکستان ہی ہے۔“

روح خاموشی سے ہونٹ چبانے لگی۔

”اس کو کچھ اور طرح سے کپڑے سلوا کے دینے تھے صبا!“ وہ کسی کام سے ادھر ادھر ہوئی تو اماں نے دھیرے سے بیٹی سے گلے کیا۔

”وہ ایسے ہی کپڑے پہنتی ہے شروع سے اور یوں بھی یہ کیا برے ہیں۔“ صبا کے انداز: لا پرواہی تھی۔

مشرقی اسٹائل میں پرورش کے باوجود صبا نے کبھی بیٹی کی مغربی ڈریسنگ کو تبدیل کرنے کی طرا توجہ نہیں دی تھی۔ شاید وہ لاشعوری طور پر اس کو وہی بچپن کی چھوٹی سی لڑکی تصور کرتی تھیں، اس لیے امریکن اسٹائل کے لباس اس کے لیے خریدتی تھیں۔ یوں بھی روحا نے شاید ہی پاکستان سے خریدنا ڈر لیں پہنا ہو۔ ممی امریکہ کا چکر لگاتیں تو اکٹھے خرید لیتی تھیں اور ابوتویوں بھی وہیں رہتے تھے۔ وہ ممی تاکید پر اس کے ناپ کے کپڑے بھجوا دیتے تھے۔

روحا اس وقت بنز چمکتی ہوئی شارٹ سلک کی شرٹ اور پنک بیل باٹم ٹائپ ٹراؤزر میں ملبوس تھی گلے میں پنک اسکارف جھول رہا تھا۔ اپنے مغربی لک دیتے چلیے سے قطع نظر اس کے انداز میں سادہ اور معصومیت تھی مگر یہ سادگی کسی ”آنکھ والے“ کو ہی دکھائی دے سکتی تھی۔ باوی النظر میں تو اس خاموشی، مخروہ اور بد و ماغ ہونے کا پتا دیتی تھی۔

بچپن میں سخت مصروفیت تھی۔

تائی اور چچی دونوں بذات خود موجود تھیں۔ عائشہ آپنی بھی آئی ہوئی تھیں۔ لڑکیوں کا ٹولہ گوشہ دھونے میں مصروف تھا اور لڑکے پراتیں بھر بھر کے گوشت اندر لا رہے تھے۔

اباجی محلے اور عزیز واقارب میں گوشت بانٹنے پر مامور تھے اور تو اور آسانی رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس پشادری چیپل پہنے اسامہ بھی اس کام میں برابر کا شریک تھا۔

”ہائے، بے چارے بکرے۔“ ولی نے ٹھنڈی سانس لی۔

”اب ہمارے پیٹ میں ڈکراتے پھریں گے۔“ علی ہنسا۔

”تائی جان! کبھی ہم آپ کے ہاتھ کی ہی کھائیں گے۔ کہیں آپ لڑکیوں کی ڈیوٹی لگادیں۔“ دا نے بچپن میں آکر لاڈ سے فرمائش داغی تھی۔

”ہاں ہاں، جیسے پہلے تو کسی اور کے ہاتھ کا کھاتے رہے ہو۔ روز ہم ہی کھانا پکاتے ہیں۔“ بچہ چمک کر بولی۔

”روز کا چارہ تو مارے باندھے حلق سے اتارنا ہی پڑتا ہے مگر آج تو عید ہے۔ کم از کم آج تو“ جیل والا کھانا نہیں کھائیں گے۔“ احمر نے متانت سے کہا۔

”تخ کباب عائشہ آپنی بنائیں گی۔“ احسن نے فوراً اپنی اکلوتی سیالی (ہونے والی) کو گھیر لیا۔

”اچھا پھر پٹکی کو تم سنبھالو گے۔“ عائشہ کب ادھر رکنے کی قائل تھی۔

”لایئے، مجھے دیجیئے! آؤ بیٹے! میں تمہیں محلے کے بچے کچھ زندہ بکروں کا دیدار کراتا ہوں۔“ وہ خفراک میں ملبوس گڑیاسی پٹکی کو اٹھا کے باہر لے گیا۔

”مطلب کے وقت تو یہ لوگ گدھے کو بھی باپ بنانے پر راضی ہو جاتے ہیں۔“ عیمر نے بھٹا کر ناچاری کیا تھا۔

”تم لوگوں نے روحا کے ساتھ دوستی نہیں کی؟“ عائشہ آپنی لڑکیوں سے پوچھ رہی تھیں۔

”وہ خود ایسا نہیں چاہتی۔“

”پھر بھی، اسے اپنے ساتھ گھلنے ملنے کا موقع تو دو۔ آہستہ آہستہ وہ خود ہی ایڈجسٹ ہونے لگے۔“

”دوستی مشترکہ طور پر استوار کی جاتی ہے۔ وہ آگے بڑھے گی، تب ہی ہم اس سے بے تکلف کہتے ہیں۔“

”کچھ لوگ قدرتی طور پر بندھتے ہیں، انہیں اور ان کے مزاج کو کھولنا پڑتا ہے، از خود نکھارنا پڑتا ہے۔ وہ خود نہیں کھلتے۔ کسی کے انتظار میں رہتے ہیں کہ وہ آکر ان کے دروازے پر دستک دے، خلوص کا بڑھائے، انہیں ان کی ذات کے بند کونوں سے نکالے، روشنی، رنگینی اور تازگی کا احساس دلائے۔“

عائشہ آپنی فطرتاً حساس اور نرم رو تھیں۔ انہیں روحا کے یوں الگ تھلک پھرنے کا بڑا قلق ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بیچ میں ٹام نکال کے وہ اس کو کہتی دینے کی خاطر اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

”ہاں بھئی ڈیر کزن! کیا ہو رہا ہے۔ تم اتنا پوز بنائے کیوں بیٹھی ہو۔“ انہوں نے وابستہ اسے بے غمی سے مخاطب کیا۔

”بچ۔۔۔ جی۔۔۔“ وہ اپنے خیالات سے چونکی تو انہیں مقابل پا کر قدرے زرد نظر آئی۔

”یہ کیا۔ نہ مہندی لگائی ہے، نہ جیولری استعمال کی ہے۔“ وہ اس کے ہاتھ الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

”مجھے مہندی اچھی نہیں لگتی۔“

”بھلے نہ لگے مگر تہوار پر تو ضرور لگانی چاہیے۔ کم از کم دوسروں کو بہت اچھی لگتی ہے۔“ وہ اپنائیت سے بولی۔

”بچ کر لو پھر میں خود تمہارے مہندی لگاؤں گی۔“

”نہیں پلیز، یوں بھی مجھے اور ممی کو چار بجے تک واپس گھر جانا ہے۔“

”چار بجے تو بچ ٹام شروع ہو گا یہاں۔“ وہ لا پرواہی سے بولیں۔

”اتنے خوب صورت ہاتھ ہیں، ان میں مہندی کی لالی خوب کھلے گی۔ مگر ارا! کپڑے تو ڈھنگ سے پہنتے ہوتے۔“ وہ اس سے دس بارہ سال بڑی تھیں مگر ایسے مخاطب ہو رہی تھیں جیسے چند ایک سال کا لڑکھو۔

”میں سمجھی نہیں۔“ وہ الجھن بھری نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ جن کے چہرے پر اس کے لیے تانہ خلوص اور اپنائیت نمایاں تھی۔

”اگر شلوار قمیص پہنی ہوتی تو بہت دلکش نظر آتیں۔“ انہوں نے اس کے بھرپور مناسب سراپے کا جائزہ لیا۔

”کیا ان کپڑوں میں اچھی دکھائی نہیں دے رہی؟“ وہ فکر مندی سے پوچھنے لگی۔
 ”بلاشبہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔ اچھی چیز تو جہاں بھی ہو جیسی بھی ہو، اچھی ہی لگتی ہے مگر یہ بات ہے کہ یہ کپڑے تمہارے جیسی اچھی لڑکی پر اچھے نہیں لگ رہے۔ تمہاری خوب صورتی کو گہنارہ ہے ہیں۔“
 انہوں نے بڑے سلیقے سے اسے سمجھایا تھا۔

”دیکھو چندا! ہمارا بلکہ ہر جگہ کا معاشرہ کافی حد تک ظاہری حلیے اور اسٹائل سے کسی کی شخصیت کے بارے میں رائے قائم کرتا ہے۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ رائے سو فیصد درست ثابت ہو مگر اس فتنے سے بچنے کے لیے بہتر ہوتا ہے کہ ہم جہاں اور جس ماحول میں رہتے ہوں، ویسے ہی نظر آئیں۔ پاکستان اسلامی ملک ہے اور مسلم خواتین ہونے کے ناتے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ خود کو ڈھک کے مہذب، سلیجے ہوئے اور معزز انداز میں پیش کریں تاکہ لوگ ہمارے حلیے و کچھ کر ہی ہماری شرافت، پاکیزگی اور تہذیب کا اندازہ لگالیں۔ یہاں اچھے شریف گھرانے کی لڑکیاں عموماً شلوار قمیص اور درپے میں ہوتی ہیں اور بے حد سراہی بھی جاتی ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ تم اندر سے بہت نیک، سادہ اور پیاری بچی ہو۔ بس کوشش کرو، اپنے اندر کی اچھائی ظاہری طرز عمل اور رکھ رکھاؤ سے بھی دوسروں سے منواسکو۔“
 اتنے سلیس اور جامع انداز میں کسی نے بھی آج تک اسے نہیں سمجھایا تھا۔ عائشہ آپ کی انداز آنا پیارا، مگر موہنا اور بھرپور تھا کہ سیدھا دل میں اتر گیا۔

”کہیں ایسا تو نہیں، میرے اسی ظاہری رنگ ڈھنگ کی وجہ سے یہ لوگ مجھ سے دور رہتے ہیں اور مجھ سے اجنبیت برتتے ہیں؟“ اس نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

”یقیناً یہی وجہ ہوگی۔ ہمارا لباس، ہمارا انداز نشست و برخاست اور ہماری بول چال اس کچر کی نمائندگی کرتی ہے، جس میں ہم پروان چڑھے ہوتے ہیں، انہیں تم کی کچی امریکن کچر کی نمائندہ نظر آتی ہوگی، اسی لیے تم سے بے گانگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔“

”حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ مٹی نے تو مجھے اتنا باندھ کے رکھا ہوا ہے۔“ وہ بے ساختہ بولی۔

”عائشہ ہنس دیں۔ وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر اٹھ گئیں۔

”بھئی لڑکیو! کھانا کب لگے گا۔ اب تو اسامہ جیسے صابر بچے کو بھی بھوک لگ گئی ہے۔ وہ کھانا

لگوانے کا کہہ رہا ہے۔“

اماں جی نے ”بچن والوں“ سے تازہ ترین صورت حال معلوم کرنے کے لیے از خود جوع فرمایا۔

”صرف ٹیبل لگانی رہ گئی ہے اماں جی!“ چچی جان نے مصروف انداز میں اطلاع دی۔

”اوپر سے کچھ اور کریاں منگوالو اور ایک چھوٹی ٹیبل بھی ساتھ رکھوادو، زیادہ لوگ ہیں اور میز تو

صرف بارہ کرسیوں والی ہے۔“

”بے فکر ہیں بھابی! اس کا بندوبست پہلے ہی کر چکی ہیں۔“

”عائشہ آپ! میں آپ کے ساتھ بیٹھوں گی۔“ روحانے بچوں کی طرح فرمائش کی۔ سب لوگ میز

آجکلے تھے۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں، میں تو خود تم سے یہی کہنے والی تھی۔“ انہوں نے اس کا مان بڑھایا۔

کھانے کے دوران وہ مسلسل اسے چیزیں پیش کرتی رہیں اور باتیں بھی کرتی رہیں۔ وہ ان کی

قرابت میں خود کو بہت محفوظ اور قدرے پر اعتماد سا محسوس کر رہی تھی بلکہ عائشہ آپ کی کہنی مار کر انوالو

کرنے پر اس نے دو چار بار مدد بھی، سارا، غیر اور البعد وغیرہ سے بات بھی کی تھی۔

البتہ اسے رائل بلو پینٹ اور آف وائٹ شرٹ میں ملبوس کم کم مسکراتے اور کبھی کبھی بات کرتے

سوہرے اسامہ کی خود پر جمی درشت آنکھوں سے بہت خوف آ رہا تھا۔

اب تو اسے حسن منزل آتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔

کب اسامہ بھائی جوش میں آ کر مٹی کو بتادیں اور پھر مٹی، ابو اور بھائی کو اور۔۔۔ اور۔۔۔

ظاہر ہے اسے تو زندہ درگور کر دیتے وہ لوگ۔ سگریٹ پینا، یہ جرم اتنا بڑا تھا کہ وہ اس کو جان سے

ہی مار ڈالتے۔

”یہ کیا نمونہ اٹھالاتی ہیں صبا پھپھو۔“ وہ کھانے کے بعد موقع پا کر دبے لفظوں میں تائی امی سے

مخاطب ہوا تھا۔

”ارے بیٹا! اتنی بھلی مانس تو ہے بے چاری۔ چپ سادھ کے بیٹھی رہتی ہے۔“ تائی جان نے

اپنی فطرت کے مطابق سادگی سے کہا۔

”آپ کو تو ساری دنیا ہی بھلی مانس نظر آتی ہے امی! اس ”بھلی مانس“ کا حلیہ اور غرور و برتری کا

انداز ملاحظہ کیا ہے آپ نے۔“

”جہ۔۔۔ ارے درمیان رہے گی تو آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔ میں تو احمد کی بات چلانے کی

کوشش کر رہی ہوں اور تم ہو کہ۔۔۔“ انہوں نے خفگی سے اپنے سب سے بڑے صاحبزادے کو دیکھا۔

”کیا احمد۔۔۔؟“ اسامہ کے دیوتا کو ج کر گئے۔

”خدا کا خوف کریں امی! کہاں پھنسا رہی ہیں ان سیدھے سادے لڑکے کو۔ آپ پر ان شہزادی

صاحب کے جوہر کھل جائیں تو کانوں کو ہاتھ لگانی پھرے گی۔“ اسامہ کچھ کچھ کہتے کہتے رک گیا کہ

رازداری نبھانے کا قول دے چکا تھا۔

”آپ سوچیے گا بھی مت۔ احمد کے لیے بہتری، شریف اور سلیجی ہوئی لڑکیاں مل جائیں گی۔“

اسامہ انداز قطعی تھا۔

”خیر، میں مرضی تو ضرور پوچھوں گی اس کی۔ اگر اس نے اعتراض کیا تو ٹھیک ہے۔ اگر راضی

ہو گیا تو صبا سے بات کروں گی۔“ تائی امی کا ارادہ پختہ تھا۔

”اب تم نے تو قسم دے رکھی ہے کہ جب تک تم نہ کہو، میں شادی کا ذکر نہ کروں۔ اسی قسم کی بندش

کی وجہ سے میں نے تم سے چھوٹے احسن کے لیے غیر کارشتہ پکا کیا تھا۔ اب احسن کے بعد احمد کی بھی

بات طے کر دوں گی۔ وہ بھی برس برس روزگار ہو گیا ہے۔ دونوں کی سال ڈیڑھ سال کے بعد اکٹھی شادیاں

کر دوں گی۔ پھر سب سے چھوٹا احمرہ جائے گا۔ اس کے لیے بہت ٹائم پڑا ہے۔“

”اور سارا اور مدیحہ۔۔۔؟“ اس نے بہنوں کے مستقبل کے بارے میں سوال کیا۔

”سارا کے لیے تمہاری نور پھپھو نے قیصر کا رشتہ دیا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔“ اسامہ نے خوشی کا اظہار کیا۔

رہی مدیحہ۔۔۔ تو اس نے صاف کہہ دیا ہے کہ فی الحال اسے ان چکروں سے دور رکھا جائے۔ وہ

ایف ایس سی کے بعد ایم بی بی ایس میں ایڈمیشن لینے کا ٹھان چکی ہے۔“

”یہ بھی بہت اچھی خبر ہے۔“

”تم اچھی خبر کب سناؤ گے؟“ تائی امی جل کر بولیں۔ اسامہ ہنس دیا۔

”کبھی تو سناؤں گا۔ فی الحال انتظار فرمائے اور ہاں، شام کو میرا عید ایٹشل ڈرامہ آئے گا، وہ

دیکھنا نہ بھولے گا۔“ وہ ماں سے شوخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

مئی کی شہ پر نیوٹر اس کے ساتھ سختی سے پیش آنے لگا تھا۔

سینڈ ایئر کے ایگزٹ شروع ہو گئے تھے۔ تین دن بعد اس کا پہلا پیپر تھا۔ نیوٹر اپنی طرف سے اسے

تیاری کروا چکا تھا۔ آخری دنوں میں اسے ٹاپک دیتا تھا کہ یاد کر کے سناؤ۔

”میں کیا کروں سر! مجھے یاد کرنا نہیں آتا۔ میں نے کبھی یاد نہیں کیا۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”امریکہ میں تو ایسے رٹائیں لگانا پڑتا تھا۔ وہ اورل ٹیسٹ لیتے تھے یا اچیومنٹ ٹیسٹ ہوتا تھا

اور۔۔۔“

”یہ امریکہ نہیں ہے مس روہا۔“ نیوٹر کا لہجہ سخت ہو گیا۔

”آپ مجھے سمجھاویں۔ میری تیاری کروا دیں۔“

”اور کیسے تیاری کراتے ہیں۔ میں نے آپ کے سارے ٹاپک کو کر دیا ہے۔ سمجھا دیا ہے

اچھی طرح۔ اگر آپ کو پھر بھی کوئی سوال سمجھ میں نہیں آ رہا تو میں وہ سوال سمجھا دیتا ہوں۔ رہی بات ساری

بک آپ کو یاد کروانے کی تو ایک بات یاد رکھیں۔ نیوٹر رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اسٹوڈنٹ ہاتھ نہ

ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔ نیوٹر خود ہی اسے جادوئی عمل کر کے ساری کتاب اس کے دماغ میں ڈال دے گا۔

یاد تو آپ ہی کو کرنا ہے اور پیپر بھی غالباً آپ کو ہی دینا ہے یا پھر نیوٹر وہاں جا کر لکھے گا۔“

وہ پانی پانی ہو گئی۔

وہ ڈائننگ روم (بلکہ ہال کہنا مناسب ہوگا) میں بیٹھی تھی، اسے پتا بھی نہیں چلا، بک کوئی بے آواز

کارپنڈنٹیرھیاں چڑھتا اور پر آگیا تھا اور نیوٹر کے ارشادات حرف بہ حرف سن چکا تھا۔

”صبا پھپھو کہاں ہیں؟“ اسامہ نے اپنے مخصوص ناگوار تاثرات سمیت اسے مخاطب کیا تو اس کا

جی چاہا، زندہ زمین میں دفن ہو جائے۔

”اف اللہ! وہ نیوٹر کی زبانی میری تعلیمی کارکردگی“ سن چکے ہوں گے۔

بے عزتی کے احساس سے اسے چکر آنے لگے۔

یہ دوسری بار ہوا تھا۔ اگر جو اسامہ بھائی یہ ”عزت افزائی“ مئی کو بتا دیں تو۔۔۔

”بے فکر رہیے۔“ وہ جیسے اس کی سوچ پڑھ کے نیچے جانے کے لیے قدم بڑھا چکا تھا۔

وہ سر جھکا کر ہاتھ مسلتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

جیسے تیسے اس نے فائنل پیپر دے دیے، آخر میں پریکٹیکل رہ گیا تھا، جس دن آخری پیپر تھا

انے نے سب دوستوں کو اگلے دن اپنے گھر پر مدعو کیا۔

”روح کو تو رہنے ہی دو۔ اسے اس کی مٹی نہیں آنے دیں گی۔“ ہالہ نے خاموشی سے ناخن چباتی

کو دیکھ کر طنز سے کہا تھا۔

”شٹ اپ ہالہ!“ روشا نے ایک نظر روحا کو دیکھ کر ہالہ کو گھورا۔

”ارے بھئی! روحا پانی مٹی سے کالج کا کہہ کر آجائے گی۔ ہم شام کے بجائے صبح کا پروگرام رکھ

ہیں۔ نوبے سے ایک بجے تک۔ کیا خیال ہے روحا!“

روحا کے چہرے پر شکش کے تاثرات نمایاں تھے۔

روشا نے کوہ سب سے زیادہ پسند کرتی تھی اور اس کے گھر میں اس کے ساتھ بے تکلفی سے وقت

ارتار روحا کی اولین خواہش رہی تھی۔ اس پر عمر کا جو دور گزر رہا تھا اس میں دوست تفریحات اور دلچسپی

رکڑ ہوا کرتے ہیں۔ وہ اپنے وجود کے لیے اتنے ضروری لگتے ہیں کہ ان کے بغیر وقت گزارنے کا

ہر بھی ہول آتا ہے۔

”مئی کو پتا ہے کہ سینڈ ایئر کے پیپر زخم ہو چکے ہیں۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے روشا نے کی طرف

”افوہ، پریکٹیکل تو رہتا ہے نا۔ اور انہیں پریکٹیکل کی ڈیٹ تو نہیں معلوم نا۔ بہانہ کر دو کہ کل

بگل ہے۔“ ہالہ نے بے پروائی سے مشورہ دیا۔

”تو پھر پریکٹیکل والے دن کیسے آؤں گی؟“

”اوکے، ہم یہ کہہ دو کہ پیپر نے پریکٹیکل کی تیاری کے لیے بلایا ہے۔ ایک دو پریکٹیکل رہ گئے تھے،

نے ہیں۔“ روشا نے کا مشورہ اس کے دل کو لگا۔

حسب معمول جی نے بحث و تحیص اور پوچھ گچھ کے بعد صبح نوبے سے کالج ڈراپ کر دیا تھا۔ باقی

زکے پیپر زہورے تھے، اس لیے کالج میں چہل پہل تھی۔

وہ آتو گئی تھی مگر مسلسل ذہنی دباؤ اور خوف کا شکار تھی۔

”اگر مئی کو پتا چل گیا تو۔۔۔؟“ کالج سے باہر آ کر ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے اس کی ٹانگیں کانپ رہی

۔ پھر روشا نے گھر جا کر وہ سب کچھ بھول گئی۔

انٹرنیٹ پہ چیننگ کرتے، پیپی اور پڑاڑاتے اور شور وغل کرتے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

بنا طرف سے انتہائی پُر جوش اور خوش دکھائی دینے کی کوشش میں لگی تھی۔ زبردستی دوستوں کی باتوں

نہ لیتی اور انہیں یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی کہ مجھے بھی اس معاملے سے اتنی ہی دلچسپی ہے۔

”اوہ گاڈ، ایک بجنے میں دس منٹ رہ گئے ہیں روحا! بھاگو کالج، تمہاری مٹی پک کرنے آتی ہی

نا۔“

”اوہ نو“ روحا کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔

ہوائیاں اڑتا ہوا ہنسی چہرہ لیے وہ جیسے تیسے ٹیکسی میں بیٹھ کے کالج آئی تھی۔

عین اس وقت جب وہ ٹیکسی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر رہی تھی، اس کی نظر سائڈ پراپنی گرینڈ میں ڈرائیونگ سیٹ کا شیشہ نیچے کے پوری طرح اپنی طرف متوجہ اسامہ پر پڑی۔

زمین و آسمان اس کی نظر میں گھوم کر رہ گئے۔

ایک لمحے کو وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔

جسم نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اسامہ کی آنکھیں۔ وہ آنکھیں کیا کہانیاں سن رہی تھیں، ان سے برسی چنگاریاں اس سے کیا

رہی تھیں۔

ان میں رچی تفریق اور ملامت کی لالی اسے کیا پیغام دے رہی تھی۔

وہ حرف بہ حرف سمجھ گئی۔

”ناٹا لکین“ وہ کراہی تھی۔

ٹیکسی سے تو بہر حال اترتا تھا اور پھر اسامہ کی گاڑی میں بھی بیٹھتا تھا جو غالباً می کی طرف کسی کام

سے گیا تھا اور می نے کسی کلائنٹ کے ساتھ بڑی ہونے کی وجہ سے اسامہ کو اسے پک کرنے کے لیے بلایا

دیا تھا۔ ”پلیز اسامہ بھائی! میں آپ کے پیر پڑتی ہوں، ہاتھ جوڑتی ہوں، خدا کے لیے آپ می یا ابوبکر

بتائیے گا۔ وہ مجھے زندہ گاڑ دیں گے، گولی مارویں گے، پلیز۔“

بے تحاشا روٹی ہوئی اس بے اوسان لڑکی نے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کے پاؤں چھوئے تھے۔

خوف سے لرز رہی تھی۔ خوف زدہ پھیلی پھیلی آنکھوں اور اڑی اڑی زرد رنگت والی اس لڑکی سے اسامہ

نے اس لمحے شدید نفرت محسوس کی تھی جو والدین کی عزت کی نیلای کر کے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ گرا

چھڑے اڑا کر آ رہی تھی۔ ☆☆☆

وہ کافی عرصہ بعد ”حسن منزل“ آئی تھی۔

”اسامہ بھائی نو ماہ کے کورس کے لیے لندن جا رہے ہیں۔“ غیر نے بتایا۔ اب گھر کی لڑکیاں اور

سے تھوڑی بہت بات چیت کر لیا کرتی تھیں خود اس نے بھی اپنے ظاہری انداز اور چہرے کے تاثرات

کافی حد تک تبدیل کیا تھا۔ می سے فرمائش کر کے بہت سے شلواری قمیض بنوائے تھے۔ وہ خود بھی اس آرا

وہ لباس میں بہت اچھا محسوس کرتی تھی۔ اب وہ اس بات کا انتظار نہیں کرتی تھی کہ دوسرا اسے مخاطب

کرے، بلکہ آگے بڑھ کر سلام دعا کرتی تھی اور ٹھیکہ پاکستانی اسٹائل میں حال چال پوچھتی تھی۔

خیریت دریافت کرتی تھی اور کوشش کرتی تھی کہ ایسا انداز گفتگو رکھے جس سے مقابل خوش ہو اور دلچسپی

سے بات کرے۔

راجہ بھی نور پھچھو کے ساتھ یہاں آئی ہوئی تھی اور اسامہ کے جانے کا سن کر پریشان سی ہو گئی تھی۔

اس دن اسامہ کی فلائٹ تھی۔ اتفاق سے ہفتے کا دن تھا، سب ہی جمع تھے۔ روحا عجب پریشانی

بتلاتی تھی۔ بالآخر ایک فیصلہ کر کے اسامہ کے کمرے میں آ گئی۔

اسامہ بھائی! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ پردہ رکھنے پر اس کا شکریہ ادا کرنے

رے میں قائم کی گئی غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسامہ اپنے سوٹ کیس پر جھکا ہوا

ٹمر میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔“ اچانک اسامہ نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔

سوائے اس کے کہ اگر کبھی میں نے شادی جیسی حماقت کی تو دعا کروں گا کہ میرے ہاں کبھی بیٹی

ہو نہ۔ اگر وہ آپ جیسی نکلی تو میں خود کو بھی گولی ماروں گا اور اسے بھی۔“

بے حد جیسے، متوازن اور پرسکون انداز میں کہے گئے ان الفاظ کا ڈنک اس قدر زہر پلاتا تھا کہ وہ

بگئی۔ ☆☆☆

نت رکھتا تو نہیں ہے۔

رکب رکا ہے کسی کی خاطر۔

مامہ نو ماہ کے لیے گیا تھا مگر پھر اسی انٹی ٹیوٹ نے از خود ایک سال کے مزید کورس کے لیے

دی تو وہ رک گیا۔

سب توقع روحا ایف اے سیکنڈ ایئر میں دو مضامین میں فیل ہو گئی تھی، پھر تین ماہ بعد سہل منٹری

بے اور حیرت انگیز طور پر پاس ہو گئی۔

گلے سال اس نے تھرڈ ایئر میں ایڈمیشن لے لیا اور بغیر ٹیوٹر کی مدد کے خود پڑھ کر پیپر دیے۔ وہ

اس نے باعزت طور پر پاس کر لیا تھا۔

ورجس دن وہ فورتحہ ایئر کا نیا بیچ یونیفارم پر لگا کر کالج کے لیے نکل رہی تھی، می نے بے اختیار اسے

پر پار کیا تھا۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ اتنی ذمہ دار، سو برادر پڑھنے لکھنے کی شوقین بچی میری ہے۔“

”کاش وہ بتا سکتی کہ کن احساسات نے اس کے اندر کی خود دار، ذمہ دار اور محنتی لڑکی کو جگا دیا تھا۔“

فورتحہ ایئر بھی اس کے لیے کامیابیاں سیٹنے کا سال تھا۔ اس نے ایک اصول بنالیا تھا کہ کبھی بہلنے،

اور خوش رہنے کے لیے کسی کا کندھا تلاش نہیں کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اب دوستی برابری کے

پر استوار کی تھی۔

ردشانی وغیرہ کا گروپ چھوڑ کر اس نے ایسی لڑکیوں کا انتخاب کیا تھا، جو ہر سبکیٹ میں اس کی

نیوٹیں اور جو صرف خلوص اور باہمی احترام پر یقین رکھتی تھیں۔

اب وہ ”حسن منزل“ جاتی تو دوسروں کو آپس میں خوش گئیاں کرتے دیکھ کر احساس محرومی یا کمتری

انہیں ہوتی تھی۔ اس کے برعکس وہ پورے اعتماد اور خوش مزاجی سے گفتگو میں شامل ہو جاتی تھی۔

یہ سیکھ لیا تھا کہ ضروری نہیں ہے موضوع گفتگو صرف اپنی ذات رہے۔ دوسروں کے ساتھ ہنسنے

کے لیے ان کی دلچسپی کے موضوعات چھیڑ دو، ان کے بارے میں مطلع اور با علم رہو۔ ان کے دکھ

رکھو۔ ایسا کرنے سے ہم خود بخود دوسروں کی توجہ، خلوص اور دلچسپی کا مرکز بن جائیں گے۔ جواب

میں ہمارے بارے میں اتنا ہی با علم اور حساس ہو جاتے ہیں اور بالآخر دوستی کا رشتہ استوار ہو جاتا

ہمروں کی خوشی میں خوش رہ کر ہی ہم انہیں اپنی خوشیوں میں شریک رکھ سکتے ہیں۔

نہیں تین شادیاں۔ ارے بیگم! خدا کا خوف کرو، کیوں میرا دیوالیہ نکالنے پر تلی ہوئی ہو۔“
جی بوکھلا اٹھے تھے۔

کیا فرق پڑتا ہے بیٹے۔ اچھا ہے، خیر خیریت سے اس فرض کو نپا دیں۔“
نہیں کیوں، چار لکھے۔ غیر تو اسی گھر سے رخصت ہو کے احسن کی دلہن بنے گی۔“
نشا آپ نے ہنس کر حاشیہ لگا یا۔

لی جان احمد، احسن اور سارا کی ایک ساتھ شادی کرنا چاہتی تھیں۔
اور پھر دور کیوں جائے، سارا کی قیصر سے اور احمد کی رابعہ سے ہوگی۔ یعنی نور کے گھر بھی دو
ایک ساتھ ہوں گی۔ ہماری چار اور ان کی دو ملا کر خاندان میں کل چھ شادیاں اکٹھی ہو جائیں
نا جان نے مسکراتے ہوئے اپنے جیٹھ کا چہرہ دیکھا تھا۔

ارے گئے۔“ اباجی نے سر تھام لیا۔
”بھکرے قربانی کے لیے تیار ہیں۔“ احمد وہاں موجود تھا تو چپ کیونکر رہتا۔ ”ہم بقر عید پر بھی تو
بقران کرتے ہیں، اس بار بکرے نہ سہی، بچے سہی۔ ارے اباجی! کیوں ان آزاد و چھٹیوں کو
بے برزخ میں پھینکنا چاہتے ہیں۔ کیوں انہیں بے فکری کی جنت سے نکال کر پریشانیوں کی دوزخ
ناچاہتے ہیں۔“

ارے چپ، نا بخار، بے وقوف، بد تمیز۔“ تائی جان نے اپنے سب سے چھوٹے سپوت کی
خبر لے ڈالی۔

”میں اکیلا اتنی ذمہ داریاں نہیں نپٹا سکتا بیگم! ایسا کرو، اسامہ کو فون کر کے بلواؤ۔ اس سے پوچھو تو
بندہ خدا اور کتنے کوزرے کرتے ہیں۔ آ جاؤ اب۔“

”آپ راضی تو ہوں۔ اسامہ کو میں کل ہی اطلاع کر دیتی ہوں۔ وہ یوں بھی اس بقر عید سے پہلے
پر وگرام طے کر چکا ہے۔“

ٹھیک ہے پھر۔“ اباجی ٹھنڈی سانس لے کر بولے تھے۔

☆☆☆

اباجی! یہ کیا آپ نے شادیوں کا اتوار بازار لگا رکھا ہے۔ میں تو پریشان ہی ہو گیا، اتنی ساری
کان کر۔“

ستما بازار ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور تم بھی اپنی دلہن جن لو۔ اباجی بھی ستے میں چھوٹ
لے۔ ہم تمہیں بھی ان کے ساتھ ہی بھگتا دیں گے۔“ عائشہ آپ نے چھیڑا۔

”آپ لندن میں رہ کر اور ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ بھائی!“ احسن نے رشک سے اسے دیکھا۔
”تحریف کا شکریہ۔“ وہ خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”ہم آپ کے ڈرامے دیکھتے ہیں۔ وہ جو آپ پر ایویٹ جینٹلو کے لیے لندن میں رہ کر کرتے
ہیں۔ مدیحہ نے شوق سے بتایا۔ وہ ایم بی بی ایس کے سیکنڈ ایئر میں آچکی تھی۔

”شکریہ۔“ وہ پھر مسکرایا تھا۔

اس دن وہ ”حسن منزل“ آئی تو رابعہ اور عائشہ آپ کو کسی گھر سے مسئلے میں الجھا ہوا پایا۔
وہیں موجود تھی۔ اس کے چہرے پر بھی فکر اور پریشانی کے سائے تھے۔
رابعہ بڑے مشکل انداز میں بیٹھی تھی۔

”بڑی ممانی کی آمد کا تو میں پچھلے دو سال سے ایک ایک لمحہ انتظار کرتی رہی ہوں مگر اس
کے لیے، احمد کے لیے نہیں۔“ رابعہ رو ہانسی ہو گئی۔

”خیریت؟“ سلام و دعا کے بعد روحا نے بڑی اپنائیت کے ساتھ سوال کیا۔
”جس کو اس نے راجھا مانا، وہ اسے اپنی ہیر نہیں مانتا۔“ غیر کا جواب نہایت مختصر تھا۔
روحا کے سر سے گزر گیا۔

”اسامہ بھائی کا دور دور تک شادی کا کوئی پلان نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے تائی جان یوں
سادھ کے بیٹھ گئی ہیں۔ ارے اسامہ نے قسم دی ہے انہیں کہ وہ کبھی بھی اس سے شادی کے لیے
نہیں کریں گی۔ اس پتھر کی دیوار سے ٹکرا کر بالا آخر تائی جان نے بار مانی تھی اور احسن کا رشتہ
تھا۔ احمد بہت اچھا لڑکا ہے۔ بینک میں اچھی پوسٹ ہے۔ مزاجاً بھی کھلے دل و دماغ کا اور ہنس
عائشہ آپ نے ترجیحی نظروں سے روحا کو دیکھتے ہوئے بڑے سجاؤ سے رابعہ کو سمجھایا۔
روحا اپنی دھن میں کسی ذہنی جوڑ توڑ میں لگی ہوئی تھی۔

”میں نے احمد کو کبھی ان نظروں سے نہیں دیکھا میں تو شروع سے اسامہ بھائی۔۔۔“ را
روتے ہوئے ہونٹ و انتوں تلے دبا لیا۔

روحا نے محسوس کیا جیسے اسے رابعہ کے منہ سے اسامہ کے لیے اظہار پسندیدگی اچھا نہیں لگا
عجیب طریقے سے ڈوبا تھا۔

ایسا کیوں ہوا؟ وہ سمجھ نہیں سکی۔ ہاں یہ وہ ضرور جانتی تھی کہ رابعہ اور احمد کے رشتے کی بات
اس کے اعصاب پر سکون ہو گئے تھے۔

”کچھ دنوں کی بات ہے، جب اس کے ساتھ وابستہ ہوگی تو اسی کے رنگ میں رنگ جاؤ
اسامہ سے امید لگانا فضول ہے۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں۔“ عائشہ آپ نے صاف لفظوں میں،
آئینہ دکھایا تھا اور پھر رابعہ اور احمد کی منگنی کے موقع پر سب نے دیکھا کہ روحا بے حد پر جوش، سرگرم
خوش نظر آتی تھی۔

سرخ اور فان کلر کے امتزاج سے بنے جھلملاتے ہوئے غرارہ سوٹ میں وہ مغلیہ شہزادی
دے رہی تھی۔

”دیکھو، ان دو تین سالوں میں کیسے رچ بس گئی ہے ہم میں۔ یہی ہوتا ہے، پیدائش کہیں کی
خون تو خالصتاً اپنا ہی تھا نا۔“ اماں جی نے بڑی محبت سے اسے دیکھا۔

”اے صبا! بھئی، بیٹی کی شادی کب کر رہی ہو؟“ نور خالہ نے تذکرہ چھیڑا۔
”بی اے کا امتحان تو دے لے پھر سوچوں گی۔“ صبا کے انداز میں لاپرواہی تھی۔

”دو ماہ ہی تو رہ گئے ہیں پھر تو فارغ ہی ہوگی۔“

☆☆☆

164

”کیا بات ہے، آپ بڑے خوش مزاج ہو گئے ہیں لندن میں رہ کر۔“ احمد بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔
 ”کسی انگریز میم سے دل تو نہیں لگا لیا۔“
 ”اوں، ہمارے بھائی نے امریکن کو گھاس نہیں ڈالی تو انگریز کیا بچتے ہیں۔“ غیر اپنی جھوکی کہہ گئی تھی۔

”اب وہ امریکن نہیں، پاکستانی گرل بن گئی ہے۔“ سارا نے تصحیح کی۔
 اسامہ جانتا تھا، کس کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ بغیر کچھ کہے، اپنے سوٹ کیس سے کپڑے نکال کر میں لگانے لگا۔

”ہاں بھئی، اب سوچ لو اس کے بارے میں۔“ جانے عاشرہ آپ کی کس جھونک میں کہہ گئیں؟ خود بھی کہنے کے بعد احساس ہوا تھا کہ وہ کیا کہہ گئی ہیں۔
 جواب میں اسامہ نے اس قدر ناراض نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا کہ وہ خفیف سی ہو کر تھیں۔

☆☆☆

”روحاً بیٹے کیا بات ہے، مسلسل دو ہفتوں سے تم ”حسن منزل“ جانے سے انکار کر رہی ہو۔ جی کتنا پوچھ رہی تھیں۔ فارغ بھی ہو تو پھر چلتی کیوں نہیں۔“
 صبا اب اس پر پہلے کی طرح اپنے فیصلے نہیں ٹھوستی تھیں۔ اس نے اپنے روپے اور اعمال ذریعے ان پر واضح کر دیا تھا کہ اب وہ از خود محتاط ہو چکی ہے۔ پہلے کی طرح اسے مارتی بھی نہیں بلکہ اب تو وہ خاصہ دوستانہ انداز میں پیش آتی تھیں۔
 ”کیوں نہیں جاتی۔“ روحانے اپنے دل سے پوچھا۔
 وہ کیسے جاسکتی تھی۔

ان آنکھوں میں نفرت کے لپکے کیسے برداشت کر سکتی تھی، جن کو اس نے گزشتہ دو سالوں سے سوچا تھا۔

وہ خود بھی سمجھ نہیں پارہی تھی، وہ کیسے اور کس طرح اسامہ کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی۔ بھلا شخص کے سامنے ہر بار نہایت تذلیل آمیز انداز میں شرمندہ ہوتی آئی تھی، اسے دل کیسے دے سکتا جب تک وہ یہاں تھا، اس نے ایک لمحہ بھی اس کے لیے نہیں سوچا تھا مگر جب وہ چلا گیا تو رہ جاب منازل طے کرتے ہوئے بار بہا دیا۔

شاید یہ اس کی نفرت ہی تھی جس نے مجھے خود سے ملایا، اپنی شخصیت کو سنوارنے اور اپنا حیات پہچاننے کا موقع دیا۔

”بعض اوقات کسی کی نفرت بھی کسی کو نکھار دیا کرتی ہے، اس کی زندگی بنا دیتی ہے۔“ اس سوچا۔ وہ درپردہ اس کی شکر گزار تھی کہ اس نے اس بری طرح اسے دھتکارا کہ۔

اتنے ہوئے ذلیل کہ خوددار ہو گئے
 جہاںے منقولے پہ عمل پیرا ہوتے ہوئے وہ خود ہی اس قابل ہو گئی کہ اپنے آپ کو جوڑ سکے۔

”اس دفعہ کی بقرعید ہم اپنے گھر پر کیوں نہ منائیں می! اب تو اب بھی مستقل پاکستان سیٹل ہو چکے“ اس نے تجویز دی تھی۔

”ایسا کریں گے۔ پہلا دن اماں کے ہاں گزاریں گے اور اگلے دن اپنے گھر پر قربانی کر لیں“ می نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی۔

”روحاً! تیار ہو جاؤ، ہم حسن منزل جا رہے ہیں۔ اماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ رات کے کھانے کے لیے ٹیبل پر آئی، ہی تھی کڑی گھبرائے ہوئے انداز میں اپنے میڈروم سے نہیں۔

”چلیے می!“ وہ ابو کے ساتھ ہی ٹیبل سے اٹھ گئی۔ وہ لوگ وہاں روانہ ہوئے تو پہلے سے میلہ لگا ہوا ”ارے بھئی، کچھ نہیں ہوا مجھے۔“ خواخوہ احمد نے سب جگہ اطلاع پہنچادی۔ بلڈ پریشر کی تو پرانی نہ ہوں۔ وہی بڑھ گیا تھا، تھوڑا سا۔“ اماں جی نقابہت کے باوجود ابو کی وجہ سے اٹھ کے بیٹھ گئی تھیں۔
 ”تھوڑا سا؟ اسے تھوڑا سا کہتے ہیں۔“ مدیحہ نے بی بی اپریش اٹھاتے ہوئے خفگی سے انہیں ا ”تمہاری ڈاکٹری اچھے وقت میں کام آئی۔“ چچی جان نے پیار سے اپنی جیبی کو دیکھا تھا۔

”ڈاکٹر آگیا ہے۔“ اسی لمحے نیوی بوشلوار قمیص میں چہرے پہ فکری مندی کے تاثرات لیے ڈاکٹر کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔

”ارے بیٹے! یہ کیا کھپ ڈال دی تم نے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“
 اماں جی کے احتجاج کے باوجود ان کا باقاعدہ چیک اپ کیا گیا تھا۔ اسامہ ڈاکٹر کو چھوڑنے باہر آیا تھا۔ اپنی کزنز کے ساتھ کچن کے ساتھ منسلک ڈائننگ روم میں آگئی۔

وہ ان کے ساتھ ان ہی کے سے انداز میں باتیں کرتی ہوئی اُسی ماحول کا ہی ایک حصہ محسوس ہوتی

اماں جی کے اصرار پر صبارات کے لیے اماں جی کے پاس ہی رک گئی تھیں۔
 ”صبا! ایک بات کہوں؟“ اماں جی کے دل میں کتنے دنوں سے کھدبہ ہو رہی تھی۔ بالآخر وہ دل کی زبان پر لے آئیں۔

”جی اماں جی! کیسے نا۔“
 ”اگر بڑی بہو اسامہ کے لیے تم سے بات کریں تو برا تو نہیں مانو گی؟“

صبا سوچ میں پڑ گئیں۔ ان کے چہرے کا تذذیب دیکھ کر اماں جی کا لہجہ ملتی ہو گیا۔
 ”بیٹے! اپنے اپنوں کے ساتھ منسلک ہو کے مزید مضبوط ہو جاتے ہیں۔ روحا ماشاء اللہ اچھی، سمجھ

جئے ہے اور اسامہ تو ہے ہی بہرا۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کتنا قابل، کتنا مشہور اور کس درجہ تمیز، لحاظ والا ہے۔ اس نے ماں کو تو قسم دے کے شادی کی بات کرنے سے روکا ہوا ہے مگر اپنی دادی کی بات نہیں

الٹا۔ میں سمجھاؤں گی اس کو۔ بڑی بہو ویسے بھی روحا کو بہت پسند کرتی ہیں۔“
 ”اماں جی! جب بات ہوگی، جب دیکھا جائے گا۔“

صبا نے اگر ہاں نہیں کی تھی تو نا بھی نہیں کی تھی۔

”کم از کم یہاں سے آپ تب تک نہیں جاسکتے، جب تک کہ آپ کے دماغ اور آپ کی آنکھوں پہ بھی ایک ایک پٹی نہ اتر جائے۔ آپ نے مجھے مغربی رنگ ڈھنگ میں دیکھا مگر طریقے سے مشرقی اس سینے پر راغب کرنے کے بجائے مجھے بکڑی ہوئی سرکش اور لادین لڑکی تصور کر لیا۔

آپ نے مجھے اپنے کمرے میں محض شوق اور جس کے پکنا نہ جذبے سے مجبور ہو کر سگریٹ سے ٹھٹھکے دیکھا مگر ڈانٹنے ڈیٹنے اور سچائی جاننے کے بجائے نہایت زہریلے انداز میں طنز کر کے سائیڈ پہ ولے۔ کیا میں آپ کی کچھ نہیں لگتی تھی؟

آپ نے میری نالائقی کے بارے میں میرے ٹیوٹر کے خیالات سے مگر ایک رشتہ دار ہونے کے اتنے طریقے سے سمجھانے اور پوچھ گچھ کرنے کے بجائے مجھ پہ طنزیہ نظر ڈال کر آگے بڑھ گئے۔ جب آپ غیر، راجہ اور دوسری کزنز کی بڑھائی کے لیے انہیں لاتا سکتے ہیں تو مجھے ان سے الگ کیوں سمجھا؟ یہ نیازی سلوک آپ نے مجھ سے لائق کی بنا پر کیا تھا؟

پھر آپ نے مجھے کالج سے نکلنے کے بجائے ایک ٹیکسی سے برآمد ہوتے دیکھا۔ آپ نے اسی وقت مجھے ایک جہان پر لگا کر اصل حقیقت کیوں نہ اگلوائی۔ میں آپ کو بتاتی کہ میں تو محض اپنی احمقانہ سی دوستیاں نبھانے کے چکر میں خوار ہوئی تھی مگر آپ نے مجھ سے اصل بات اگلوانے کی رتی برابر کوشش نہیں کی۔ خود سے بدکرداری اور بدچلتی کا ٹھہرے لگا کے تسلی سے بیٹھ رہے اگر آپ نے مجھے کسی رشتے سے اپنا سمجھا ہوتا تو آپ بھی ایسا نہ کرتے۔ آپ نے شروع سے ہی مجھے اس خاندان کا حصہ نہیں سمجھا۔ سب لوگوں نے مجھے علاقہ غیر سے آئی ہوئی کوئی عجیب و غریب مخلوق سمجھ کے پرہیز کرنا شروع کر دیا تھا۔

اگر میرے ماں باپ امریکہ سیتل ہو گئے تھے تو یہ میرا قصور ہے؟
میں وہاں پیدا ہوئی، اسی ماحول میں پلی بڑھی، کیا یہ میرا قصور ہے؟
مجھے میری ماں نے ادھنا پنہنا نہیں سکھایا، کیا یہ میرا قصور تھا؟
میں نے اللہ سے فرمائش نہیں کی تھی کہ مجھے امریکہ میں پیدا کر دے۔ مجھے تو میرے ماں باپ نے جو ماحول دیا، میں اسی میں رچ بس گئی۔ اس میں میرا کیا قصور نکلتا ہے؟ خود سے اپنی شخصیت بنانے کا موقع تو کب ملا تھا مجھے۔“ اسامہ بہت بنا اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

اچانک ردحانے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ آہستگی سے دونوں گال پونچھے اور پیچھے ہٹ گئی۔
”آپ کس بھول میں ہیں۔ میں آپ سے کبھی شادی نہیں کر دوں گی۔ آپ۔۔۔ آپ اس قابل ہی نہیں ہیں۔“

معا اس نے ددر سے آتی ہوئی ٹیکسی کو ہاتھ ہلایا اور اس سے پہلے کہ اسامہ کچھ سمجھتا یا اسے جا کر پکڑتا، وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوا ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”ممی! آپ میری کہیں بھی شادی کر دیجیے، میں راضی ہوں۔“ وہ رات کو ماں کے کمرے میں آئی تھی۔
جہاں انتہائی تعجب سے اس کی سستی ہوئی صورت دیکھی۔
”یہ اس وقت شادی کا بھوت کیسے چڑھ گیا تم کو۔“ وہ اس سے اس درجہ بے باکی کی توقع نہیں کر

کچھ دن بعد اماں جی نے تائی اماں سے مشورہ کر کے عائشہ کو بلوالیا مگر جب اسامہ سے بات کی تو اس نے تو زمین آسمان ایک کر دیے۔ اس قدر طیش اور اشتعال میں تو وہ کبھی بھی نہیں آیا تھا۔
”کیا میرے لیے دبی آوارہ مزاج اور بدکردار لڑکی رہ گئی ہے جس پر میں ایک نظر ڈالنا بھی حرام سمجھتا ہوں۔ اسے عمر بھر کے لیے اپنی آنکھوں کے سامنے جالوں۔ امپائل۔ میں ایسا کرنے سے پہلے خود کو گولی مار لوں گا۔“

عائشہ آپی جو اماں جی کی ایماء پر اس کا عندیہ لینے اس کے کمرے میں آئی تھیں، لرز رہ گئیں۔
اسامہ غصے سے کھولتے ہوئے دھماکے سے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر آ گیا تھا۔ اپنی جھونک میں یہ بھی نہیں دیکھا کہ ردحادر دازے کے باہر کھڑی تھی اور پتھرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

بہت عرصے کے بعد ایک بار پھر اس نے ممی سے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن آج وہ پہلے کی طرح گھبرائی ہوئی نہیں تھی بلکہ بہت پرسکون نظر آرہی تھی۔

”ممی! میں افشال کے ہاں جانا چاہتی ہوں، جلدی آجاؤں گی۔“
اس کے انداز میں اتنی سچائی جھلک رہی تھی کہ ممی نے بنا کسی رد و کد کے اجازت دے دی تھی۔
وہ سیدھا بیچ ایٹ کالج پہنچ گئی۔

اسسٹنٹ پروفیسر اسامہ حسن کو ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ ایک بیچ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی اپنی کلاسز سے فارغ ہو کر اسٹاف روم میں آیا تھا، جہاں جاوید کیانی پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔
”ایکسکوز می سر! کیا آپ مجھے دس منٹ دے سکیں گے۔ مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“
اسامہ نے پلٹ کر اسے دیکھا اور پھر ایک لمبے کو حق دق رہ گیا۔ ظاہر ہے، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ یہاں آسکتی ہے۔ اسامہ نے ایک نظر جاوید کیانی کی طرف دیکھا پھر طوعاً کرہاً اٹھ کھڑا ہوا۔
”آئیے، باہر آجائیے۔“ وہ خشک انداز میں کہہ کر آگے بڑھا۔ ردحاس کے پیچھے تھی۔

اسامہ سیدھا پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کے پاس آیا تھا۔ ردحاجپ چاپ فرنٹ سیٹ کالا ک کھلنے پر ساتھ بیٹھ گئی۔

”گاڑی کسی ایسی جگہ زد کیے گا جہاں آس پاس لوگ نہ ہوں۔“ ردحاکا لہجہ بہت حتمی اور قطعی تھا۔
اس کے تیور سمجھ میں نہ آنے والے تھے۔

اسامہ نے علامہ اقبال یونیورسٹی کی طرف جانے والے ایک قدرے سنسان راستے پر گاڑی روک دی، صرف پانچ منٹ بعد۔

آس پاس درختوں کا گھنا جھنڈ تھا۔
”ذرا باہر آئیں گے، پلیز۔“ وہ جھٹکتے ہوئے لہجے میں کہہ کر نیچے اتر آئی۔

مجبوراً اسامہ باہر آ گیا۔
”یہ کیا ڈرامہ ہے؟“ وہ سختی سے مخاطب ہوا۔
”ہاں، یہ ڈرامہ ہی ہے۔ غور سے دیکھیے۔“ اس کے لفظوں اور چہرے سے آگ نکل رہی تھی۔
پھر اچانک اس نے اسامہ کا گریبان پکڑ لیا۔

رہی تھیں۔

”بس یونہی۔ آپ فکر مند تو ہوں گی کہ خاندان کے کتنے ہی لڑکے لڑکیاں بٹ چلے ہیں۔ بس آپ بھی اس نیک کام میں دیر نہ کیجیے گا۔ لڑکا جو بھی ہو، جیسا بھی ہو، منظور ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ ہمارے خاندان کا نہ ہو۔“ اس کا لہجہ نے حدیثا تھا۔
صبا کچھ دیر تک ساکت بیٹھی اس کی صورت دیکھتی رہیں۔
”تو ابھی ہوئی لگ رہی ہو۔ انشاں کے گھر ٹائم تو اچھا گزرا تا۔“ وہ کچھ کھوجنے کے چکر میں تھیں۔
”نہی!“ وہ جس طرح اچانک آئی تھی، اسی طرح پلٹ گئی تھی۔

☆☆☆

”آؤ ابھی بکرو، پہلے تمہاری باری ہے کیونکہ بزرگوں نے یہی طے کیا ہے کہ پہلے چار بیروں والے بکرے ذبح ہوں گے، ان کے بعد ٹھیک پندرہ دن بعد دو بیروں والے بکروں اور بکریوں کو قربان کرنے کی دل خوش کن تقریب چاکی جائے گی۔“
احمد بکروں کی خاطر سیوا کرتے ہوئے انہماک سے جھگھٹا تھا۔
”ابھی بھی سوچ لو برادران! بیچ سکتے ہو تو بیچ جاؤ اس دروناک عذاب سے جس کا پہلا مظاہرہ پندرہ دن بعد سہروں اور باجے گائے کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔“
وہ احسن اور احمد کو خبردار کر رہا تھا۔
”ارے اٹھاؤ اس “کیدو“ کو یہاں سے۔ یہ ادھر کہاں آگیا۔“ احمد نے اسے مصنوعی غصے سے گھورا۔

”بھئی، جب اوکھلی میں سردیا تو موصولوں سے کیا ڈرنا۔“ احسن ترنگ میں بولا۔
”تمہاری والی ریڈیو پاکستان تو اس قدر بولتی ہے کہ شادی کے بعد تم ہمیشہ کے لیے سماعت سے محروم ہو جاؤ گے۔“ احمد نے پیش گوئی کی تھی۔
”وہ تو جلتی بھی ہے، حد سے زیادہ۔“ احسن ہنسا۔ ”اس کا کیا کریں۔“
خود ہی جل جل کر کوئلہ ہو جائے گی، ٹھنڈا کوئلہ۔“ احمد نے بکروں کے لیے چنے کی دال کا برتن لاتی غیر کوکن اکھیوں سے دیکھ کر کہا۔
”شٹ اپ۔“ غیر نے برتن رکھ کر اسے گھر کا۔

”یہ اسامہ بھائی کیا کر رہے ہیں کمرے میں بند ہو کے۔ آج کل عجیب گم صم ہیں۔“ علی کو تجسس تھا۔
اسامہ آج کل خود سے سوال و جواب میں مصروف تھا۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ اس لڑکی کو کتنا غلط سمجھتا رہا تھا۔

اس کے ظاہری پہن اوے کو اس کا باطن سمجھ کر اسے بے باک اور ایکسپوزنگ کر کے خوش ہونے والی لڑکی خیال کرتا رہا تھا۔
اس کی الجھن، اس کی معصویت سے لبریز کم گوئی کو اس کا احساس برتری اور غرور دولت و حسن تصور کر کے اس سے متفر رہا تھا۔

اس کی لاعلمی کو اس کی اداسی سمجھ کر اس کی حوصلہ شکنی کرتا رہا تھا۔

اس کا مسئلہ صرف اتنا سا تھا کہ اس کی یاں اس کی تربیت کے لیے تو اس درجہ ہلکان ہو رہی تھی کہ امریکہ میں بھی پاکستانی اسٹائل کی پرورش کی تھی مگر پاکستان آکر اپنی صلاحیتوں کو مناسب طریقے سے استعمال کرنا اور یہاں کی سوسائٹی میں خود کو ڈھالنا نہیں سکھایا تھا۔ اس کے برعکس پاکستان آتے ہی گویا اچانک اس کا ہاتھ چھوڑ دیا گیا تھا اور گائیڈ کرنے کے بجائے ”چیکر“ اور ”کنٹرولر“ کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔
ہر لمحہ اس پر نظر رکھتیں۔ اسے جائز آزادی بھی نہیں دی گئی دوستی کرنے کی اور نبھانے کی۔
ایسے میں پھر وہ کیا کرتی، ایسی ہی بے وقوفیاں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

آج بقرعید کا دن تھا۔
”افوہ، روحا! آج بھی جاؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔“ صبا جھلا گئی تھی۔
”ممی! میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے، نپیر پچر بھی ہے۔ میں ریسٹ کروں گی، آپ چلی جائیے۔“ وہ میڑھیوں کے پاس کھڑی نقابیت سے کہہ رہی تھی۔ صبا نے اوپر آکر اس کی کلائی پکڑی۔
”ارے تمہیں تو تیز بخار ہو رہا ہے۔ یہ کیسے ہو گیا۔ کل تک تو بالکل ٹھیک تھیں۔“
اب وہ کیا بتاتی کہ اس سردی میں وہ برف کے کیوبز چبا چبا کے اور تخ پیپسی پی پی کر اپنا حشر نشر کرتی رہی ہے۔

اتنی ”مختنوں“ سے تو یہ بخار چڑھا تھا۔
”حسن منزل“ عید ملنے تو لازمی جانا ہے۔ اب تو تیار بھی ہو چکی۔“ صبا نے اپنی تیاری پر ایک نظر ڈال کر تشویش سے اسے دیکھا۔

”ارے ممی! میں بہت سکون سے رہوں گی یہاں۔ آپ پلیز چلی جائیے۔ جلدی آجائیے گا۔“
اس نے انہیں منا کر کسی طرح بھیج ہی دیا۔

”مجھے اب تمہارے سائے سے بھی بچنا ہے اسامہ حسن! میں تمہارا سامنا اس دن کروں گی جب کسی اور کے نام کی انگٹھی پہنوں گی۔ یہ وعدہ ہے میرا، روحا کا۔“
وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

رات والے بلکے پہلے قدرے ٹھنک زدہ لباس میں بکھرے بالوں کو بے دھیانی سے ریز میڈ میں جکڑتی وہ ارادوں کے پل باندھ رہی تھی۔
کیا سمجھا ہے، اپنی ارزاں ہوں کیا میں۔

ایک بار تمہارے نفرت بھرے انداز نے میری زندگی نکھار دی تھی اور میں تمہاری محبت میں مبتلا ہو گئی تھی۔

مگر اب کی بار تمہاری نفرت نے مجھے تم سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔“ آوارہ، بدکردار، اف مائی گاڈ!“ ابھی تک وہ الفاظ ساعتوں میں گونج رہے تھے۔ اس کے کانوں کی لوئیں جلنے لگی تھیں۔
وہ سر جھٹک کر باہر لاؤنج میں آگئی اور ٹی وی کھول لیا۔ اچانک کھٹکے پر اس نے گردن موڑ کر دیکھا تھا۔

سیڑھیاں ملے کر کے آخری سیڑھی پر کھڑا سامہ ہاتھ میں ٹکے لیے بڑی اپنائیت سے مسکرا رہا تھا۔
”عید مبارک۔“

وہ لب بچنے خاموش کھڑی روحا کے عین سامنے آ گیا۔
”میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ تم بھلے مجھ سے شادی نہ کرو مگر میں تو تم سے اور صرف تم سے ہی شادی کروں گا کیونکہ تم ہی مجھے بھری دنیا میں اس قابل نظر آتی ہو۔“
وہ بے تکلفی سے اس کا دایاں کان کھینچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔
”تمہاری اس دن کی طویل اور ”پر مغز“ تقریر نے مجھے یہ احساس دلایا کہ تم واقعی بدل گئی ہو، نکھر گئی ہو مگر آئندہ ایسے سڑک پہ بھاں بھاں روٹا نہ شروع کر دیا کرنا۔ اس کام کے لیے میرا شانہ بھی حاضر ہو گا۔“

وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتی رہی۔

”اچھا کیا جو آج تم نہیں آئیں۔“ وہ بے شاشت سے بولا۔

”میں نے اپاجی سے کہہ دیا ہے کہ جہاں چھ شادیوں کی تیاری کر رہے ہیں، وہاں ایک اور بھی ”ایڈ“ کر لیں۔ میں ٹھیک پندرہ دن بعد تمہیں اپنے گھر میں دہن بن کر آتے دیکھنا چاہتا ہوں، اس لیے آج تمہارا وہاں جانا بالکل بھی مناسب نہیں تھا۔“

”صرف پندرہ دن؟ اتنی جلدی شادی کی تیاری کیسے ہوگی؟“

وہ بے اختیار چلا اٹھی پھر اچانک ہی اس کی زبان کو بریک بھی لگ گیا تھا۔ یہ خیال آ گیا تھا کہ وہ تو اس سے کبھی شادی نہ کرنے کا عزم کر چکی تھی۔

اسامہ کا بلند دالا ہتھمہ اسے بری طرح شرمندہ کر گیا تھا۔

”تمہیں تیاری کی کیا ضرورت ہے؟“ اس کی گرم جوش نظروں نے روحا کو رخ موڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”تم تو قدرتی طور پر نکھری سنوری ہوئی ہو۔“

یہ شخص بھی ہتھمہ لگا سکتا ہے!!

سراہ سکتا ہے!!

چاہ سکتا ہے!!

ہونے کو دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔

ایک یہ بھی سہی۔

خود اسامہ کو بھی پتا نہیں چلا تھا کہ کب اس بے وقوف سی بوکھلائی گھبرائی لڑکی نے اس کے دل پر نقب لگائی اور اس کی خود ساختہ ”قسم“ کو چکنا چور کر دیا۔

شاید محبت کا ادراک اچانک ہی ہوتا ہے اور ادراک ہوتے ہی وہ شخص رنگ جاں سے بھی قریب لگنے لگتا ہے۔

☆☆☆

زندگی سوز و محبت کے سوا

تانیہ تو جب سے ”خاورولا“ آئی تھی مسلسل تجربے اور تجربے کی زد میں تھی۔ بقول سلیم کوثر کے یہاں منظر سے پس منظر تک حیرانی ہی حیرانی دیکھنے کو مل رہی تھی اسے، نہ یہاں کا ماحول سمجھ میں آتا تھا اور نہ یہاں کے مکینوں کے مزاج پلے پڑتا تھا۔ عجیب پر اسرار سی فضا تھی اور عجب کترائے، اکھڑے اجنبی رکی روٹوں والے لکیں۔

”یا خدا! کہاں پھنس گئی ہوں میں۔“ ایف ایس سی پری میڈیکل کر کے آگے میڈیکل میں اپلائی کر دیا اور خوش قسمتی سے اس کا لاہور میں فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو گیا۔ مسئلہ رہائش کا تھا لاہور میں اس کے ڈیڈی کے دور کی جان پہچان کی ایک عزیزہ ساجدہ بیگم رہتی تھیں۔ پھر سوائے اتفاق کہ ساجدہ بیگم کی بہو شہرین کے میکے والوں کی تانیہ کی امی سے بڑی اچھی سلام دعا بھی لہذا انہوں نے خوش دلی سے اپنے ہاں ٹھہرانے پر اصرار کیا۔ کالج کے ہاسٹل میں فی الحال دو ماہ سے قبل رہائش کے لیے کوئی کمر خالی نہ تھا سو اس وقت تک کے لیے اس کی رہائش گاہ ”خاورولا“ قرار پائی تھی۔ یہاں آکر شروع شروع میں تو خوب گھبرائی۔ نئی جگہ، نئی درس گاہ، نیا ماحول مگر پھر دو ہفتوں میں سیٹ ہو گئی۔ کالج میں ہم مزاج دوستیں بھی مل گئیں اور اساتذہ سے بھی جھجک اور اجنبیت دور ہوتی گئی۔ البتہ ”خاورولا“ میں وہ جتنا وقت گزارتی وہ قدرے بے سکونی اور بے چینی ہی میں کتنا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ انفرادی طور پر ان کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا، ہر شخص نے اپنی جگہ خوب آؤ بھگت کی تھی اسے ذاتی طور پر کوئی تکلیف یا پرہیز نہیں تھی۔

جو چیز اس کے اعصاب پر کوڑے کی طرح برستی تھی وہ اہل خانہ کے سردمہر انداز، خشک اور پر تکلف رکی رویے اور ایک دوسرے سے بدگمانی اور کدورت کے جذبات تھے۔ ہر شخص اپنی جگہ ایک دوسرے سے بدگمان اور شاکی نظر آتا تھا اور اس بدگمانی اور تشفر کا اصل منبع یا دوسرے لفظوں میں وجہ تنازعہ اس گھر

کے سربراہ خاور مغل کا سرد سنگین اور سپاٹ روہ تھا۔ ایک نظر دیکھنے میں بڑے گریس فل اور برد بار لگتے تھے مگر ان کے چہرے سے برستارعب، دبذبہ، جتنی اور تندی ان کی شخصیت کو مقابل کے لیے بڑی ہیبت ناک، پر جلال اور درشت مزاج بنا دیتی تھی۔ ان کی آنکھوں کا سرد دھڑ، روکھا بر فیلا تاثر جیسے رگوں میں دوڑتا خون منہ کر دینے کا باعث بن جاتا تھا۔

ان کے اس سخت گیر اور چٹان صفت مزاج کی بدولت اماں جی (ساحدہ بیگم) تک اپنا اصل مدعا و منہا پیش کرتے وقت گھبرا جایا کرتی تھیں۔ حالانکہ بظاہر وہ کہتے کسی کو بھی کچھ نہیں تھے۔ نہ چیخ چلا کر برہم مزاجی کا اظہار کرنے کی عادت تھی وہ ٹھیک ٹھاک کم گو تھے مقابل کو بے اوسان کرنے کے لیے ان کا دھیمہ مگر دو ٹوک حتیٰ سر دوسپاٹ لہجہ ہی کافی ہوتا تھا۔ جس کے آگے اماں جی کی بھی نہیں چلتی تھی۔

”گورنس کدھر ہے؟ بے پی نیند سے جاگ گئی ہے۔“ چھ ماہ کی زینی کاٹ میں پڑی ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی رونے کی تیار یوں میں تھی۔ خاور ڈریسنگ ٹیبل کے آگے سوئڈ بوٹڈ ہو کر تیار کھڑے اپنا جائزہ لیتے ہوئے برش کر رہے تھے۔ اماں کو کھلے دروازے سے اندر داخل ہونے پر استفسار اور اطلاع کا کام انجام دیا۔

”ادھر کاشی کا یونیفارم بدلوا رہی تھی۔ آتی ہی ہوگی۔“ اماں جی کاٹ کی طرف بڑھیں۔

”اس کی ماں کہاں چلی گئی، پرانی عورت پر چھوڑے ہوئے ہیں بچے۔ اتنی بھی سی جان کو یوں ہلکتا چھوڑ کر جانے والی ماؤں کے کیلچے جانے پھرنے کے ہوتے ہوں گے۔ ہم سے تو ایسی سنگ دلی کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔“ وہ زینی کو گود میں لے کر ٹھیک رہی تھیں، ساتھ ساتھ با آواز بلند بڑبڑا ہٹ بھی جاری تھی۔

”جیسے اولاد نہ ہوئی کھلونا ہو گیا۔ فرصت ملی تو گلے سے لگا کر چوم چاٹ کر دو منٹ کو اپنا دل بہلا لیا ورنہ پنگھوڑے میں پھینک کر ج سنور کر باز ارون، ہوٹلوں کی سیر کو نکل گئے۔“ اماں جی صاف انہیں سنا رہی تھیں۔

جواب میں خاور نے ٹھنک کر مڑتے ہوئے بے حد سگتی نگاہوں سے ماں کو دیکھا تھا۔

”بحیثیت انسان ہر فرد کو اپنی مرضی سے آزادی سے جینے کا بنیادی حق حاصل ہے۔ آپ کی بہو کوئی دنیا سے انوکھا کام تو نہیں کر رہی۔“

ان کے اکل کھرے انداز پر ماں جی نے بے حد برامان کران کی شکل دیکھی۔

”آزادی کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ بندہ گھربار کو چولہے میں جھونک دے۔ بھلا بتاؤ ساراسارا دن گھر سے باہر گزار دینا، اولاد کو کسی غیر کے بھروسے پر چھوڑ جانا گھر میں آئے گئے سے ملنے ملانے کے اوقات میں گھر سے غائب رہنا کسی عورت کو زیب دیتا ہے کیا اس طرح گھر چلا کرتے ہیں؟“ وہ بگڑ رہی تھیں۔

”وہ جس ماحول اور جس گھر سے آئی ہیں وہاں ایسے ہی چلتا ہے اس میں ان کا کیا دوش۔“ ان پر مطلق اثر نہ ہوا تھا۔

اماں جی بل کھا کر رہ گئیں۔ ”چڑیل نے کیسے میاں کو اپنے حسن کے جال میں پھانسا ہوا ہے کہ دو لفظ نہیں سن سکتا اس کے خلاف۔“

”مگر شادی کے بعد عورت کو سننے ماحول کے مطابق اپنے شوہر کے لیے خود کو بدلنا پڑتا ہے۔“

جواب میں ایک استہزائیہ مسکراہٹ خاور مغل کے ہونٹوں کو چھونگی۔

”ہر پیکر میں لچک نہیں ہوا کرتی اماں جی! یوں بھی شادی سے پہلے اسی روپ میں آپ لوگوں نے پسند کیا تھا یا انہیں پہلے بتا دیتیں کہ شادی کے بعد تمہیں اس پیکر میں ڈھلنا ہوگا اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔“

اماں جی زچ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

”خیر سے گئیں کہاں ہیں؟“ انہوں نے موضوع ہی بدل ڈالا۔

”ظاہر ہے حسب سابق ویمن کلب کی کسی تقریب میں۔“

”ایک تو ان بیگم صاحبہ کے سوشل ورک، اور پارٹیاں ڈنر ہی کبھی ختم ہونے کو نہیں آتے۔“ وہ پھر بڑی بدلتے گئیں۔ ”آئیں گی کب بلکہ عالیہ۔“

وہ خود پر کنٹرول کے باوجود طنز یہ لب و لہجہ ترک نہیں کر سکتی تھیں۔

”ڈنر کے بعد۔“ انہوں نے اطمینان سے تیار ہو کر اپنا الوداعی جائزہ لیا اور پرفیوم اسپرے کرنے لگے۔ ادھر اماں جی کس کر رہ گئیں۔

”ان کی واپسی تو آدھی رات کو ہوگی اور ادھر جو فریال کو دیکھنے کے لیے شام میں کچھ لوگ آرہے ہیں ان سے بات و ات کون کرے گا؟ دیکھ لو اب ذرا بہو صاحبہ کی تا فرمائیاں۔“

حالانکہ کل سے بتا رکھا ہے بلقیس نے کہ کل فریال کے سلسلے میں کچھ لوگ آرہے ہیں، ان کے ہاں کی خواتین بھی بہو اور اس کے میٹھے والوں کی طرح گٹ پٹ گٹ پٹ انگریزیاں بولتی ہیں۔ بلقیس نے کہا بھابھی اور خاور ہوں گے تو ان کو آرام سے سنبھال لیں گی۔ ان پر بھی رعب رہے گا کہ ہم بھی کچھ کم نہیں۔ اب بتاؤ اپنے لالو بچوں کا مومن کے لیے تو ان کے پاس فرصت ضرور ہے اور گھر کی اہم ذمہ داری میں ہاتھ بٹانے کا کوئی خیال نہیں۔“

”مجھے ایک بہت ضروری بزنس ڈیلنگ کرنی ہے۔ میں تو ادھر جا رہا ہوں۔ بشیر میرا ریف کیس گاڑی میں رکھ دو، دیکھو صمد نے گاڑی اچھی طرح صاف کی ہے یا نہیں۔“ اماں جی جل کر کوئلہ ہی تو ہو گئیں۔

”دونوں میاں بیوی کو اپنے کاموں کی پڑی ہے اور ادھر بیوہ معذور بہن کی بیٹی کے مستقبل کی کچھ پروا نہیں، ماں کی تکلیف کا کچھ احساس نہیں، شتاباش بچے۔“

مگر ادھر کچھ خاص اثر نہیں ہو رہا تھا ان کے واویلے کا مدت ہوئی ایسی باتوں پر انہوں نے سیریس ہونا چھوڑ دیا تھا۔

”رشتے جوڑنے بنانے کے کام میں آپ سے زیادہ مہارت کس کو ہوگی۔ یہ مجازاً آپ لوگ خود ہی بخوبی سنبھال لیجئے گا مجھے تو ویسے بھی ایسے کاموں کا سہنس نہیں۔“

ان کے بے گانہ سے روکھے تھیکے انداز پر ایک لمحے کو لاؤنچ میں ریموٹ کنٹرول کے بٹن دباتی تانیہ ششدر سی ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد اماں جی جلے دل کے کچھ پھونکے پھوڑنے کے لیے

تانیہ کے پاس آئیں۔

”جانے کون سی پٹیاں پڑھاتی رہتی ہے۔ اپنے حسن سے میرے بیٹے کو اپنے قابو میں کر لیا ہے کہیں اتنا فرماں بردار، اتنا خیال رکھنے والا ہوا کرتا تھا، یہ حیثیت رہ گئی ہے ماں کی، دوسروں کی بھی نہ بہو میں میں راج کرانی ہیں سسرال کو، اور فالتو میں رعب بھی بہتی ہیں۔ میں نے تو اتنی نرمی اتنی محبت، اتنے لاڈ پیار سے رکھا ہوا ہے۔ اتنے تو اس کے نگرے ہیں، اپنے منیکے کی امارت اور تعلیم کا ہم پر کیا احسان ہے۔ ہوں گے امیر وہ اپنی جگہ ہم کیا کسی سے کم ہیں۔ جب ہماری ہی خوشی غمی میں شریک نہیں تو ہمیں اس کی صورت اور امارت کا چاشنا ہے؟ میرے خاور پر تو جیسے سحر پھونک دیا ہے اس خوب صورت چڑیل نے۔“

شام کو فریال کو دکھنے کے لیے آنے والے مہمانوں کے ساتھ کیا ڈیلنگ ہوئی اس کا تو تانیہ کو پتا نہ چل سکا کیونکہ وہ کالج چلی گئی تھی البتہ رات کھانے پر شہرین کے ماتھے کی تیوریاں، بلیٹس آپا اور اماں جی کے پھولے پھولے چہرے دیکھ کر خاصی حد تک اندازہ ہو گیا کہ بہر حال کوئی گرما گرمی ضرور ہوئی ہے یا پھر متوقع ہے۔

”یہ مجھ بد نصیب کی تقدیر تھی کہ خاوند حادثے میں چل بسا اور میں ٹانگیں کٹوا بیٹھی۔ چھ نھمی جانوں کی ذمہ داری میرے منیکے پر آ پڑی مجھے تو بڑا امان تھا بڑا آسرا تھا کہ بھائی میرے بچوں کو پھولوں کی طرح رکھے گا۔ مجھ کم بخت کو کیا خبر تھی بیوی کے آجانے کے بعد بھائی کی نظر بدل جائے گی۔ اب اس جوگی بھی نہیں ہوں کہ محنت مزدوری کر کے ہی بچوں کا پیٹ پال سکوں۔ پڑی ہوں بھائی کے ور پر لاوارثوں کی طرح، بچوں کا آگ پیچھا کون دیکھے گا۔ ان بد نصیبوں کا کون والی وارث ہوگا۔ سوچا تھا اب یہ فکریں بھائی بانٹ لے گا۔ اللہ نے پیسہ بھی کھلا دے رکھا ہے۔ بادشاہوں کے محل جتنا گھر ہے جگہ مل ہی جائے گی مگر جب دل ہی تنگ پڑ جائیں تو محلوں کو کیا کرنا۔“

بلیٹس آپا بڑی دل سوزی سے بغیر کسی کو مخاطب کیے کہہ رہی تھیں۔ جواب میں خاور مغل کی فراغ پیشانی پر بل پڑتے تانیہ نے صاف دیکھ لیے تھے۔ شہرین تو ناک بھوں چڑھا کر نہایت بے نیازی کے عالم میں دوبارہ اپنی پلیٹ پر جھک گئی تھی۔

”میرے حساب سے آپ لوگوں کو یہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ آپ کے نام سے آپ کے ذاتی اکاؤنٹ میں ہر ماہ ایک کثیر رقم جمع کرواتا ہوں اس کے علاوہ آپ کے ہر بچے کا جب خرچ باقاعدگی سے ہر ماہ انہیں مل جاتا ہے، آپ کے بچے شہر کے بہترین انگلش میڈیم اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔ ان کے جوتے، کپڑے دیگر ضروریات کے لیے علیحدہ سے رقم مختص کر کے اماں جی کے حوالے کرتا ہوں اس کے علاوہ ضرورت پڑنے پر آپ میرے سیکریٹری مختار اعوان صاحب سے کسی بھی وقت جتنی چاہیں رقم نکلا سکتی ہیں۔ گھر میں آپ سمیت آپ کے ہر بچے کے لیے علیحدہ بیڈروم ہے، آپ کی آسانی کے لیے آپ لوگوں کا پورشن بانی گھر سے الگ بنایا ہوا ہے، آپ کی خدمت کے لیے جوئیں گھنے ملازم موجود رہتے ہیں گھر میں اس کے علاوہ بھی آپ لوگوں کی چھوٹی بڑی ضرورت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ پھر بھی آپ لوگوں کو شکوہ ہے تو میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔“

ان کے بدل دوٹوک، حتی انداز پر اماں جی بمعہ بلیٹس آپا جزی بڑی ہو کر رہ گئیں۔

”بیٹے یہ صحیح ہے تم نے ہر طرح سے بیوہ معذور بہن اور بوڑھی ماں کے آرام کا خیال رکھا ہوا ہے مگر بچہ روپے پیسے اور عیش و آرام کے علاوہ بھی بندے کی ہزار ضروریات ہوتی ہیں۔ ہم لوگ ترستے رہتے ہیں کہ تم دو گھڑی کو ہمارے پاس بیٹھو گے ہم اپنے دکھ سکھ کی باتیں کریں۔ ہمیں بولیں۔ بہو نے تو خیر قسم کھائی ہوئی ہے دکھ سکھ میں شریک نہ ہونے کی۔ مگر تم تو ہمارے اپنے ہو، ہمیں تو یوں لگتا ہے تم ارے درمیان رہتے ہوئے بھی ہمارے نہیں ہو۔“

جواب میں خاور مغل نے یکے بعد دیگرے بہن اور اماں پر گہری نظر ڈالی اس چپ چپ سی نگاہ میں بے متحرک طنز اور آرزو کی تھی۔

”اس دور میں سب سے بڑی ضرورت جسمانی تسکین ہی ہے، پیسہ ہے تو اس سے من پسند کھانے پکائے جاسکتے ہیں۔ رقم ہاتھ میں ہے تو پورا بازار خرید جاسکتا ہے۔ جب گرم ہے تو بادشاہوں جیسا محل برکیا جاسکتا ہے۔ سب کچھ مایا ہی ہوتی ہے۔ آپ کے پاس پیسہ موجود ہے اس سے جو جی چاہے یہ ہیں۔“

”مگر انسان کا نعم البدل پیسہ نہیں ہوا کرتا۔“ اماں جی کو دلی رنج پہنچا تھا بیٹے کے جذبات سے ری انداز پر۔

”اچھا۔۔۔“ ان کی نظریں جیسے ماں کی نظروں میں بیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔

”یہ سب پرانے زمانے کے خیالات ہیں اماں جی! انسان چاہے تو پیسے کے بل پر انسان کو بھی یہ دیکھتا ہے۔“

”اس کے جذبات اس کے دل کو تو نہیں خرید سکتا ہے نا۔“ تانیہ کہنا چاہ رہی تھی مگر صورت حال کو دیکھتے ہوئے دل میں ہی دبا کر رہ گئی اپنا خیال۔ یوں بھی وہ خاور مغل سے براہ راست بھی مخاطب نہیں دلی تھی اور سچی بات تو یہ بھی نہ ہی اس کی اتنی ہمت پڑتی تھی۔

”بہو اگر تم تھوڑا سا وقت نکال کر آجائیں، مہمانوں سے مل لیتیں تو کیا حرج تھا۔“

اماں جی اپنی المادر، طرح دار، بے پناہ حسین بہو کو سیدھا سیدھا آڑے ہاتھوں تو نہیں لے سکتی تھیں۔ اسی لیے دے دے انداز میں اپنی تنگی جتا رہی تھیں۔

”میں نے کوشش کی تھی آئی، مگر ٹائم نہیں ملا۔“ وہ بظاہر نہایت رسانییت سے کہہ کر اٹھ گئی تھی۔ پھر ات کو تانیہ کے ساتھ باہر واک کرتے ہوئے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

”ہاں میں کروں نا ان کی خاطر داریاں، پاس داریاں، جیسے مجھے تو پھولوں کی سیج پر بٹھایا ہوا ہے۔ باورگرنی نے میرے شوہر کو قبضے میں کر رکھا ہے۔ اسے میرا ہونے ہی نہیں دیا۔ جب پھل کھانے ہی بچے نصیب میں نہیں ہیں تو بچوں کی دیکھ بھال کر لینے سے کیا حاصل۔“

”کیا مطلب بھابی۔“ وہ ہلکی سی شہرین کو دیکھنے لگی۔ ”کیا خاور بھائی آپ کے ساتھ اچھے نہیں ہاں؟ ساجدہ آئی کا کہنا تو یہ ہے کہ آپ کی کشش نے خاور بھائی کے مزاج بدل دیے ہیں۔“ تانیہ کو خاصا نوب تھا۔

”ہونہ، بڑھیا کے دماغ میں تو خناس بھرا ہے۔“ شہرین چیخ گئی تھی۔

”میاں میرا ہے اور نازخہ ماں بہن کے اٹھاتا ہے۔ ارے مجھے تو ایک ایسی ساعت نصیب ہوئی ان پانچ سالوں میں جس میں دل کو یہ یقین ہوا ہو کہ خاور صرف اور صرف میرے ہیں۔ میرے بنے ہی نہیں سہی۔ جانے فطری جذبے کیسے قریب لے آئے جو کاشی اور زینی کی صورت میں میرے آگن میں دو پھول کھل گئے، ورنہ اس پتھر صفت بے حس انسان کے قرب میں شاید ساری عمر لیے پیاسی بیٹھی رہتی۔“

تانیہ جیسے ستائے میں آگئی۔ شہرین کے چہرے پر بولتی نارسائی، تشنگی اور حسرت پکار پکار کر کے بیان کی تصدیق کر رہی تھی۔

”تو بھابھی! آپ خود کو بدل کر دیکھ لیں۔ ہو سکتا ہے آپ کا موجودہ روپ ان کی پسندیدگی معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔ میرے بڑوں میں ایک آنٹی رہا کرتی ہیں۔ ہیں تو بالکل تنگ مگر میں انہیں شہر سے آنٹی ہی کہتی رہی ہوں۔ نموا آئی۔ وہ کہا کرتی ہیں تعلقات استوار کرنے کی پہلی سیرمی caring and caring behavior (دوسروں کا خیال رکھنا) دکھاتا ہے۔ آپ ان کو کھولیں ان کے کی بات انہیں زبان پر لانے کا موقع دیں پھر اس کے مطابق ان کے مطلوبہ روپ میں ڈھل جائیں۔ شہرین نے ملول سے انداز میں اس کے گلابی رخسار تھپکے۔

”ارے تانیہ ڈیڑ! تم نہیں جانتیں خاور مغل کا دل ایک ایسا بند قلعہ ہے جس میں داخل ہونے کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے، کوئی دروازہ نہیں ہے جہاں سے اندر داخل ہوا جاسکے۔ اس کھوڑا شخص کا دل ناممکن ہے، میں ان پانچ سالوں میں ہر حربہ اپنا چکی ہوں۔“

”ہو سکتا ہے وہ کسی سے۔۔۔“ تانیہ نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ کر شہرین کی طرف دیکھا وہ مشکل سے انداز میں مسکرا دی۔

”ایسا بھی کچھ نہیں ہے، میں الف تائی اس کی ہسٹری پڑھ چکی ہوں، کھنگال چکی ہوں۔ اس ساری زندگی نہ کوئی دوست بنایا نہ راز دار، بڑوں اور صرف بڑوں کا ہم ہے اس کے لیے۔ ہر شے سے؛ میں نے اکثر اوقات خفیہ طریقے سے اس کی باہر کی سرگرمیوں پر نظر رکھی ہے۔ اس کی کالز اس آفس کا ماحول ہر شے چیک کر ڈاٹا مگر کوئی سراہا تھ نہیں آیا بھلا بتاؤ جس شخص نے ساری عمر کسی مرد بھی دوستی نہ کی ہو وہ عورت سے کیا تعلق رکھے گا۔ حتیٰ کہ امریکہ جیسے آزاد خیال ملک میں دو سال گزار کے باوجود اس کے سرد پتھر جیسے دل کو جذبات کی آج نہیں پگھلا سکی۔ اب تو میں ہر طرف سے ماہ ہو چکی ہوں تانیہ۔“

تانیہ ابھی سی گئی تھی۔ خاور مغل کی شخصیت اسے اول روز سے بڑی پراسرار اور پرت داز سی لگتی تھی یوں جیسے پرانے طرز کی بنی ہوئی کوئی خوب صورت سی آسیب زدہ چولی ہو۔ جسے دور سے دیکھ کر جہاں میں پھیری سی دوڑ جاتی ہو۔ وہ ان سے اچھا خاصا خائف رہتی تھی اور اب تو مزید ہراساں سی ہو چکی تھی۔

ارے کہاں نکل رہی ہو تم؟“ صائمہ اور راضیہ دونوں جڑواں تھیں اور میٹرک کے سپر ز دے کر غ ہوئی تھیں، خصوصی اہتمام سے تیار ہو کر بشپ کو گاڑی نکالنے کا کہہ رہی تھیں۔ جب ساجدہ بیگم سے کڑک دار آواز میں استفسار کیا۔ ان کی آنکھوں میں ناگوازی اور غصہ تھا۔

یونہی نانی جان، ذرا آؤ تنگ پہ جارہے ہیں۔۔۔“ صائمہ نے بویک کا ڈیزائن کردہ نئے نوے لے کے جدید کڑھائی والے سبز سوٹ کے کلف زدہ اکڑے ہوئے دوپٹے کو ایک سائیڈ پر کرتے لے لاپرواہے انداز میں جواب دیا۔

کون سی آؤ تنگ ہوتی ہے اس وقت؟ شام سر پر ہے اور جوان جہان لڑکیاں اکیلی نکل رہی ہیں۔۔۔ چلو بیٹھو گھر آرام ہے۔“

ارے چھوڑیے بھی نانی جان، کیا دقیاوسی باتیں کرتی ہیں۔“ راضیہ نے اپنے بوب کٹ بالوں کو مکھنے کے بعد نانی کے کندھوں کو ہلکا سا چھوا، اور پھر بڑھ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ساجدہ بیگم تلملا کر ادبھتی رہیں۔

دیکھ لو، کس قدر خود سر ہے یہ اولاد تمہاری نہ شرم نہ حیا، دیدوں کا پانی ہی ڈھل گیا ہے۔ ایک وہ لہر سارا سارا دن بائیک اڑاتا رہتا ہے۔ خبر جو ہے ماموں کے پاس تجوریاں بھری ہوئی ہیں۔ ہے سو برباد کر رہے ہیں۔ بڑی فریال ہی کو دیکھ لو۔ نوکری کی تو شور مچا دیا کہ مجھ سے صبح شام کیوں پہ دھکے نہیں کھائے جاتے اور ماموں سے فرمائش کر کے نئی سوزوکی کار لے لی۔ اب صبح اپنی ہے اور شام گئے سارا پیٹرول پھونک کر نو ابوں کی طرح ٹھانٹھ سے گھر واپس آتی ہے نہ کوئی نہ بولنے والا۔“

دک ٹوک اور پوچھ گچھ تو گھر کے مرد ہی تو کیا کرتے ہیں۔ یہاں ماموں کے پاس ٹائم نہیں بے مار نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوں گے میں معذور مجھ سے کون ڈرے۔ ماموں نے کھلی پھٹی ہے۔ سو بگڑیں گے نہیں تو اور کیا ہوگا۔“ بلقیس آپا، ماں، کہہ دو ایلے پر سارا دوش بھائی کو دے

اس کے پاس تو ایک ہی جواب ہوتا ہے، روپے پیسے کی، کھانے پینے کی عیش آرام کی تنگی ہے تو ما، باقی باتوں کے لیے میں ذمہ دار نہیں ہوں۔

بانے وہ ایسا کیوں ہو گیا ہے، وہ تو بڑے لحاظ والا بڑے احساس والا ہوا کرتا تھا۔“ بلقیس کو دونوں پر سخت ملال تھا۔

پہا بایو کی ڈایا گرام بناتے ہوئے چپ چاپ ان کی باتیں سن رہی تھی اس کے ذہن میں ہلچل مائجی۔

سے جانو، چندا میری، جلدی سے چپ ہو جاؤ ابھی آیا آ رہی ہے۔“ آں آں کرتی ہاتھ پاؤں لودوں ہاتھوں پر اٹھائے وہ لان میں ٹبل رہی تھی، جب اندر سے خاور مغل نکل کر پورچ کی نظر آئے۔

ہٹس۔“ بے تاثر سے انداز میں کہہ کر انہوں نے اس کے ہاتھ سے مگ لے لیا پھر اخلاقاً
انست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

کارا وہ ایسا نہیں تھا مگر پھر کچھ سوچ کر احتیاط سے بیٹھ ہی گئی۔ وہ مکمل طور پر پیٹی وی کی جانب
شاید بی بی سی لگا ہوا تھا۔ تانیہ نے ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ان کا جائزہ لینا شروع کر

نی شاندار پر سناٹی ہے مگر آنکھوں اور چہرے پر اتنی بے گانگی کیوں ہے، ہونٹوں پر اپنائیت آمیز
کے نشان کیوں نہیں ملتے۔ مجھے ایک مہینہ ہونے کو آیا ہے مگر میں نے ابھی تک ان کے ہونٹوں
ہی مسکراہٹ کی جھلک بھی نہیں دیکھی نہ ماں بہن کے لیے، نہ بیوی بچوں کے لیے نہ کسی
ننا کے لیے، کتنی بند بند سے لگتے ہیں دیکھنے میں، شہرین پھا بھی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ یہ ایک
برقعہ ہیں۔ لیکن پھر بھی ہیں تو انسان ہی نا، نمود آئی کہا کرتی ہیں اللہ نے کسی شخص کو پیدا کسی برا
۔ اللہ تعالیٰ کو تو اپنی ساری مخلوق سے برابر کا پیار ہے انسان کے اچھا برا ہونے میں سب سے
باپ کی دی گئی تربیت اس کے بعد ارد گرد کا ماحول اور پھر معاشرے کے افراد ہوا کرتے ہیں،
انہو ایسا کیا مسئلہ ہے؟ ماں خائف، بہن ہٹا کی، بیوی مظلوم، بچے توجہ کے منتظر اور ایک یہ ہیں ہر
لر صرف بڑس میں کم رہتے ہیں۔

آپ کو کسی قسم کا کوئی مسئلہ تو نہیں ہے یہاں؟“

ہاپنے دھیان میں نہایت انتہاک سے ان کو پڑھ رہی تھی جب دفعتاً اس کی طرف متوجہ ہوتے
ہوں نے دریافت کیا تھا۔

ب لکھے کو تانیہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، چوری پکڑے جانے کے خیال سے چہرے پر خفت
جھا گئی۔ خاور مغل نے ایک لمحہ کو اس سترہ اٹھارہ برس کی دو شیزہ کا معصومیت اور سادگی کے رنگوں
ش کو لگائی چہرہ دیکھا پھر بے تاثر انداز میں نگاہ ہٹائی کہ نظر کے اس تصادم نے تانیہ کی پیشانی
دکڑی تھی۔

”ج۔۔۔ جی نہیں تو۔“

ہوں۔۔۔“ وہ مکمل طور پر پیٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے، اصولاً اب اسے اٹھ جانا چاہیے تھا اس کا
نکا نہیں تھا۔

”خاور بھائی! آپ ماسڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر جانے کیوں
اگے بڑھا کر بے ساختہ رک کر پوچھ بیٹھی تھی۔

جب میں انہوں نے صرف بھنویں اٹھا کر مستفسرانہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر کہنے لگی۔“ خاور بھائی میں نے اکثر محسوس کیا ہے جیسے آپ کو خدا نا خواستہ
ن کا سامنا ہے۔ آپ کے انداز میں بڑی بے گلی اور اضطراب سا پایا جاتا ہے۔ جس سے لگتا ہے
لٹی پریشانی ہے۔“

ال کے خاموش ہونے پر خاور مغل نے چونک کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اتنی معصوم سی، چھوٹی

تانیہ نے ایک لمحہ کو اپنی توجہ زینی سے ہٹا کر ان کی جانب مبذول کی۔
سلور گرے تھری نیس سوٹ میں وہ تک سب سے تیار بڑی شان بے نیازی سے پڑا
چال چلتے ہوئے سفید کرولا تک آئے تھے۔ براؤنش بلیک گھنے بالوں کا کچھا بڑے اسٹائش
ان کی پیشانی پر پڑا ہوا تھا۔

”نہ جانے کتنے دل تو اسی گچھے میں انک گئے ہوں گے۔“ اس نے بے خیالی کے عالم
تھا۔

اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کچھ سوچ کر وہ رک گئے۔

”ہیلو بی کیسی ہیں آپ۔۔۔؟“ انہوں نے رسا پوچھ لیا۔

”فائن۔“ وہ ان کی موجودگی میں ہمیشہ کی طرح گھبرا کر بوکھلا سی گئی تھی۔

”اسٹڈی کیسی جا رہی ہے؟“ انہوں نے یونہی پوچھ لیا، باباں ہاتھ گاڑی کالا کھول رہا
”ٹھیک ٹھاک۔“ تانیہ کو جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بڑے اچھے اچھے سے ہوں
گہری بھوری آنکھوں میں عجیب سی سرخی پھلتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس بابت پوچھنا چاہ رہی
ہمت کہاں سے لاتی۔

”امی پرا بلیم۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے اسی نارمل سے انداز میں اپنی سی ڈی
ڈال کر سوال کیا اور اس کے سرفی میں ہلا دیئے پرزن سے گاڑی نکال کر لے گئے۔

وہ زین کو لوری دیتے ہوئے کتنی ہی دیر ان کے بارے میں سوچتی رہی۔ یونہی بے دھیانی
میں ان کے رویوں کا تجزیہ کرتی رہی۔

رات کو پڑھتے پڑھتے پیاس لگی۔ اپنے فریق میں جھانکا اتفاق سے دونوں بوتلیں خالی
گلاس اٹھائے باہر آئی۔ لاؤنج سے گزری تو لائٹ جلتی دیکھ کر ادھر آ گئی۔

صوفے میں دھنسے، منہ میں سگریٹ دبائے بظاہر تو وہ پیٹی وی کی سمت متوجہ تھے مگر ذہن
بھول بھلیوں میں گم تھا۔ جس پر قیمتی سلیسبنگ گاؤن لپٹا ہوا تھا۔ لاؤنج کی فضا میں سگریٹ کی
ساتھ ساتھ ان کے مخصوص برقیوم کی بھنی بھنی خوشبو شامل تھی۔

اس نے مڑ کر وال کلاک کی سمت دیکھا۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ باقی پورا گھر نیند
میں تھا۔

معاً ان کی نظر اس پر پڑی۔ وہ قدرے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ تانیہ تجل سی ہو کر آگے بڑ
اب اس کے سوا کچھ چارہ نہیں تھا۔

”آپ سوئے نہیں ابھی تک خاور بھائی۔“ تھوک نکل کر ہاتھ میں پکڑے گلاس کے کنا
مضبوطی سے انگلیاں جماتے ہوئے اس نے انہیں مخاطب کیا، انداز میں جھجک تھی۔

”نہیں۔۔۔“ اس سے مختصر جواب کوئی بھی نہیں سکتا تھا۔ ان کی نظریں پیٹی وی اسکرین
تھیں۔

کچن میں گئی تو پانی پینے کے بعد اپنے لیے کافی بنائی اور ساتھ میں ازراہ ہمدردی ان کے لیے بھی

سی سادہ سی لڑکی محسوسات کے اعتبار سے اتنی پختہ بھی ہو سکتی ہے۔

”نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ جا کر آرام کیجیے۔“ ان کے انداز میں اتنی قطعیت سے اسے مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

”فاطمہ! ایک کپ چائے بنا دینا اسٹرانگ سی۔ سر میں بہت درد ہے۔ میں اپنے کمرہ ہوں۔“ وہ بوجلت چکن کے دروازے سے ہانک لگا کر بڑھ گئے تھے۔ یہ دیکھتے بغیر کہ چکن میں تانیہ کھڑ پڑ کر رہی ہے۔

اپنے لیے دوپہر کا کھانا نکالتی تانیہ نے اپنا کام روک کر ان کے لیے چائے بنائی اور مدہمی دے کر ان کا جواب ملنے پر اندر چلی آئی۔

”ارے آپ نے کیوں زحمت کی۔“ وہ ٹائی ڈھیلی کیے اپنے اسی فارل ڈریس میں ایزی وراز تھے۔ انداز میں بہت تھکن اور کسٹمنڈی نمایاں تھی۔

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے کپ انہیں تھما دیا۔

”خاور بھائی! آپ اتنے تھکا اتنے آدم بے زار سے کیوں رہتے ہیں سب سے الگ تھکا ہی دنیا میں گم۔“ آج وہ ساری ہمتیں بے دار کر کے بالآخر پوچھ ہی بیٹھی۔

”آپ کا وہم ہے بے بی۔“ اس کی بات پر وہ پہلے ٹھٹھے، پھر سر جھٹک کر سختی سے کہہ کر چا سمت متوجہ ہو گئے تھے گویا مزید کچھ نہ سننے بولنے کا سٹل دے دیا ہو۔ مگر وہ جیسے طے کر کے آئی تھی ”اس طرح کا رویہ تو خود آپ کے لیے بہت براہمز کوری ایٹ کر دے گا۔ آپ بہر ہو جائیں گے۔ نموا آئی کہا کرتی ہیں ہم معاشرے میں اکیلے نہیں ہوتے ہاں مگر اس وقت جب ان کو آرٹیشن میں غلل واقع ہو جائے اور کیوینٹیشن گیپ پیدا ہو جائے۔“

اس کے سادہ و فطری رزاں لہجے پر اور سب سے بڑھ کر اس کے جملوں کے انتخاب پر وہ بھونچکا ہو کر حقیقی معنوں میں اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

وہاں کے یوں نجد سا ہو کر گھورنے پر اندر سے ہر اسال ہی ہو گئی، شاید مجھے اتنی جرأت کا نہیں کرنا چاہیے تھا، وہ جھپاک سے باہر نکل گئی۔

”کیا ہو رہا ہے بے بی۔“ اس شام وہ لان میں سبزے پر بیٹھی پڑھ رہی تھی جب وہ آئے۔

”جی۔۔۔ بس بڑھائی، آپ آئیے نا، بیٹھے پلیز۔“ اور تانیہ کو حیرت اس وقت ہوئی جب لان چیر گھسٹ کر بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔

”میں تو بہت بڑی رہتا ہوں، وہیاں نہیں دیا اس پوائنٹ پر۔ آپ کو آؤنگ وغیرہ جانا ہو تو ضرور بتائیے گا۔“

”خاور بھائی! اگر میں یہ کہوں کہ آپ اتنا بڑی رہتے نہیں ہیں جتنا کہ خود کو بڑی رکھتے ہیں اس نے ان کی دوسری بات گویا سنی ہی نہیں تھی۔

وہ اس بار بڑے زبردست انداز میں چونکے، تانیہ نے دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر خوشامباشی کی۔ گویا اس کا تنکا درست نکلا تھا۔

”آپ یہ بات کیسے کہہ سکتی ہیں۔“ ان کی پیشانی پر بے شک غصے اور ناگواری کے بل پڑے وئے تھے مگر آنکھوں میں گردش کرتی پریشانی اور تعجب بہر حال تانیہ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔

اس کا اندھیرے میں چلا یا گیا تیرنٹا نے پرچا لگا تھا۔

”نموا آئی کہا کرتی ہیں جب کوئی شخص زمانے سے خائف ہوتا ہے تو بے گانگی اور غصے کا خول پیٹ کر قلعہ بند ہو جاتا ہے۔ اس قلعے کو باہر سے دیکھنے والے اسے بڑا مضبوط اور ناقابل تسخیر سمجھتے ہیں جب کہ جو بہادر اور ہمت کر کے اس کے اندر گھستا ہے وہ یہ دیکھ کر متحیر رہ جاتا ہے کہ اتنی قلعے کے اندر تو راضل ریشم جیسی نرمی ہے۔“

”آپ اتنی چھوٹی سی ہو کر اتنی بڑی اور مشکل باتیں کیسے کر لیتی ہیں۔“ وہ حقیقتاً متحیر رہ گئے تھے۔

”اس کا کریڈٹ نموا آئی کو جاتا ہے، ان ہی کا کہنا ہے کہ شیر کر لینے سے دکھ آدھا رہ جاتا ہے، آپ کے ساتھ اگر کوئی براہمز ہے تو اسے جتا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیں۔ شہرین بھابھی سے شیر کر لیں آئی یا آپا سے کہہ دیں مگر نہ آپ پر بیچ سوچوں کے جال میں الجھتے چلے جائیں گے۔“

اس نے بڑے خلوص سے انہیں مشورہ دیا تھا جس پر جانے انہوں نے عملدرآمد کا سوچا یا نہیں البتہ یہ ہوا کہ ان کا رویہ اس کے ساتھ بڑا اپنائیت آمیز اور کسی حد تک دوستانہ ہوتا چلا گیا۔ وہ غیر محسوس انداز میں اس کی سرگرمیوں میں، اس کے فرصت کے اوقات میں دلچسپی رکھنے لگے۔ ان کے چہرے پر چھائی سختی اور بے گانگی کا نقاب اس کی موجودگی میں غیر ارادی طور پر سرک جایا کرتا تھا۔

حیرت تو اسے اس وقت ہوتی تھی جب اس نے انہیں۔

”تو کچھ محبوب مجھے تھا مجھے معلوم ہے یہ“ دھیرے دھیرے گنگنا تے سنا۔ ایک ہی مصرع آنکھیں بند کیے بڑے جذب کے عالم میں وہ اپنی ہی ترتیب دی گئی دھن میں گنگنا رہے تھے اور پھر اسے حیرت اس وقت ہوئی جب ایک دن کشورنا ہدیک ”بے نام مسافت“ سے ایک نظم منتخب کر کے اسے سنانے لگے۔

آگ اور برف کے درمیان کھلے لاوے کی صورت یہ آنکھیں

جودل کی کبی ان کبی ہوتے دیکھیں

برس لیں تو اچھا ہی ہو

نمائش کی تحریر سے، زندگی کی روایت نبھاتے بہت عمر گزری

بہت حوصلوں کی شکستوں کو پندار نے خامشی کے کفن میں لپیٹا

بس اب راستوں میں درختوں کی پرچھائیاں کا سند یہ سمجھ لو، وہ دیوار گرتی نظر آرہی ہے

”خاور بھائی! آپ اور شاعری۔“ وہ استعجاب سے بولی تھی۔

”تم تو یوں حیران ہو رہی ہو گویا شاعری مجھ جیسے بندے کے لیے شجر ممنوعہ کی سی حیثیت رکھتی ہے۔“

وہ بے اختیار مسکرا دیے تھے اور اسی پل اندر داخل ہوتی شہرین گنگ سی رہ گئی۔ اس نے تو کبھی ان

کے بچنے ہوئے پتھر علی غنابی ہونٹوں کے غنوں کو شگفتگی سے کھلتے نہیں دیکھا تھا۔

”بھابھی! ملاحظہ کر رہی ہیں آپ اپنی نیرنگی فطرت کے کمالات، آج خاور بھائی اپنی پسند کی شاعری سنارہے ہیں۔“ تانیہ نے خوش دلی سے شہرین کو مخاطب کیا تھا۔

”ہاں دکھ رہی ہوں۔“ شہرین کے انداز میں عجیب سا ٹھہراؤ تھا، نظریں خاور مغل کے چہرے پر جمی تھیں جہاں مسکراہٹ یوں غائب ہوئی تھی جیسے کبھی آئی ہی نہ ہو۔

”بلکہ میں تو منتظر ہوں جب یہ خود بھی شاعری کرنے لگیں گے۔ بدلتی رتوں کا کیا پتا چلتا ہے۔“ شہرین کے لہجے کی تلخ اور ترش جھکاکو تانیہ تو سمجھ نہ سکی اور خاور مغل نے سمجھ کر بھی توجہ نہ دی۔

اس دن صبح سے مسلسل بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اس نے کالج سے چھٹی کا پروگرام بنالیا، ٹھنڈ بھی ٹھیک ٹھاک ہو رہی تھی۔ شام کے اوقات میں یونہی موسم کی خبر لینے وہ ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تو دھک سے رہ گئی۔

ایک کونے میں کرسی ڈالے ہلکی نیلی شرٹ اور گرے پتلون میں وہ بڑے سکون و اطمینان سے بیٹھے بھیگ رہے تھے۔ آسمان پر گہری بدیلیوں کا رقص جاری تھا۔

”خاور بھائی۔۔۔!“ وہ مثال اچھی طرح پلیٹ کر شیڈ کے نیچے سے ہوتی ہوئی ان کے پاس پہنچ گئی۔ اسے ان سے اس ویوانے پن کی توقع نہ تھی۔

”ہاں آؤ بھئی تانیہ! میں اس وقت تمہاری ضرورت ہی محسوس کر رہا تھا۔“ وہ اتنے ایزی ہو کر بیٹھے تھے گویا اپنی خواب گاہ کے پُر سکون ماحول میں ہوں۔

”آپ تو سارے بھیگ گئے ہیں خاور بھائی۔“ تانیہ نے فکر مندی سے انہیں دیکھا۔

”ارے یار! مزے میں ہوں۔“ انہوں نے اتنی ہی بے فکری سے ہاتھ ہلایا اور اس سے جیسے تانیہ پر بہت کچھ منکشف ہو گیا۔

”خاور بھائی! ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھو ضرور پوچھو، لیکن اس سے پہلے میری ایک بات سن لو۔“ ان کے انداز میں محسوس کی جانے والی بشاشت بھی جو آن کی آن میں ان کے مزاج پر چھا گئی تھی۔

”جی کیسے۔“ اسے خاور مغل بڑے ”نئے“ سے محسوس ہوئے۔

”تمہارا یہ انداز مخاطب بڑا پیارا اور دلکش لگتا ہے۔“ وہ بے ساختہ ہنس پڑے تھے وہ بھی ذرا سا جھینپ کر ان کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔

”بس عادت سی پڑ گئی ہے۔“ پھر وہ اپنی بات پر آگئی، سنسنیل کر مخاطب ہوئی۔

”خاور بھائی! آپ کو کوئی دکھ ہے؟“

اس کے غیر متوقع سوال پر استغہامی انداز میں اسے دیکھنے لگے۔

”نمو آئی کہا کرتی ہیں جب انسان کو بہت کاری زخم لگے کوئی بڑا روگ یا دکھ جان کو چٹ جائے تو وہ اسی طرح گرمی سردی اور زمان و مکان کے حساب سے بے خبر ہو جایا کرتا ہے۔“ بڑا گہرا نکتہ نکالا تھا اس نے۔

خاور مغل نے ایک گہری سانس لی۔ بولے اب بھی کچھ نہیں۔

”بتائیں نا خاور بھائی، کیا ایسی ہی کوئی بات ہے۔“ اس نے اب کے بے دھڑک اصرار کیا تھا ہال ان کا خاموش انداز کچھ نہ کچھ معانی ضرور رکھتا تھا۔

”تمہارے اس سوال کے جواب میں مجھے بے ساختہ ایک نظم یاد آرہی ہے۔ کہو تو سنا دوں؟“

”ہاں ضرور، لیکن پہلے یہ وضاحت کر دیجیے کہ اتنی لمبی مصروف زندگی میں شاعری کا شغف کیسے آئے جس تھا کہ آپ پہلے سے اس میدان کے شہسوار رہے ہیں یا تازہ تازہ شوق ہوا ہے۔“

”جب میں امریکہ میں ہوتا تھا وہاں فارغ اوقات میں اردو ادب سے دل بہلاتا تھا۔ اسی زمانے کچھ یادیں رہ گئی ہیں وگرنہ اس سے پہلے اور اس کے بعد مصروفیات کے جنگل میں ایسا بھٹکا کہ پھر رستہ بلا بہر حال نظم سنو۔“

پوچھنے والے تجھے کیسے بتائیں آخر
دکھ عبارت تو نہیں ہے، جو تجھے لکھ کر وے دیں
یہ کہانی بھی نہیں ہے کہ سنائیں تجھ کو
نہ کوئی بات ہی ایسی کہ بتائیں تجھ کو
زخم ہو تو تیرے ناخن کے حوالے کرویں
آئینہ بھی تو نہیں ہے کہ دکھائیں تجھ کو
یہ کوئی راز نہیں جس کو چھپائیں تو وہ راز
بھی چہرے، بھی آنکھوں سے چھلک جاتا ہے
جیسے آج کل کو سنبھالے کوئی اور تیز ہوا
جب بھی چلتی ہے تو شانوں سے ڈھلک جاتا ہے
اب تجھے کیسے بتائیں ہمیں کیا دکھ ہے

ان کے پرسوز دلکش لب و لہجے کے زیر و بم میں وہ خود ڈوبتا محسوس کر رہی تھی۔ نظم بنا کر وہ چپ بہا منے خلا میں ٹکنے لگے تھے جب کہ وہ ہنوز اس کے بحر میں گم تھی۔

”کو تو آپ ادھر ہیں۔“ اسی لمحے شہرین ادھر آئی تھی۔ اس کے لہجے اور چہرے پر کچھ تھا جس نے

بکونہ چاہتے ہوئے بھی شرمندہ سا کر دیا۔

”اور ادھر آپ کا موبائل کمرے میں بچ کر تھک گیا۔“ وہ خاور سے ہی مخاطب تھی۔ خاور مغل ایک لفظ کہے بغیر موبائل ہاتھ میں لے لیا۔

تانیہ نے جانے کی غرض سے قدم آگے بڑھائے۔ اسی لمحے انہوں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر پکارا۔

”ایک منٹ تانیہ! تم یوں کروڈریس چینیج کر کے نیچے آؤ میں بھی چینیج کر کے آتا ہوں۔ باہر چلتے لانگ ڈرائیو پر، واپسی پر انکس کریم کھائیں گے ٹھیک۔“ وہ کہہ کر پھر فون کی سمت متوجہ ہو گئے تھے۔

”آپ کو کہاں ملی تھی؟“

”ایسے ہی برستے موسم میں پہلی بار ملاقات ہوئی تھی اور اس وقت وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ دل کی کلین بن جائے گی۔“

”کلاس فیلو تھی؟“ وہ بڑے سچاؤ سے زخموں سے کلنگر چھنے کا کام سرانجام دے رہی تھی۔
”نہیں۔۔۔!“

”کوئی رشتہ دار۔۔۔؟“

”نہیں اس سے اس قسم کا کوئی ربط استوار نہیں تھا۔ بابا مرحوم کے کسی جاننے والے کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں باپ دونوں ابوظہبی میں تھے۔ وہ ہمارے ہاں آئی تھی تعلیم مکمل کرنے کے لیے، پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے معاشیات کر رہی تھی۔ ہوٹل میں ہی رہتی تھی۔ ہمارے ہاں ویک اینڈ پر آتی تھی۔ اس کے گارجین تھے ہم لوگ یہاں اور اس کا پورے پاکستان میں کوئی نہیں تھا۔“ وہ حرزہ کیفیت میں اس کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے۔

”کیا آپ نے پہلی نظر میں اسے پسند کر لیا تھا؟“

”نہیں، مجھے تو بہت عرصے بعد معلوم ہوا کہ اس میں کوئی شے ایسی بھی ہے جسے پسند کیا جاسکتا ہے۔ شروع شروع میں تو میں شدید خائف رہا کرتا تھا اس کے وجود سے، یہ تو جدائی نے بتایا کہ وہ میرے لیے کیا تھی۔ اس کے ساتھ رہ کر تو احساس ہی نہ ہوا تھا کہ وہ میری ضرورت بھی بن سکتی ہے۔ یوں بھی جب تک پیٹ بھر کھانے کو ملتا رہے، فاقے کی کیفیت سے آشنائی کیسے ہو سکتی ہے۔ جب تک اس کی ذات کا چشمہ میسر رہا میں سیراب ہوتا رہا تب تک احساس کی جذبات باس بھی نہ بھنگی، جب سوتے خشک ہو گئے جب خیمہ اکھڑنے لگے تو احساس ہوا وہ تو چشمہ آب حیات تھا۔ مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔“

”کیا چہرہ آپ کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔“

”میری بزدلی۔“ انہوں نے بڑی فراخ دلی سے تسلیم کر لیا تھا۔

”بزدل اور آپ۔۔۔؟“ تانیہ نے ان کے لمبے چوڑے بارعب، دبنگ و جود کو دیکھتے ہوئے بے یقینی کے عالم میں کہا۔

”ہاں، مصلحتوں کی آڑ لینے والا بزدل ہی ہوا کرتا ہے۔“ انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
”کیا وہ بھی آپ کو پسند کرتی تھی اور کیا آپ نے کبھی اس سے اظہار کیا؟“ اس کو یہ تک پہنچنے کی عجلت سوار تھی۔

وہ مجروح سی ہنسی ہنس دیے۔

”ایسا کچھ ہمارے درمیان آیا ہی نہیں، تم کیا سمجھ رہی ہو، یہ روایتی عشق و محبت کی داستان ہے۔ ارے بھی اگر ایسا ہوا ہوتا تو غم کا بے کا تھا۔ کیوں اتنے برس ایک ہی روگ پالتا رہا اپنے اندر، بھلا نہ دیا ہوتا سب کچھ۔“

”کیا وہ بہت حسین تھی؟“ اسے بڑا اشتیاق ہو رہا تھا اس نادیدہ ہستی کے متعلق جاننے کا جس نے خاور مغل جیسی مضبوط چٹان کو پانی کر دیا تھا۔

”چلیے بھابی! آپ بھی تیار ہو جائیں۔ اکٹھے چلتے ہیں، مزار ہے گا۔“ اس نے سیر ہیاں اترتی شہرین کو مخاطب کر کے پر جوش ہوتے ہوئے کہا۔

”نہیں بھئی، دعوت تمہیں ملی ہے لاگ ڈرائیو اور آکس کریم کھانے کی، تم ہی جاؤ میرے ساتھ تو ایسا نادر روزگار واقعہ بھی نہیں ہوا۔“

شہرین کے کڑوے کیلے تلخ انداز میں کیا تھا، بدگمانی، تمسخر، طنز، جلاپا، اس کے لہجے کی کاٹ نے تانیہ کو چند ساعت کے لیے گم قسم کر دیا۔ بہر حال بچی تو نہیں تھی جو شہرین کے حاسدانہ تیور نہ سمجھ سکتی۔ اس کا خاور مغل کے ساتھ یوں اتنے حسین موسم میں تنہا گھومنا پھر تاقینا بیوی ہونے کے ناتے اسے شاق ہی گزرنا چاہیے تھا۔ یہی سوچ کر تانیہ نے ٹال مٹول بھی کرنا چاہی مگر خاور مغل نے ایک نہ سنی، وہ بڑی ترنگ میں نظر آ رہے تھے ڈرائیو کرتے ہوئے۔

تانیہ ان کے مزاج کے بدلتے موسموں کو سمجھنے میں جب قطعی ناکام رہی تو بالآخر ان سے الجھ بیٹھی۔
”خاور بھائی! یہ آپ کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا ہے آپ کے مزاج میں اتنا تنوع کیوں ہے۔ کچھ کبھی کچھ، نموا آئی کہا کرتی ہیں مزاج میں اس قسم کی بے رنگی اور بے ترتیبی اس صورت میں آیا کرتی ہے جب دل میں سکون نہ ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ اپنا سکون تو کہیں لٹا بیٹھے ہیں؟“
جواب میں اس نے ان کے پتھر چہرے پر دکھ کی عجیب سی دراڑیں محسوس کیں، ان کا چہرہ ایک لمحے کو پھیکا سا پڑ گیا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ جذبات کی شدتوں کو چھو آئے ہیں عمر کے کسی حصے میں؟“
وہ بغور انہیں دیکھ رہی تھی ”کیونکہ نموا آئی کہتی ہیں شدتوں کے موسم میں بھگنے کے بعد انسان کے مزاج میں یا تو خزاں کی زرو بے رنگی چھا جاتی ہے یا لہجیوں کی کڑواہٹ مزاج کو وحشت زدہ کر دیتی ہے۔“ وہ اب کے عجیب متاسف و طول انداز میں مسکرائے پھر گویا ہوئے۔

تمام عمر جیسے اور کچھ نہ کر پائے

کسی کے ہو کے رہے اور نہ اپنا کر پائے

زمانہ اس کے حوالے سے یاد کرتا ہے

کہ جس سے اپنے ستارے نہ مل پائے

”خاور بھائی۔۔۔“ وہ ایک لمحے سناٹے میں رہ گئی تھی تو اس کا واہمہ درست نکلا۔ جسے شہرین ناممکن میں شمار کرتی تھی۔

تانیہ نے گہرے دکھ کے احساس سے لبریز ہو کر ان کی سمت دیکھا۔ ان کی آنکھوں کی وحشت، ان کے چہرے پر چھائی یاسیت، نقشہ کاری اور لب و لہجے کی تھکن اس بات کی شاہد تھی کہ مزاج کی یہ بے یونہی بے سبب نہیں تھی۔

”وہ کون تھی خاور بھائی؟“ تانیہ کے دل میں خاور مغل کے لیے بہت سی ہمدردی جمع ہو گئی تھی۔
”اک چراغ منزل۔“ انہوں نے تھکے تھکے انداز میں گاڑی ایک نسبتاً سنبھلے سڑک کے کنارے روک لی اور کھڑکی کے شیشوں سے باہر کے مناظر دیکھنے لگے۔

”یہی تو سارا رونا ہے بی بی۔“ ان کے انداز پر وہ خاک بھی نہ بچھی۔

”کیا اس نے کبھی آپ سے اپنی چاہت کا اظہار کیا۔“

وہ دھیرے سے ہنس دیے۔ ”آخر ہوتا ٹین ایجر، بچکانہ رویاؤں کا آئینہ ہی آپ کے ذہن میں، بھئی حقیقی زندگی میں ایسا کچھ نہیں ہوا کرتا۔ اچھا میں تمہاری تسلی کے لیے تمہیں اس کی کچھ تصویریں تاہوں۔ میں جب امریکہ میں ہوتا تھا تو اس دوران اس نے بھیجی تھیں۔ یہ مجھے اتنی عزیز ہیں کہ ہر دم نے ساتھ رکھتا ہوں۔“

انہوں نے پچھلی سیٹ پر بڑا اپنا بریف کیس تھا۔ لاک کھول کر اس کے ایک خفیہ خانے سے چند رات نکالے اور اس کی گود میں ڈال دیے۔ تانیہ نے احتیاط سے ایک کاغذ کی تہ کھولی۔ موتیوں کی سی لائی میں سفید براق ورق کے عین وسط میں درج تھا۔

عزیزم خاور!

یہ مانتا ہوں بہت رات ہے، اندھیرا ہے
تھکن بھی ایسی کہ جس کی کوئی مثال نہیں
مگر تم حوصلہ اور ہمتیں جواں رکھو
کہاں کہاں تیرا رب ذو الجلال نہیں

فقط ایک خیر اندیش

اس نے استعجاب کے عالم میں دوسرا ورق کھولا یہ کسی اور تاریخ کا تھا مگر اسٹائل وہی تھا۔ عزیزم خاور!

ہزار سانچے پردیس میں گزرتے ہیں
جو ہو سکے تو بھی ہم سے رابطہ رکھنا

فقط ایک خیر اندیش

اس نے تیسرا خط کھولا

عزیزم خاور!

شانیں رہیں تو پھول بھی پتے بھی آئیں گے
یہ دن اگر تم سے ہیں تو اچھے بھی آئیں گے

فقط ایک خیر اندیش

پھر اس نے آخری خط بھی کھولا

عزیزم خاور!

قیمت نہ لگا جذبہ ایثار طلب کی
ہر شے کو فقط چشم خریدار سے مت دیکھ
میں اور کہیں صاف دکھائی نہیں دوں گا
ہٹ کر مجھے آئینہ کردار سے مت دیکھ

فقط ایک خیر اندیش
”یہ اس کا آخری خط تھا جو جانے سے پہلے وہ میرے بیدروم میں ٹیبل پر چھوڑ گئی تھی اور پھر کبھی پلٹ کر واپس نہیں آئی۔“

”وہ کون بھی خاور بھائی! ایسی انوکھی، ایسی ہمدرد، اتنے اعلا ظرف والی۔“ تانیہ نے بغیر اس سے ملے ہی اس کی تحریر کی خوشبو سے اس کے مزاج کا پتلا لگایا تھا۔
”میں بھی آج تک درطہ حیرت میں ہوں کہ۔“

ستارہ شام بن کے آیا برنگ موج سحر گیا وہ

عجیب مانوس انجبی تھا نہیں تو حیران کر گیا وہ

”اس کی ذات کا مجید پوری داستان سن کر ہی پاسکوگی۔ اسی قصہ عجائب کو سنانے کے لیے تمہیں ساتھ لایا ہوں کہ تم نے بڑے غیر محسوس انداز میں مجھے پرت در پرت کھٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس ٹھٹھن نے تو میرے اعصاب تک کوسن کر کے رکھ دیا ہے، میں اپنی ذات کی قید میں محصور ہو کر رہ گیا ہوں۔ ان سب لوگوں کو مصنوعی خون لگا کر زخم دکھانے کی عادت ہے اور میں نے اپنے وجود کے اندر پڑنے اتنے بڑے گھاؤ کو بے اعتنائی اور رکھائی کے پیر میں چھپا رکھا ہے۔ اپنوں کے لگائے گئے زخموں کا مرہم بازار کی دکانوں پر دستیاب نہیں ہوتا۔ تمہیں پتا ہے تانیہ! یہ ٹھاٹھ باٹھ، یہ عیش و عشرت، یہ تعیش ان سے کچھ برس پہلے تک یہ سب لوگ لفظی نا آشنا تھے۔ انہوں نے خواب میں بھی ایسے آرام نہ دیکھے تھے۔ ہم بہت معمولی سی حیثیت کے مالک ہوا کرتے تھے۔ تم یقین کر دو گی ہمارے پورے گھر کا خرچہ میری کل تنخواہ پانچ ہزار دو سو روپے سے چلا کرتا تھا۔“

وہ انکشافات پر انکشافات کرتے چلے جا رہے تھے۔

”ایسے نہیں خاور بھائی ترتیب سے بتائے سارے واقعات۔“ اس نے سچ میں ٹوک دیا تھا۔

☆☆☆

”میرے بابا اور اماں جی کا تعلق سرحد کے ایک پسماندہ گاؤں سے تھا، دونوں کے قبیلے بھی مختلف تھے مگر شمع محبت ایک ساتھ دونوں کے دلوں میں جل اٹھی تھی۔ قبیلے کے سرداروں نے اس بندھن کو ناممکن قرار دیا تو دونوں بھاگ کر پنجاب آگئے اور شادی کر لی۔ پڑھائی لکھائی کا رواج تو ان کے قبیلوں میں نہیں تھا سو دوڑ دھوپ کر کے بابا ایک فیکٹری میں ملازم ہو گئے۔ تنگی ترشی سے ہی سہی زندگی کے دن بیت گئے۔ سب سے بڑی بلیقیں آپا کی شادی بابا نے اپنی زندگی میں ہی کر دی تھی۔ مجھے پڑھانے کا انہیں بہت شوق تھا۔

سو پیٹ کاٹ کر بھی انہوں نے اپنا اور میرا بھی تعلیم کا یہ شوق پورا کیا۔ مجھ سے چھوٹی نفیس کی بات بھی اپنے جیسے سفید پوش لوگوں میں طے ہو گئی۔ نفیس سے چھوٹا عمر بھی پڑھ رہا تھا۔ عمر اور بلیقیں آپا کی سب سے بڑی اولاد فیہ مال دونوں ہم عمر ہی تھے۔

میں نے ابھی ایم بی اے مکمل نہیں کیا تھا جب بابا جان کا انتقال ہو گیا۔ میں پہلے بھی ٹیوشنر کر کے اپنا خرچہ پورا کرتا تھا اب گھر کا بھی چلانے لگا۔ تقدیر کا چکر کہ کچھ عرصے بعد بلیقیں آپا اور ان کے خاندان کا

رچیں چار ہا ہے، چند دن رہے گی پھر ہاسٹل چلی جائے گی۔ کہیں اتوار کے اتوار آیا کرے گی۔ ہم نے کیا لینا دینا۔ اچھا اب چلو جاؤ اس کی فلائٹ کا ٹائم ہونے والا ہے۔“

”پہلے یہاں کم مصائب تھے جو یہ بھی۔۔۔“ میں بڑبڑاتا ہوا گھر کی واحد سواری سیکنڈ ہینڈ موٹر لی چابیاں تلاش کرنے لگا۔

”اسے بائیک پر لینے جاؤ گے؟“ اماں نے حیرت سے مجھے دیکھا تو میں بھٹنا سا گیا۔ اور کیا اعلیٰ کے لیے شاہی بھی کا اہتمام کروں۔“

”ارے کیوں ناراض ہو رہے ہو میں تو یہ کہہ رہی ہوں باہر چھا جوں مینہ برس رہا ہے ایسے میں پر کیسے جاؤ گے۔“

”اف اللہ! گویا جیسی کے کرائے میں بجٹ پھر خراب ہوگا۔“ میں نے دل ہی دل میں کبیدہ خاطر رٹھنڈی سانس لیتے ہوئے چابی رکھ دی۔

ایئر پورٹ پر جب میں نے اسے دیکھا تو ایک لمحے کو بالکل بت سا بن گیا، میرے تصور کے برعکس یہ سادہ اور عام سی شکل و صورت والی تھی، اس کے سراپے میں مجموعی طور پر کشش تھی مگر انداز میں ادبوں جیسی کوئی جھلک بھی نہ تھی۔

تین کمروں پر مشتمل اس چھوٹے سے، افراو سے کچھ کھج بھرے فلیٹ میں وہ اہل خانہ کے ہمراہ آرام سے پاؤں پیارے بیٹھی باتیں بنا رہی تھی۔ جیسے ازل سے ہی ان ہی کے بیچ رہتی آئی ہو۔

”اے یہ تو نہایت سیدھی اور اللہ لوک قسم کی بچی ہے۔“ تیسرے دن جب وہ سامان سمیٹ کر رٹھنڈی ہوئی تو اماں جی نے ذاتی رائے دے کر نئے موضوع کا آغاز کیا۔

”صحیح کہتی ہیں اماں اگر نہ ہم نے تو سوچا تھا اتنی بڑھی لکھی ہے امیر ماں باپ کی اکلوتی لاڈلی اولاد نخرنوں کے تو تو کرے ہمراہ لائے گی۔“ بلقیس آپا بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

”اتنی سادگی سے آلتی پالتی مار کر ہمارے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھا رہی تھیں جیسے ہمیشہ ایسے ہی ماتی رہی ہوں۔“ نفیس کو اس کی یہ ادا بہت بھائی تھی۔

”بہت کم دل والے ایسے ہوتے ہیں جنہیں خدا دولت سے نوازتا ہے تو بھی وہ اپنا ظرف بلند اور ماکشادہ رکھتے ہیں۔ دیکھو تو اندازے سے ہی کتنے تحائف لے آئی یہ کہہ کر جھولی میں ڈال دیے کہ آئی براہیاں اور کون ہے، آپ لوگ ہی تو ہیں میرے اپنے، ماشاء اللہ بڑے کھلے دل کی بنے اللہ اس کے سب اچھے کرے۔ ورنہ ہم نے تو بڑے بڑوں کو دولت کے زعم میں انسان کو حیوان سے بھی کم تر سمجھ کر جھکارتے دیکھا ہے۔“

”نہا باجی کہہ رہی تھیں دیکھ اینڈ پرائز آئیں گی تو ہمارے ساتھ گڑیا گڑیا کھیلیں گی۔“ راضیہ اور مائرا اپنی جگہ محبت کا اظہار کر رہی تھیں۔

سارا گھر ہی اس کے اخلاق کا، اس کے مزاج کی سادگی و دیگر کاری کا اور اس کی فیاضی طبع کا گرویدہ ہو چکا تھا مگر مجھے نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی تپ چڑھ جاتی تھی۔ آجانی ہیں محترمہ اپنی امارت کا جادو بٹکانے۔

ایک سیڈنٹ ہو گیا۔ ان کے شوہر تو موقع پر ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور بلقیس آپا ایک ٹانگ سے معذور ہو گئیں۔ اس وقت ان کی سب سے بڑی اولاد فریال میٹرک میں تھی اور سب سے چھوٹا بیٹا دانش ابھی فقط تین سال کا تھا۔ فریال سے چھوٹا اظہر آنکھوں میں تھا پھر راضیہ اور صائمہ اور ان سے چھوٹی تانیہ پورے کنبے کا بوجھ مجھ پر آن پڑا، ایم بی اے کر کے کچھ خواری کے بعد ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری تو مل گئی مگر گھر کا خرچہ چلانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا تھا۔ فلیٹ کرائے کا تھا پھر بجلی، پانی، سوئی گیس کا بل، عمر کی پڑھائی کا خرچہ، آپا کے سارے بچوں کی پڑھائی اور کھانے پینے کا انتظام، نفیس کی شادی کے لیے جہیز کا مسئلہ آپا کی بیماری کا خرچہ، ہر طرف سے مسائل کے انبار نے مجھے وقت سے پہلے بہت کچھ کھا پڑھا دیا۔ مزاج میں خود بخود دھڑکنے لگی اور کم گوئی رچ بس گئی۔ ان ہی دنوں نیا صدیقی کی آمد کا غلغلہ اٹھا جس نے مجھے مزید تپا دیا۔

پتا چلا موصوفہ بابا جان مرحوم کی ٹیکسری کے مالک کی بیٹی تھیں۔ کچھ عرصہ پہلے صدیقی صاحب کاروبار سمیٹ کر فیملی سمیت ابوظہبی چلے گئے تھے وہیں طویل عرصے تک رہائش رہی تھی پاکستان آنا ہوا تو بابا جان سے ضرور ملتے۔ بابا جان ان کے بڑے وفا دار اور جاں نثار قسم کے ملازم تھے۔ ان کی بیٹی کو لاہور سے ایم اے کرنا تھا۔ یہاں رہائش ہو مل میں قرار پائی تھی چونکہ ان کا پاکستان میں اور کوئی خاص جان پہچان اور بھروسے والا بندہ نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے خط لکھ کر ہمیں نامزد کیا تھا۔

میں خبر سن کر جی بھر کے غصے ہوا تھا۔ البتہ ماں اور آپا کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔

”کہاں ہمارا یہ تین کمروں کا تنگ و تاریک فلیٹ، کہاں ان کی نازوں پٹی بیٹی۔ کہاں رکھیں گے اسے۔ اماں خواجواہ کی مصیبت کیوں مول لیں، آپ کو نہیں خبر یہ امیر کبیر شہزادیاں تو ایسی جگہوں پر جس کا شکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔ آپ لکھو نتیجہ معذرت انہیں۔“

”لو بھلا ایسے ہی لکھ دوں۔“ اماں بگڑیں۔

”مہمان تو خدا کی رحمت ہوا کرتے ہیں، بڑے احسانات ہیں سیٹھ صاحب کے تمہارے بابا پر، بڑا بھروسہ کرتے تھے وہ، کبھی اپنے رتبے کا احساس نہیں دلا یا ہمیشہ نری اور محبت سے پیش آئے۔“

”ہم ان کے احسانات کا بدلہ چکانے کے اہل نہیں ہیں، آپ مطلع کر دیجیے انہیں۔“ میں چڑسا گیا تھا۔

مگر ادھر کس کو پروا تھی۔ سارے گھر میں خوش گواری بالکل ہوئی تھی۔ آپا، فریال اور نفیس کے سر تھیں جن کے ذمے پورے گھر کی صفائی اور از سر نو آرائش تھی۔ سامان ادھر سے ادھر کرنے میں عمر اور اظہر لوگ پیش پیش تھے۔ اس کی آمد کے دن اماں جی نے خصوصی طور پر اپنے ہاتھ سے مزے مزے کی ڈشز بنائیں۔

”اللہ کا واسطہ ہے اماں! یہ ڈھکوسلے رہنے دیں۔ ہم جب اس سے اپنی حیثیت نہیں چھپا سکتے تو خواجواہ مصنوعی تکلف کی فضا قائم کر کے مقابلہ کرنے سے کیا حاصل۔“

اماں میرے کڑوے کسلے لہجے پر شدت سے برا مان گئیں۔

”لڑکے مجھے تو تیری کوئی کل سیدھی ہی نہیں لگتی، نا وہ کون سا تیرے کندھے پر سوار ہونے کو آ رہی

جب دیکھو کبھی راضیہ اور صائمہ کے فراک آرہے ہیں، عمر اور اطہر کے لیے بیٹ بال یا شرٹس لائی جارہی ہیں۔ فریال کے لیے بوتیک سے کوئی سوٹ پسند کر کے لایا جا رہا ہے اماں اور بلقیس باجی اور نسیم کے لیے کوئی ضرورت کی چیز خریدی جا رہی ہے۔ دینے کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ اگلے کو ضروری تحفہ لینے ہی بن پڑتی۔

”آئی اکل میں گئی تھی نادھر تو یہ شرٹ کا پیس پسند آ گیا۔ خیال آیا ماشاء اللہ عمر کا رنگ بہت کھتا ہوا ہے اس پر بہت سوٹ کرے گا بہت سارے لوگ لے رہے تھے ٹھیک ٹھاک سسٹائل گیا میں نے کہا چلو کیا حرج ہے بھلا اتنا اچھا کپڑا دوبارہ جانے کب ملے میں نے لے لیا کہ آپ کو دکھا دوں گی۔“

بلقیس آیا، اماں جی رسماً کہتیں۔
”ارے نہیں چندا تم کیوں تکلیف کرتی ہو یہ بہت زیادہ ہے۔“
”تکلف کہاں آئی! سمجھئے یہ تو یونی فرمیں کے طور پر لائی ہوں، آپ میرے ساتھ چلیے گا کسی دن، بے شک اپنی پسند سے اور لے لیجیے گا۔ اسے تو رکھے نا اور ہاں آج چکا کیا ہے، بھی نفیس ذرا اپنے ان نفیس و ملائم ہاتھوں سے کھانا تو لگا دو، قسم سے بڑی بھوک لگ رہی ہے اور یہ چھوٹی مخلوق کدھر ہے میں دیکھتی ہوں ان کو۔“ جب بھی آئی گھٹیا دھڑا دھڑا آزادانہ گھومتی پھرتی مزے سے انجوائے کرتی۔ ایک لمحے کو بھی کبھی کسی کو احساس نہیں دلاتی تھی کہ وہ خصوصی مہمان نوازی کی سخت ہے۔

بھی لاڈ سے اماں کی گود میں سر رکھ دیتی۔
”آئی اڈر اپنے اصلی والے مسروں کے تیل سے ماش تو کر دیجیے۔“

ان دنوں میں بہت پریشان سا تھا۔ عمر کو فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن دلانا تھا۔ داخلہ فیس اور کتابوں کا بیوں، یونی فارم وغیرہ کے لیے کم از کم ڈیڑھ دو ہزار کی رقم درکار تھی۔ تنخواہ ملنے میں ابھی ایک آدھ ہفتہ باقی تھا اور اتفاق سے اس کے داخلے کی آخری تاریخ قریب تھی۔ تنخواہ سے تو یک مشت اتنی بڑی رقم کی بچت ناممکن ہی تھی۔

چھوٹے دانش کی طبیعت خراب تھی، اس کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت تھی۔ اسی پریشانی میں داخلے کی تاریخ ذہن سے نکل گئی، تنخواہ ملنے پر سب سے پہلے عمر کو ڈھونڈا۔

”عمر! وہ تمہارے داخلے کا کیا بنا، یار لیٹ ہی ہو گئے تم اب۔۔۔“
”ارے نہیں بھائی! داخلہ تو ہو گیا۔“ میں عمر کے رنجیدہ طول چہرے کی جگہ ہشاش بشاش انداز دیکھ کر شذر رہی تو رہ گیا۔

”مگر کیسے؟ پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟“ میں چونکا تھا۔
”کہیں اماں اور آپا لوگ بات کر رہے تھے، نیا باجی نے سن لیا۔ پھر میرے پاس آکر خفا ہوئیں کہ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا اپنے داخلے کا۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں وہ مجھے لے گئیں اور انہوں نے ہی داخلے وغیرہ کا انتظام بھی کر دیا۔“

میرے اندر کا غیر متند متعل بچہ ایک لمحے کو جولا کبھی کا روپ دھار گیا۔
”تم نے کیوں لیا ان کا احسان، تمہارا بھائی مر گیا تھا جو یوں ایرے غیرے کے آگے دکھارو؟“

میں نے شعلہ برساتی نگاہوں سے اسے گھورا۔ جواب میں وہ مسکسی صورت بنا کر منظر سے ہٹ

یک اینڈ پر وہ آئی تو میں نے ڈیڑھ ہزار روپیہ اس کے پاس قالین پر رکھ دیا، وہ نیچے ہی بیٹھی صائمہ کو سبق یاد کروا رہی تھی۔

”کیا ہے؟“ اس نے حیران نظریں میری سمت دوڑائیں۔
”یہ آپ کا احسان ہے محترمہ جو آپ نے عمر پر کیا تھا۔“ میں نے ترشی سے جواب دیا۔

”یک لمحے کو اس کے چہرے پر ناگواری کے عکس لہرائے پھر بڑی صفائی سے اپنے تاثرات چھپاتے س نے قدموں میں، پڑی قم اٹھائی اور ٹیبل پر میرے نزدیک کھسکا کر بولی۔

”یہ احسان نہیں قرض تھا۔ جس کی وصولی عمر سے فرار پائی ہے وہی یہ رقم واپس کرنے کا پابند ہے۔ کے ساتھ تو میرا ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔“ وہ کہہ کر کچن میں گھس گئی تھی غالباً۔

پھر فریال کے رزلٹ پر اس نے ایک ہزار نقد اور ساتھ میں نصاب کی کتابوں کا سیٹ اپنی طرف

ٹ بنا کر اس طرح دیا کہ اسے واپس کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ وہ احسان بھی اس انداز میں کیا تھی جیسے اس کا فرض اور ہمارا حق سمجھ کر کر رہی ہو۔ لینے والے کی انا کا ہرٹ ہونا تو درکنار لانا اسے اس دلاتی تھی کہ تم یہ چیز لے کر مجھ پر بڑا احسان کر رہے ہو۔ میں اس کی ان حرکتوں پر دل ہی دل

ہت نالاں رہتا تھا۔
”ہمیں نہیں چاہیں آپ کی عنایتیں، نوازشیں، براہ کرم انہیں اپنے پاس ہی رکھیں۔“ میں تنقناں تانا ہوا

کے سر پر کھڑا کہہ رہا تھا۔
”کیوں کیا ہوا؟“ میں نے جتنے جلال سے باز پرس کا آغاز کیا تھا اس نے اتنے ہی سکون سے

نت کیا تھا۔
میرا دل جل کر خاک ہو گیا۔ آپا کے بیٹے کی طبیعت سنبھل ہی نہیں رہی تھی۔ میرا ارادہ تھا آج شام

نکال کر اسے لے چلوں گا۔ بڑی مشکل سے ایک ماہر ڈاکٹر سے ٹائم بھی لے لیا تھا۔ آنے پر پتا چلا

مادر بلقیس آپا کو نیا اپنی گاڑی پر لے گئی تھی۔
واپسی میں وہ دوایتوں اور پھل فروٹ سے لدی پھدی گھر لوٹی تو میں کھولتے دل و دماغ کے

نواس پر الٹ پڑا۔
”اے باؤ لے ہوئے ہو خاور۔“ اماں سچ میں پڑ گئیں۔ ”ایک تو بچی نے نیکی کی اور سے اسے یہ

لے دیا جا رہا ہے، بچہ درد سے تڑپ رہا تھا۔ خدا نا خواستہ وقت پر ڈاکٹر کو نہ دکھایا بنا تو لینے کے دینے

باتے۔ وہ تو بچی اتفاقاً دھڑا نکلی ورنہ کیا کرتے کیسے لے کر جاتے۔“
”ایسی کیا بات ہے آئی! آپ لوگ جو میرا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ دیکھیے نا گھر والوں سے اتنی دور

ہاں ہوں پھر بھی محسوس یہی ہوتا ہے اپنے ہی گھر میں اپنوں کے سچ ہوں۔ اب بھلا اپنوں میں تکلف

بنتا ہے اور میرا اولین فرض، آپ تو ایسی باتیں کر کے الٹا مجھے شرمندہ کر ڈالتے ہیں۔“ نہایت معصوم سے اماں جی سے لپٹ کر وہ اپنی چاہت کا اظہار کر رہی تھی۔

میں حسب سابق بل کھا کر رہ گیا۔ کہہ کچھ بھی نہ سکا کہ آگے رہ گیا تھا کہنے کو، وہ پونہ محسوس انداز میں گھر کا خیال رکھتی تھی۔ بھی مجھے خبر ہی نہ ہوتی کس طرح گھر میں چینی، لکھی یا آٹا آج کسی بچے کی اسکول کی فیس دے دی جاتی، مختلف تہواروں کی مناسبت سے تحفے کے بہانے بچوں کی اوڑھنے کی ضروریات پوری ہو جاتیں اور اس قدر پلاننگ کے ساتھ وہ اس مدد کو اپنے فرائض میں شامل کر کے شرمندہ شرمندہ ہی ہو کر پیش کرتی گویا گلے کے حق میں کچھ کم ہی دیا ہو۔

مجھے اس کے انداز سر اسر چھوڑے اور نامناسب سے لگتے تھے شاید اس لیے کہ یہ میری غیرت خوداری پر تازیانہ بن کر لگتے تھے۔ میں دانستہ طور پر اس کی موجودگی میں سب میں بیٹھنے میں کتراتا ہم دونوں میں محسوس کیا جانے والا کھنچاؤ موجود تھا جو اماں جی کی ہزار تنبیہ کے باوجود دور نہیں ہو سکا تھا۔ میں اس سے کم سے کم مخاطب ہونے یا مخاطب رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

☆☆☆

”خاور! کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم دونوں کے بیچ جائیداد وغیرہ کا کوئی تنازعہ ہو۔“ نفیس کے سسرالی رشتہ دار آئے ہوئے تھے اسی سلسلے میں اماں نے اسے بھی بلوا بھیجا تھا، میں بڑے سے مرد حضرات کے لیے چائے کے لوازمات لینے کو اندر آیا تو وہ برتنوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے دریافت کرنے لگی۔ انداز میں حد درجہ سادگی تھی۔

میں نے اپنے اندر ابل پڑنے والے غیض پر بمشکل قابو پایا تھا۔ ”یہ آپ کا کوئی مربع میں نے اپنے نام کرا لیا ہو۔“ ادھر ہنوز معصومانہ استفسار تھا۔ ”خواجوا میرے منہ مت لگو۔“ میں جھلا کر کڑے اٹھانے لگا۔ ”نہیں پھر بھی خاور! سوچنے کی بات ہے، ہے نا۔“ وہ اپنی بات پر بضد تھی۔

”اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اتنے خونخوار حریفانہ انداز میں پیش کیا آتے؟ ضرور ہم دونوں میں ماضی میں کوئی اعلیٰ درجے کی دشمنی رہی ہے۔“ وہ جیسے کسی نیچے پر پہنچ گئی تھی۔ تب ہی اتنے دھوکے سے کہہ رہی تھی۔ ”فضول بات نہیں کرو اور پلیز ذرا جلدی بنناؤ اپنا کام، اتنی ست رفتاری سے تو چیونٹی بھی نہم کرتی ہوگی۔“ میں خواجوا چڑسا گیا تھا۔

”اچھا تو پھر جاؤ چیونٹی سے کرا لو۔“ نہایت اطمینان سے اس نے اتنی بے ساختگی کے عالم میں جواب دیا تھا کہ اندر آئی نفیس کسی صورت اپنی کسی ضبط نہ کر سکی تھی۔ میں کھسا کر بچن سے باہر آ گیا۔ اس دن کے بعد سے یہ ہوا کہ ہماری آپس کی چپقلش اور کشیدگی میں قدرے کمی واقع ہوا گئی۔ بالواسطہ کے بجائے دو بددیراہ راستہ محاذ آرائی ہونے لگی۔ شاید پہلی کارروائی چپ کا حصار توڑ ہی ہوا کرتی ہے۔ پہلے اپنے طنز و مسخر اور خفگی کا اظہار اماں، آپا یا دوسرے بچوں کے توسط سے اس تک پہنچاتا تھا اب یہ کام بغیر کسی واسطے کے انجام پا جاتا تھا۔

وں میں باہر جانے کے چکروں میں تھا ایک دوست سے بات کرنا تھی۔ اماں کو کہہ گیا تھا ۷ لوٹوں گا۔ رات گئے گھر آیا تو خلاف توقع نیا کور دوازے پر موجود دیکھ کر ٹھنک گیا۔ پھر چپ گیا۔ چیخ کرنے کے بعد ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ یہیں ایک گونے پر میرا پلنگ بچھا تھا۔ ایک اور کپڑوں کی لماری بھی سائیٹ پر سیٹ تھی۔ ڈرائنگ روم والا کمر باقیوں کے مقابلے میں ما۔ رات کو یہ میرے استہمال میں ہی ہوتا تھا۔ دوسرے کمرے میں اماں، آپا، نفیس اور بانی اس سوتی تھیں، جب کہ تیسرے چھوٹے سے اسٹور روم میں عمر اور اطہر کے پلنگ بچھے

ج کر کے آیا تو وہ سینئر ٹیبل پر پانی کا جگ اور گلاس رکھ رہی تھی۔ کیا پکا ہے آج؟“ مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی اس وقت۔ ٹنڈے آلو۔“ سن کر ہی میرے چہرے پر کوفت زدہ اثرات نمودار ہو گئے۔ بڑی مجھے زہرتی تھی۔

تمہیں شاید پسند نہیں۔“ وہ مسکرا دی میرے تاثرات سے سمجھ گئی تھی۔ ساری بھوک ہی اڑا دی اس کے نام نے۔“ میں نے برا سامنہ بنایا۔

’اچھا ٹھہرو، تمہارے لیے کچھ دوسوچتی ہوں۔“ پردہ منٹ بعد وہ ٹرے لگا کر لائی تو گرم گرم روٹی کے ہمراہ فنگر چپس، ٹماٹو کچپ، ایک کنوری میں پیاز کا راستہ اور پودینے کی چٹنی دیکھ کر میری روح تک خوش ہو گئی۔ بے تکلفی سے ڈٹ کر کھانے

کھانے کے بعد وہ چائے کے دو کپ لے آئی اور وہیں بوسیدہ سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ چند لمحوں ہمارے درمیان سناٹا بولتا رہا۔ ”خاور تم ان دنوں بڑے اچھے اچھے سے لگ رہے ہو۔ کن چکروں میں ہو۔“ ”چکر کیا ہونے ہیں، غم روزگار کے دھکے ہیں اور کیا۔۔۔“ مجھ پر ٹھکن اور اعصابی وباؤ کے ساتھ بے زاری بھی حملہ آور ہو چکی تھی۔

”دیے سچ بات تو یہ ہے کہ موجودہ دور میں جتنے بھی کمائیں جہاں سے بھی کمائیں کم ہے، پھر ما شاء اللہ افراد زیادہ ہوں وہاں ضرورتیں بھی خود بخود چادر چھوڑ کر پاؤں پھیلانے لگتی ہیں۔ بہت لمبے گزرا ان دنوں۔“

مجھے خاصا تعجب ہوا۔ بھلا نازوں ملی لاکھوں میں کھیتی امیر زادی کو ان جھیلوں کی کیا خبر، وہ یوں ناکر ہی تھی جیسے یہ سب کچھ اس کے ہاں بھی ہوتا رہا ہو۔

”اب دیکھو نا، تمہیں کتنی محنت کرنا پڑتی ہے سارا سارا دن باہر کھپتے ہو، ٹیوشنز بھی کرتے ہو پھر بھی نہیں پڑتا۔ آخر تم بھی انسان ہو، کوئی ٹینٹ تو نہیں ہو۔ کہاں سے بندہ پورا کرے ذمہ داریاں بھی تو ہیں۔ میں تو کہتی ہوں، بڑی ہمت ہے تمہاری، بڑے مضبوط اعصاب کے مالک ہو جو اتنی تندہی اتنی جاں فشانی سے اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنا آرام و سکون بچ کے

ہوئے ہو۔“

میں اس کی ہمدردانہ باتوں پر دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔ اتنی فراخ دلی سے تو کسی نے میرے ایثار، میری قربانی اور میری فرض شناسی کا اقرار نہیں کیا تھا۔ اس کا انداز اتنا اپنائیت آمیز تھا کہ اس طرح ہماری سطح پر آکر اسی حساب سے بات کر رہی تھی کہ میں بھی اپنی غیر فطری انا، غیرت اور نام پرودہ پوشی کو پس پشت ڈال کر اس کے ساتھ اپنے خیالات شیئر کرنے لگا۔

”اس قدر مہنگائی کے دور میں اتنے سارے افراد کے ہمراہ چند ہزار سے کیا بنتا ہے۔ میں ہوں آگے کیا بنے گا۔ ابھی عمر بہت چھوٹا ہے، فرسٹ ایئر میں ہی تو ہے، ادھر نفیس کے سرسرا دل جلدی جلدی کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ بلقیس آپا کی فریال بھی کل کو نفیس کے برابر آرہے گی۔ دوسرے بچوں کی تعلیم اور خوراک کے مسائل، بلقیس آپا کی دوا کا انتظام، گھر کے خرچے، بلوں کی ادائیگی یہ سب کچھ پورا ہوگا۔ خرچ ہیں کہ دن بدن کسی دیوبیکل جن کی طرح بڑھتے ہی چلے آ رہے ہیں سوچوں تو اگر آج نفیس کے سرسرا دل لے جلدی مچا دیں تو اس وقت میرے پاس اس کو جہیز کے ہاتھ دینے کے لیے شاید ایک جوڑے کے پیسے بھی نہ ہوں۔“

حالات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نہایت کبیدہ خاطر اور دل گرفتہ ساتالین پر صوفے سے ہٹ نکائے بیٹھا تھا۔ سوچیں آکٹوپس کی طرح ذہن کو جکڑے ہوئے تھیں۔

”ہاں تم صحیح کہہ رہے ہو، ضرور ایسا ہی ہوگا تنخواہ کی رقم سے بچت کا سوال تو چیل کے گھونسلے مانس ڈھونڈنے والی بات کے مترادف ہوگا۔“

اس نے بڑے سبھاؤ سے میری بات کی تائید کی تھی۔۔۔ پھر ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر کچھ سوچنے لگی۔ ”خاور۔۔۔“ کافی دیر بعد اس نے پکارا اس کے لہجے اور نظروں میں کوئی خیال خیر تھا۔ میں سگریٹ کا کش لیتے ہوئے نیم دلی سے محض اس کی سمت دیکھنے پر اکتفا کیا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کسی طرح ماہر چلے جاؤ جیسے لندن، امریکہ وغیرہ۔“ میں کافی دیر تک اس کی سمت دیکھتے رہنے کے بعد بالآخر سکرایا۔

”تمہارے ذہن میں آنے والا یہ آئیڈیا کچھ عرصہ پہلے ہی میرے دماغ میں آچکا ہے، میں اسی سوچ میں ہوں بلکہ ان دنوں ان ہی کوششوں میں لگا ہوا ہوں، اگر دو چار سال بھی باہر لگاؤں تو وہ سے چھوٹے بڑے مسائل نبٹ جائیں گے۔“

”آئی سے بات ہوئی اس سلسلے میں؟“ ”نہیں، براہ راست تو نہیں البتہ ایک بار یونیورسٹی کے بے انداز میں تذکرہ کیا تھا مگر ماں خائف ہیں۔ وہ باہر بھجوانے کے لیے راضی نہیں ہیں۔“ ”ظاہر بات ہے ماں کا دل ہے نا اولاد کو اتنی دور آنکھوں سے پرے کرنے کا حوصلہ کیسے کر گی۔“

اس کے لہجے میں ماں کے لیے بڑی محبت اور لگاؤ تھا۔

”اماں کو بھنک بھی پڑ گئی تو وہ واویلا مچا دیں گی اور میں انہیں دیکھی کر کے باہر جانے کا سوچ

سلسلے میں تم فکر نہیں کرو، میں آئی کو سمجھا دوں گی کہ اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے والدین کو

ی پڑتی ہے۔“

”اقبال کر سکو گی انہیں؟“ میں بے یقین سا تھا۔

”تم دیکھتے جاؤ۔“ اس نے چٹکی بجاتی۔

پھر واقعی اس نے اپنی سلسل کو کشوں سے بالآخر اماں کو رام کر ہی لیا ورنہ شاید وہ کبھی بھی مجھے رانہ ہونے دیتیں۔ بابا جان کی ناگہانی وفات اور بلقیس آپا کے شوہر کے حادثے نے انہیں بنادیا تھا۔ میرے لیے وہ بہت حساس ہو گئی تھیں۔ کسی دن اتفاقاً دیر سویر ہو جاتی تو ان کا بلڈ

نے لگتا تھا۔

مانے جانے کہاں کہاں سے تاویلیں گھڑی تھیں۔ دلائل پیش کئے تھے۔ سنہری خوابوں کی

مانی تھی کہ اماں خود ہی مجھے باہر کے لیے اپلائی کرنے کی ترغیب دینے لگیں۔ وہ اس کی مانگی بھی تو

۱۔ یا شاید اس میں کچھ ایسی بات تھی کہ دوسرے سے انکار ہو ہی نہیں پاتا تھا۔

سیورٹ اور ویزے کا کام تو کسی نہ کسی طرح اپنی فرم سے کچھ ایڈوائس نکلا کر کہہ سن کر ہو گیا مگر

برکوانے کے لیے وہاں جا کر رہائش اور کھانے پینے کے انتظام کے لیے کم از کم پچاس ساٹھ ہزار

رہنم کار کا بھی، میری راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں اسی فکر میں، ویزے کی مدت بھی خاصی مختصر

رہ مقررہ مدت گزر جاتی تو پھر ساری محنت اکارت چلی جاتی۔ اماں نے نفیس کے لیے رکھا ہوا زیور

برکوانے کے لیے دینا چاہا مگر میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا۔

”اور بن جائیں گے خاور بھائی۔“ نفیس نے بھی اصرار کیا مگر میری ہمت نہیں پڑی۔ حالات کا ہوتا ہے کیا خبر وہاں جا کر کیسے حالات ہوں۔ خود اپنی جان کے لالے پڑ جائیں تو ایسے میں کیا یہ احساس بھی ہمراہ لیے پھروں گا کہ بہن کے حق میں ڈاکہ ڈالا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جاؤں تو

جاؤں۔ میرے مزاج کے سر دو سپاٹ موسموں کے باعث میرا حلقہ احباب نہ ہونے کے برابر تھا۔

ایسا جان پہچان کا بندہ نہیں تھا جس سے قرض لیتا۔

”خاور۔۔۔! نام نہت ہو گیا ہے، یہ نیا کوڈرا چھوڑ آؤ ہاسٹل تک کہیں بند ہی نہ ہو جائے۔“

اماں کو موسمی بخار نے آگھیرا تھا۔ سو وہ بھی اطلاع ملنے پر یونیورسٹی سے کلاسز لے کر شام کو ادھر ہی

آئی تھی عیادت کے لیے۔

”تم پہلے ہی تھکے ہوئے آئے ہو، بہت تکلیف کرنا پڑ رہی ہے تمہیں۔“ بائیک پر سنبھل کر ذرا

ٹلے بیٹھے ہوئے اس نے اپنے مخصوص ہمدردانہ انداز میں کہا تھا۔

”نہیں کوئی بات نہیں۔“ میں نے مردوتا کہا۔

”کچھ ہوا بندوبست؟ پھر ویزا ختم ہونے کی ڈیڈ لائن تو نزدیک آگئی ہے۔“ اس کی پُر تشویش آواز پر

مانے گہری سانس لی۔

”دوڑ دھوپ تو کی ہے اچھی خاصی مگر کیا کیا جائے پیسے کی ہوس میں سب پاگل ہو رہے ہیں۔ جس

کے پاس نہیں ہے، وہ تو دوڑ رہی رہا ہے جس کے پاس ہے وہ ”بل من مزید“ کا درد کرتا ہوا ”مخرد“ بھی آگے دوڑ رہا ہے۔ آفس میں کچھ لوگوں سے سلام دعا ہے، کچھ بابا کے جاننے والے ہیں بل ملا کر بیس بائیس ہزار ہاتھ لگ جاتے مگر اس سے بھی کیا بنے گا۔ یہ تو نصف بھی نہیں ہے مطلوب رقم کے۔ میرے اعصاب پر بہت زیادہ بوجھ پڑا ہوا تھا۔

”ہوں۔۔۔ یہ تو ہے۔“ وہ سوچ میں گم تھی۔
”حالات کو سامنے رکھتے ہوئے تو لگتا ہے شاید جانے کا پروگرام چوٹ ہی ہو جائے۔“
”ارے نہیں بھئی۔“ میرے شکستہ مضحل لہجے پر وہ دھک سے رہ گئی۔

”اتنی تک دود سے تو امریکہ کا دیزالگا ہے ورنہ تو لوگوں کی عمریں گزر جاتی ہیں ابھی کے چکر کر، خوش قسمتی سے تمہاری جوتی جلدی تمہارا کام ہو گیا ہمت کیوں ہار رہے ہو خادری۔“

”تو پھر کیا کروں۔“ میں نے نیند کے لیے ترستی ہوئی آنکھوں کو مسلتے ہوئے عی سے دریافت کیا۔
”ہمت و حوصلہ خادری! کوئی تدبیر سوچو ایسے تو نہیں کرتے نا۔“ وہ میری ٹوٹی بھری پڑمردہ حارہ سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے دائیں شانے پر رکھ دیا اور سلی کے سے انداز میں دبا۔
میرا حوصلہ بڑھانے لگی۔ انداز بالکل ایسے ہی تھا جیسے کوئی ماں کسی بگڑے روٹھے بچے کو پیار سے سمجھا کر منار رہی ہو۔

”حوصلے اور ہمت کی باتیں وہاں کی جاتی ہیں جہاں امید کی کوئی کرن جھلملا رہی ہوتی ہے۔“
جھنجھلاہٹ اور دل گرفتگی کے احساس سے بخور تھا۔ ”جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہو وہاں حوصلے کی لٹکی کام آئے گی۔“

”مشکلات، مصائب اور پریشانیاں بھی تو انسانوں پر ہی پڑتی ہیں یہ تو آتی جاتی رہتی ہیں، زندگی حصہ ہوا کرتی ہیں۔ ان سے گھبراتے نہیں ہیں بلکہ مقابلہ کرتے ہیں۔ اللہ مسبب الاسباب ہے، اگر انے ایک راستہ کھول دیا ہے تو دوسرا بھی ضرور کھولے گا۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے تاکہ ہم دستک دینا چھوڑ دیں۔ دوسرے معنوں میں اس کی ذات سے مایوس ہو جائیں۔“

وہ سلی کے سے انداز میں دھیرے دھیرے میرا کندھا چھلتی رسائیت سے بول رہی تھی۔ الفاظ دل پر مرمز رکھ رہے تھے یا نہیں اس سے قطع نظر اس کے ہاتھ کا لطیف اپنائیت آمیز لمس البتہ دیکھنے، سنے، اعصاب پر چھیننے ڈالنے کا کام ضرور سرانجام دے رہا تھا۔

”ابھی تو تمہیں بہت طویل سفر طے کرنا ہے۔ ابھی سے تھکنے لگے ہو؟ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے تم پر جتنی ذمہ داریاں ہیں اس لحاظ سے تمہیں خود کو بہت مضبوط اور بہادر بنانا ہوگا۔ تم اتنی کم عمری سے اپنی ذات کی ضروریات کو پس پشت ڈال کر اپنے چھوٹے بہن بھائی کے لیے پھر اپنی قیمتی بھانجیوں اور بھانجیوں کی پرورش کے لیے خود کو وقف کیے ہوئے ہو یقین جانو خادری! یہ تمہاری ذات کا بڑا دلکش پہلو ہے۔ قربانیاں دینے کا عمل انسان کی شخصیت میں بڑا نکھار بڑا وقار لے آتا ہے۔ تمہارا دل جو اتنا خوب صورت ہے اس کا کوئی نعم البدل ہی نہیں ہے۔ ان شاء اللہ ایک وقت ایسا آئے گا جب تم اپنے فرائض سے احسن طریقے سے عہدہ برآ ہو جاؤ گے پھر تمہارے پاس بہت سارا وقت ہوگا صرف تمہارے لیے۔“

کی لوریاں دیتی ہوئی دھیمی خوب صورت نرم آواز میرے اندر سکون کے جشے جاری کر رہی تھی۔ اسپیڈ ملکی کرتے کرتے بالآخر قدرے ویران سی شاہراہ پر درخت کے قریب روک دی۔
میں بہت تھکنے لگا ہوں نیا یوں لگتا ہے صدیوں تک یونہی تنہا آبلے پانی کرتا رہوں گا اور منزل پھر ملے گی۔“ اتنے دنوں کی ذہنی توڑ پھوڑ اور سوچوں کے خلفشار نے میری قوت حیات گویا ختم ہی کیا۔ بڑے دل شکستہ سے انداز میں سر جھکا دیا۔

نہیں خادری! تمہیں ہرگز بھی نہیں تھکنا نہیں چاہیے اور تم اکیلے بھی کب ہو، اگر دیکھو سمجھو تو کتنے آشنا مارے ارد گرد نظر آئیں گے۔ اکیلا تو وہ حصہ ہوتا ہے جس کو بھری دنیا میں کوئی سننے سمجھنے والا نہیں ہے کی سلامتی کے لیے کوئی ہاتھ خدا کے حضور نہیں اٹھاتا۔ جس کی پکار پر کوئی لپک کر نہیں آتا۔ تم تو قسمت ہو۔ دیکھو تو تمہارے ارد گرد کتنے لوگ ہیں۔ تم سے محبت کرنے والے، تمہارے لیے فکر کرنے والے، دعاؤں کی سوغات دینے والے، تمہارے دکھ درد کی دوا کرنے والے، ہم سب ہیں نا۔ ساتھ خادری! تم اکیلے نہیں ہو، کوئی بھی تنہا نہیں سمجھنا۔ ہم جو ہیں تمہارے اپنے۔“
وہ دھیرے دھیرے مجھے جوڑتی بناتی رہی۔ میرے حوصلوں کی عمارت بلند کرتی رہی، تار کیوں دھیرے دھیرے چاندنی کی جھلک دکھلائی رہی۔
ششدر تو میں اس دن رہ گیا جب اس نے میں ہزار کی خطیر رقم میری جھولی میں ڈال دی۔

”کیا۔۔۔؟“ میں ہلکا سا دیکھتا رہ گیا تھا۔
”تمہیں پتا تو ہے، یو اے ای کی سائیڈ پر سونا بہت سستا ہوتا ہے بلکہ والدین بچے کی کسی خوشی پر کے طور پر سونے کی چھوٹی موٹی چیز دے دیتے ہیں، عزیز رشتہ دار بھی بڑی فراخ دلی سے گفت کے سونے کی ملکی پھلکی چیز تحفہ دینے میں گریز نہیں کرتے۔ میرے پاس بھی بہت سے ایسے تحائف ہیں۔ ظاہر ہے سب کے سب تو نہیں پہنچ جاتے نا میں نے اپنی ہتھ ڈے کی گولڈ کی چین، بی اے زلٹ پر مایا کی طرف سے دی گئی انگوٹھی اور بریلٹ اور ایک کسی عزیز کا دیا ہوا لاکٹ بچ دیا۔ بھئی تو فائدہ ہو جب پہننے نہیں تو بے کار میں پاس جمع رکھنے سے کیا حاصل، اتنے بہت سے جو پڑے تے ہیں۔“ وہ اس قدر عام سے سرسری سے انداز میں صفائی دے رہی تھی گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ میں سمجھ گیا تھا وہ حسب سابق مقابل کو شرمندگی سے بچانے کے لیے اپنے لہجہ اور انداز کی ازلی بددلی کو بروئے کار لا رہی تھی۔

کچھ لوگ لے کر بھی شرمندہ نہیں ہوتے اور کچھ سر پھرے دیتے ہوئے بھی شرمندہ ہو جاتے ہیں۔
پنے اپنے طرف کی بات ہوئی ہے۔
میں نے کشمکش کے عالم میں کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

”پلیز خادری۔۔۔؟“ وہ بغد منت بولی۔ ”کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالنا جس پر مجھے اپنے کیے پر ندامت ہونے لگے۔ یقین کر دے کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ تو محض خراج ہے تمہارے اس جذبے پر جس کے تحت تم اپنی ذات کے تقاضے فراموش کر کے اتنے سارے لوگوں کی خوشیوں اور خوش حال زندگیوں کے

لیے جدوجہد کر رہے ہو۔ اگر تمہارے مستقبل کے ساتھ اتنے سارے لوگوں کا مستقبل مشروط نہ ہو شاید میں تمہارا ساتھ نہ دیتی کہ اس صورت میں تمہارا یہ اقدام تمہاری ذاتی آسائش کے لیے ہوتا تھا۔ پر بہت سی ذمہ داریاں ہیں تمہیں اپنے بہن بھائیوں کا مستقبل سنوارنا ہے۔ معذور بیوہ بہن کے بچوں پرورش کرنا ہے۔ قربانی اور ایثار کے اس سمندر میں میرا حصہ تو اک قطرے کی مانند ہے۔ اصل مرہ تمہیں ہی ملے کرنا ہے نا۔“

”نیا۔۔۔“ ایک عجیب سے جذبے سے مسحور ہو کر میں اٹھا اور اس کے مقابل آ کر اس کے دہانے ہاتھ تھام لیے۔

”بس بس اب ڈائلاگ جھاڑنے کی کوشش مت کرنا میں جانتی ہوں تمہیں اس کی الفبہ نہیں آتی، میں دیکھوں ذرا یہ عمر کیا کر رہا ہے بھلا۔“ وہ اپنے مخصوص بے نیاز انداز میں بات بدلتی ہاتھ چھڑا کر اندر بڑھ گئی تھی۔

پیسہ تو بہر حال اپنی جگہ ایک مسلم ضرورت ہے مگر سچ بات ہے پیسوں کی مدد کے علاوہ بھی جس طرح اس نے مجھے بلڈاپ کرنے میں، اپنی ہمتیں جمع کرنے میں اور پر عزم بنانے میں مدد دی تھی اس کا جواب ہی نہیں تھا۔ کس کس طرح سے مجھ جیسے شکستہ حال تقدیر کے مارے بندے کو کول ڈاؤن کر سبب بنی تھی۔

ایئر پورٹ تک وہ میرے ہمراہ تھی۔ عمر اور اطہر کے ساتھ انماں جی اور آپا لوگوں سے الوداع ملاقات بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اماں جی رو رو کر بے حال ہو رہی تھیں اور میرا دل ان کی ہر سسکی پر ڈوب جاتا تھا۔

ایسے میں وہی تھی جو سب کو تسلیاں دے رہی تھی، حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ میں کبھی دور نہیں رہا تھا گھر والوں سے اور اب تو اتنی دور جا رہا تھا جہاں سے واپس لوٹنے کا بھی کچھ یقین نہیں تھا۔ بڑے ضبط اور جبر سے کام لے کر اپنے اندر اٹھتے شور مچاتے آنسوؤں کو اندر ہی محصور کر کے ماں بہنوں سے رخصت لی تھی۔

”تم بالکل فکر مت کرنا ادھر کی، میں موجود ہوں نا، سب سنبھال لوں گی۔ پھر ماشاء اللہ عمر بھی اچھا خاصا سمجھ دار ہے۔ دیکھو گھر امت جانا شروع شروع میں تمہیں وہاں کا ماحول اچھی لگے گا۔ یہاں تک خیال بہت ستائے گا۔ مگر آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے اور دیکھو جتنے اچھے یہاں سے جا رہے ہو، اس سے زیادہ اچھا بن کر واپس لوٹنا ہم سب تمہارے منتظر ہیں گے۔“

عمر اور اطہر کو گلے لگا کر پیار کیا، جانتے سے ایک الوداعی نگاہ اس پر ڈالی۔ سفید سادہ سے کاشن کے شلوار سوٹ میں اس کا سادہ بے ریا مخلص اور ہمدرد وجود کتنا نمایاں، کتنا پرکشش آمیز لگ رہا تھا۔ اتنی عام سی ہوتے ہوئے بھی کتنی منفرد کتنا جاذب نظر لگ رہی تھی۔ جانے کیوں دل میں ایک عجیب دل گداز جذبے نے سزا بھارا، موع ہوتا تو اس وجود کو ایک بار بازوؤں میں لے کر اس پر مہر شکر ثبت کر دیتا۔

”اللہ حافظ خاور! پہنچ کر خیریت کی اطلاع ضرور دینا۔“ اس نے بڑے حوصلے سے مسکرا کر الوداع کیا۔

یہ اس کی باتوں، اس کے جذباتوں، اس کے خلوص کی روشنی تھی جس نے پرانے دلیں میں مجھے بھٹکنے دیا۔ میرا عزم بے دار رکھا۔ جب کبھی تھک کر مایوس ہونا چاہا، وہ مہربان بائیں، وہ دلوں کے جگتا لہجہ ذوں میں گھل جاتا، کبھی ایسا بھی ہوا جب کڑی مسافت طے کرتے کرتے میں نے ایک جگہ تھک کر ڈالنے کا سوچا اور ادھر سے اس کا ”نامہ“ آ جاتا، میں پھر سے رخت سفیر باندھ لیتا۔

نفس اور عمر کے خطوط سے پتا چلتا رہا کہ وہ واقعی اپنا کہا پورا کر رہی تھی۔ گھر کے انتظام و انصرام اور والوں کے پرائیمر کے بارے میں برابر خبر رکھتی تھی۔ ایم اے کرنے کے بعد اس نے بینک میں بک کر لی تھی۔

نفس کی شادی پر کوئی ڈیڑھ برس بعد میں واپس لوٹا تو بڑی حد تک معاشی بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ نفس سارا جہیز تیار تھا۔ بچوں کی پڑھائیاں ٹھیک ٹھاک چل رہی تھیں۔ گھر کا بجٹ نارمل ہو چکا تھا اور گھر والے کے چروں پر خوشی کے عکس جگمگا رہے تھے۔ میرا دل بھی مسرور ہو گیا۔ اماں جی تیار ہی تھیں نیانے

ت ساتھ دیا یہ سب اسی کی بھاگ دوڑ کا نتیجہ ہے۔ بہت خیال رکھا ہے اس نے۔

”وہ کہاں ہے؟ ہوٹل میں ہوگی؟“ میں نے گھڑی دیکھ کر قدرے بے چینی سے دریافت کیا۔

”ارے نہیں، اپنے بینک سے چھٹی لے گئی ہوئی ہے پرسوں سے جہلم، وہاں اس کے کوئی

انٹے والے ہیں حال ہی میں ایف بی میں اپنی طبیعت سے آئے ہیں ان کا پتا کرنے کے لیے گئی ہے۔“

”تو کیا شادی میں شریک نہیں ہوگی وہ؟“ میرا دل جانے کیوں اسے رو رو دیکھنے کو چمکنے لگا تھا۔

”کیوں نہیں شریک ہوگی۔ بھلا پرسوں شام تک آجائے گی واپس۔“

اور مجھے یہ دودن کا عرصہ بہت طویل لگا۔ میں خوش تو تھا کہ ایک ذمہ داری سے بحسن و خوبی فارغ ہو رہا ہوں مگر میری یہ خوشی نامکمل سی لگ رہی تھی۔ سب نے مجھے سرائیوں پر بٹھایا تھا۔ میری قربانیوں کو سراہا تھا مگر میرا دل ہنوز تشنہ تھا یہ کسی اور ہستی کی طرف سے خراج کا طالب ہو رہا تھا۔

”اسے کہتے ہیں ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی۔ ہمیں خبر ہی نہ تھی ورنہ کوئی استقبالیہ پروگرام ترتیب دینے کے لیے ضرور ٹھہر جاتے۔ اور سنائیے کیسے مزاج ہیں جناب خاور مغل صاحب کے۔“

اس کی زندگی سے بھرپور بٹاش آواز بہار کا جھونکا بن کر کمرے میں پھیل گئی تھی۔ اس کے اندر داخل ہونے پر جس بے قراری سے میری نگاہوں نے اس کے سراپے کو اپنے حصار میں لیا تھا میرے لیے بذات خود بڑا حیران کن تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ میری نظریں اس کے چہرے سے ہٹنا بھول گئی تھی۔

وہ ویسی ہی تھی، پہلے کی طرح سادہ رو، سادہ مزاج سادہ لباس اپنے مخصوص لا پرواہ انداز میں سب سے مخاطب کبھی ادھر آ رہی ہے تو کبھی ادھر یہاں وہاں ہر جگہ ایک کے ساتھ اور ہر طرح کی صورت حال میں ہم قدم۔

”نفس کا معاملہ تو اللہ نے نبھا دیا بس اب اچھی سی بڑی سی کوٹھی خریدنا رہ گئی ہے اس کو بھرنے کے لیے سامان چاہیے، پھر گاڑی بھی خریدنا ہے اور فریال کے لیے کچھ سامان چاہیے، اب یہ فلیٹ بھی چھوڑی

دینا ہے، کب تک اس کا بک میں رہیں گے۔“ اماں مستقبل کے منصوبے بنا رہی تھیں۔
”گویا تین نئے ٹارگٹ ہیں ماموں کے لیے۔“ فریال شوخی سے مسکرائی۔

”گھر، گاڑی اور گھریلو سامان۔“

رات کو وہ حسب معمول جانے لگی تو بلیس آپا نے عمر کو پکارا۔

”عمر جاؤ دنیا کو چھوڑ آؤ نیچے تک۔“ اس کی گاڑی کی چابی تو تھی اس کے ہاتھ میں۔

”میں چھوڑ آتا ہوں۔“ میں عمر کے آنے سے پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”اچھا بھئی، اللہ حافظ کب تک ہو یہاں؟“ نیچے پہنچ کر اپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اس نے

خوش دلی سے دریافت کیا۔

”دو تین دن اور ہوں چابی مجھے دے، میں ڈرائیو کرتا ہوں۔“

”ارے نہیں، میں چلی جاؤں گی آرام سے، تم پھر واپس کیسے آؤ گے؟“

اس نے میری تکلیف کا خیال کرتے ہوئے منع کر دیا۔

”خیر ہے، آ جاؤں گا تم بیٹھو۔“ میں چابی لے کر گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔

”اگلی بار آؤ گے تو ان شاء اللہ العزیز اپنی کروڑ لاکھ کا دروازہ کھول کر شان سے مجھے بیٹھنے کی آفر کرو

گے۔“

ہمیشہ سے دوسروں کا مان بڑھانے والی عادت اس کے خمیر میں شامل تھی۔

سارے راستے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں وہ گھر کے معاملات ڈسکس کرتی رہی، یہاں کے

حالات بتاتی رہی۔

”ایں۔۔۔ یہ کیا، یہ تو باطل نہیں ہے تم شاید راستہ بھول بیٹھے ہو۔“ گاڑی کے رکنے پر وہ حیرت

سے پلکیں جھپک کر مخاطب ہوئی تھی۔

”یہ آئس کریم پارلر ہے، یہاں آئس کریم کھائی جاتی ہے اور بے فکر رہو میں راستہ بھی ہرگز نہیں

بھولا۔“ میرے انداز میں حد درجہ اطمینان تھا۔

”آؤ چلتے ہیں مگر ایک منٹ ایک امانت ہے تمہاری میرے پاس۔“ میں نے کوٹ کی اندرونی

پاکٹ سے اپنا دالٹ نکالا۔ ساتھ ہی سائیڈ کی دوسری پاکٹ کھنگال کر اندر سے ایک چھوٹا سا خوب

صورت سے ریپر میں لپٹا گفٹ باہر نکالا۔

اس نے میرے ایک ہاتھ میں رقم کے پھولے ہوئے لفافے اور دوسرے میں ننھے سے گفٹ کو کچھ

نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھا تھا۔

”نہایت ایک حقیقت ہے کہ جو کچھ تم نے میرے لیے میری فیملی کے لیے کیا ہے اس کا بدلہ مجھ جیسا

بے فیض شخص چکا ہی نہیں سکتا میں خود کو کسی قابل نہیں پاتا کہ تمہارے احسانات، تمہاری مہربانیوں کے

صلے میں کچھ پیش کر سکوں تاہم رسم دنیا کو یہ تمہارا فرض۔“

میں نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی رقم والا لفافہ اس کے پاس میں ڈال دیا۔

”ہاں اور یہ میری خوشی ہے، ایک چھوٹا سا معمولی سا تحفہ پلیز اور اب انکار نہیں کرنا۔“

مگر یہاں بھی وہ میرا مان بڑھا گئی، خوش دلی سے میرے ہاتھ سے گفٹ لے کر کھولتے ہوئے

لی۔

”بھئی واہ! لینے سے انکار کون کا فر کرتا ہے۔“ اس کے ہاتھ بڑی سرعت سے ریپنگ پیپر کھول

ہے تھے۔

”داؤز بردست۔“ گینگنوں جڑا خوب صورت ڈیزائن والا بریسلٹ دیکھ کر اس نے مسرت انداز

لیا۔ کہا۔ میرا دل شاد مان ہو گیا حالانکہ میں جانتا تھا اس کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک بیش قیمت اور

خوب صورت جیولری موجود تھی۔ مگر جس طرح اس نے میرے خلوص کی قدر دانی کرتے ہوئے نا صرف

خفہ پسند کیا تھا بلکہ نہایت اشتیاق کے عالم میں اسی دقت پہن کر بار بار اپنا بازو دیکھ رہی تھی اس کے اس

عمل نے مجھے بڑی انوکھی سی سرشاری بخشی تھی۔

آئس کریم کھاتے ہوئے ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے میں اسے وہاں کے قصے سناتا رہا۔

اس کی معیت میں دقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔

دوسری بار جب میں وطن لوٹا تو اتنا کما چکا تھا جس سے گھر والوں کے خوابوں کی تعبیر ممکن ہو سکی

تھی۔ اس بار میں امریکہ کو مکمل طور پر خیر باد کہہ کر لوٹا تھا۔ اس مختصر عرصے میں گھر کے افراد میں بہت سے

تبدیلیاں آچکی تھیں۔ انہیں پیسہ استعمال کرنے کا سلیقہ آچکا تھا۔ میرے آنے سے پہلے ہی ایک شاندار سی

کوٹھی اور نئی ٹیوٹا کروڑ لاکھ کی پسند کی جا چکی تھی۔ میرے آنے کی دیر بھی کہ بے منٹ کے بعد فلیٹ چھوڑ کر

نئے گھر میں منتقل ہو گئے اور عمر اور اظہار کی فرمائشی اشیاء سے مزین کرنے کے لیے رقم اماں جی اور فریال

لوگوں کے سپرد کر دی انہوں نے اپنی مرضی سے گھر سیٹ کرایا۔

سب گھر والوں کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے تھے۔ جدید طرز کے قیمتی ملبوسات، اچھا کھانا پینا

اور آسائش و آرام نے گویا سب کی صورتیں ہی بدل دی تھیں۔ میں خوش تھا کہ گھر والوں نے جیسے سکھ کے

خواب دیکھے تھے بالآخر میں انہیں ان کی تعبیر دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

رقم میرے پاس موجود بھی سو بسم اللہ کر کے بزنس شروع کیا۔ خداداد پے پراٹا ہے تو چھپر ہی پھاڑ

دیتا ہے۔ بزنس بہت جلد چل نکلا اور یوں گھر میں دولت کی ریل پیل بڑھتی ہی چلی گئی۔ میرے سیٹ

ہوتے ہی اماں اور آپا لوگوں کو میری شادی کی فکر ہوئی، میں چاہہ رہا تھا پہلے فریال کی شادی ہو جانی مگر

فریال کی ضد تھی ابھی وہ جاب کرنا چاہتی ہے۔ اماں نے بھی کہا۔

”چلو ایک آدھ سال اسے شوق پورا کر لینے دو، کون سا عمر نکلی گھارہی ہے یوں بھی اصولاً اب

تہجاری باری ہے۔ میں اپنے چاند سے بیٹے کے لیے بہت حسین پڑھی لکھی اور کسی اونچے گھر کی لڑکی

لاؤں گی۔ ایسی کہ سب دیکھتے رہ جائیں۔“

میں ان دنوں عمر کو پڑھنے کے لیے امریکہ بھجوانے کے چکروں میں تھا۔ خیال تھا کہ ادھر ایک تو

نک کر پڑھ لے گا دوسرا جاب کی پرائیوٹ نہیں رہے گی۔

مجھے خبر بھی نہ تھی کہ اماں اور آپا مع بھانجیوں کے ان دنوں میرے لیے لڑکی تلاش کی مہم چلا رہی ہیں

اور کسی ایک کو منتخب بھی کر چکی ہیں۔ خبر تو تب ہوئی جب انہوں نے کسی شہرین نامی لڑکی کے بارے میں

مجھے بتایا اور اس کی تصویر دکھا کر رائے لی۔

”بے انتہا خوب صورت ہیں شہرین، ماموں۔“ فریال بڑی خوش ہو کر اطلاع دے رہی تھی۔

”اور امیر بھی بہت ہیں، اتنا بڑا گھر ہے ان کا۔“ بلقیس آپا نے رائے دی۔

”کم عمر بھی ہے میرے بیٹے کے ساتھ خوب بچے گی۔“ اماں میری نظر اتار رہی تھیں میں ان لوگوں کی باتیں یوں سن رہا تھا جیسے جملے تو کان میں پڑ رہے ہوں مگر مفہوم سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔

گھر میں کافی چرچا رہنے لگا۔ شہرین کے حسن جہاں سوز کا، اس کے باپ کی امارت کا، اس کی نازک مزاجی کا۔ مجھے یہ سب کچھ بے زار کن اور ناگوار گزر رہا تھا۔ بالآخر ایک دن جب اماں نے سنجیدہ ہو کر میری رائے طلب کی تو میں نے بالآخر تامل کرتے ہوئے دل کی بات بتا ہی دی۔

”کیا۔۔۔؟“ اماں ہی کیا سارے گھر والے بھونچکا رہ گئے اور مجھے ان کی حیرت پر حیرت ہونے لگی۔ میرے خیال میں تو یہ سن کر انہیں خوشی سے کھل جانا چاہیے تھا۔

”لو بھلا بتاؤ کیا بے وقوفوں والی بات کرتے ہو، تم نیا شادی کرو گے؟“ بالآخر بلقیس آپا نے ابتداء کی۔

”کمال کرتے ہو بچے اتنے بڑے برنس مین ہوا اتنا نام ہے تمہارا۔ بھلا لوگ کیا خیال کریں گے کہ یہ ہے تمہاری پسند۔“ اماں جی کے انداز نے میرے خون میں کھولن پیدا کر دی۔

”مجھے آپ کی منطق سمجھ میں نہیں آئی اسے اپنانے سے میرے نام یا برنس پر کیا اثر پڑے گا۔ بلاشبہ وہ اتنی اچھی ہے کہ اسے اپنانے والا اپنی قسمت پر رشک کرے گا اس میں کیا برائی ہے؟ کیا عیب ہے؟“

”ماموں کیا آپ انہیں ہماری ممانی بنائیں گے؟ میری دوستیں کیا کہیں گی۔“ فریال نے منہ بسور کر مایوسی کے عالم میں کہا۔

”کیوں، کیا کہیں گی۔“ مجھے سخت تاؤ آرہا تھا گھروالوں کے انداز پر۔

اماں میرا غضب ناک موڈ دیکھ کر بڑے سبھاؤ سے بات بڑھاتے ہوئے بولیں۔

”ٹھیک ہے بچے، نیا بہت اچھی لڑکی ہے بڑا ساتھ دیا ہے اس نے ہمارا۔ مگر وہ تیری بہن نہیں بن سکتی۔ دیکھنا تو ایسے شہزادوں جیسے نقوش کا مالک ہے وہ عامی شکل و صورت والی ہے۔ پھر عمر بھی اس کی اچھی خاصی ہو چکی ہے۔ ماں باپ کا پچھلے سال ابولہبی میں انتقال ہو گیا اب اس کے پاس رہا ہی کیا ہے۔ اب ہمارا اتنے بڑے گھرانے کے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، شہر کے معززین میں ہمارا شمار ہوتا ہے۔ ایسی ویسی بہو لے آئے تو کیا دنیا والے تمہیں نہیں اڑائیں گے۔ سو سوتا میں بنائیں گے لوگ۔“

اماں جی کی بات سن کر میں نے نہایت بے یقینی اور تاسف کے عالم میں انہیں دیکھا تھا۔ باقی سب لوگوں کے چہروں کے تاثرات بھی اماں کی باتوں کی خاموش تصدیق کر رہے تھے۔

”اماں! ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ شکل و صورت اس کی جیسی بھی ہے مجھے پسند ہے۔ اور عمر میں تو وہ مجھ سے تین چار سال چھوٹی ہی ہوگی، امیر والدین کے انتقال کے بعد وہ خدا نا خواستہ غریب تو نہیں ہوگئی۔“ ان کی خود غرضانہ سوچ نے مجھے سلگا کر رکھ دیا تھا۔

”بچے! آج کل رشتے کرتے ہوئے یہی سب کچھ دیکھا جاتا ہے۔ شکل و صورت والی ہو، کم عمر ہو میر ہو، مرد کی عمر کون پوچھتا ہے۔ تو تو آج سے دس سال بعد بھی ماشاء اللہ اسی طرح جوان اور خوب رت دکھائی دے گا۔ مرد کی عمر کو رنگ نہیں لگتا۔ عورت چاہے اپنے مرد سے دس پندرہ سال چھوٹی ہو تو جوڑی چل جاتی ہے جب تجھے اتنی حسین، امیر، کم عمر لڑکیاں مل سکتی ہیں تو کیوں اس معمولی سی بے راء، بے ٹھکانا لڑکی کے لیے دل چھوٹا کرتا ہے۔“

مجھے لگا جیسے کسی نے یم میرے اعصاب پر پھوڑ دیا ہو۔ یہ میری ماں تھیں جو کل تک مجھے نیا سے بلاش رکھنے پر پھنکارا کرتی تھیں اس کے باپ کے بابا جان برا حسانات گنوا کر لٹاڑتی تھیں کل تک جس لی کی اعلا ظرفی، فراخ دلی اور محبت کرنے والی فطرت کے گن گنا کر جیا کرتی تھیں، آج وہ ان کی بروں میں معمولی اور بے آسرا لڑکی بن گئی تھی۔ یا خدا یہ دہشت اس طرح بھی ذہنوں کی کاپی لٹ سکتی ہے۔ میں سکتے کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔

”اگر آپ کا حافظہ آپ کا ساتھ دیتا ہے تو ذرا یاد کیجیے اس معمولی لڑکی نے ہمارے گھر کے لیے کیا کیا کچھ نہیں کیا۔ آج ہم جو کچھ ہیں، اسی کی قربانیوں اور ایثار پسند طبیعت کے باعث ہیں۔ ذرا یاد کیجیے یہی معمولی لڑکی جب آپ کے گھر کے حسرت زدہ ماحول میں آکر اجنبیت کا احساس مٹا دیا کرتی تھی۔ جو غائف کے نام سے گھر گھر کے کپڑے اور کھانے پینے کا اہتمام کرتی تھی، جو آپ کی اولاد کی فیسیں اور کاپیاں کتائیں دے کر ان کی مدد کیا کرتی تھی جو بغیر احسان جتلائے آپ کے گھر کے بجٹ کو پورا کر دیا کرتی تھی۔ جو آپا کے علاج کے لیے مہنگی سے مہنگی دوائیاں خرید کر لاتی تھی۔ کوئی بیمار پڑتا تھا تو خود اپنی گاڑی پر اپنے پیلے سے خرچ کر دیتی تھی۔ جواستے امیر باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود آپ کے گھر کی روٹی سوکھی من و سلوکی سمجھ کر کھایا کرتی تھی۔ جس نے ایسے کڑے وقت میں مالی امداد کی جب میں ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ جس کی رقم سے میں اس قابل ہو سکا کہ باہر جا کر آپ لوگوں کو اس قسم کے ٹھاٹھ کراؤں۔“

غم و غصے سے میرا چہرہ سرخ پڑتا جا رہا تھا۔

”تو کیا ہوا تم نے واپس تو کر دی ہے اس کی رقم، رکھ تو نہیں لی نا ہم نے۔“

آپا کی بے حسی پر میرا دل کڑھ کر رہ گیا۔

”بات رقم کی نہیں ہوتی آپا! میں نے بمشکل تمام اپنا اشتغال ضبط کیا۔“ ایسی ہزاروں رقیں بھی میں اسے واپس کر دوں تب بھی اس کے احسانات کا بدلہ نہیں اتارا جاسکتا، مالی مدد کا بدلہ ہو سکتا ہے مگر جذباتی مدد کا کوئی بدلہ نہیں ہوا کرتا۔ اس کے جذبوں کے خلوص، محبت اور اس کی بیش قیمت ہمدردیوں کو سامنے رکھا جائے تو ہمارے گھر کا ایک ایک فرد کا بال بال اس کے قرضے میں جکڑا محسوس ہوگا۔“

”ابے تو ہم نے بھی تو اس کے لیے کچھ کم نہیں کیا۔ یہ تھوڑا ہے ہم نے اسے اپنے گھر میں پناہ دی، یاں باپ سے اتنی دور بھی ہم نے اس کی عزت کی حفاظت کی اس کو اتنی محبت دی وہ تو رشتوں کی ترسی ہوئی تھی۔ بھلا اور کسی کے ہاں اسے اتنا آرام، اتنا پیار ملتا تھا۔“

اماں کے بے حسی اور خود غرضی کے لبادے میں لپٹے جملوں نے میرے اندر آگ سی دہکا دی۔

”اب کیا ان کے احسان کے بدلے میں ہم آپ کی زندگی تباہ کر دیں۔“ فریال نے بھی بڑا پین دکھاتے ہوئے لب کشائی کی تھی۔

”تم چپ رہو اور جا کر اپنا کام کرو۔“ میں نے شاید زندگی میں پہلی بار اس کے ساتھ اس طرح غرا کر بات کی تھی۔ وہ ماموں کے مشعل ہونے پر خائف سی ہو کر اندر چلی گئی۔

”ہاں تو صحیح ہی تو ہے۔ بھلا شادی کوئی گڈے گڈی کا کھیل تو نہیں ہوتا نا کہ جیسے بھی چلاؤ نہ جائے گی۔ یہ بات واضح ہے کہ نیا تمہارے ساتھ کسی لحاظ سے سوٹ نہیں کرتی اور تمہارے ساتھ تمہارے اسٹینڈرڈ اور اسٹینڈس کے مطابق کوئی خوب صورت سی امیر زادی ہی سے گی۔“

آپا کو اپنی بیٹی کی بے عزتی پسند نہیں آتی تھی سو جیسے بہ جیسے ہو کر بول پڑی تھیں۔

”زندگی مجھے گزارنا ہے اور میں یہ جان چکا ہوں کہ میرے ساتھ نیا کے علاوہ اور کسی بھی قسم کی کسی بھی طبقے کی اور کوئی زہرہ جیس نہیں چل سکتی۔ نا صرف میرے ساتھ بلکہ آپ لوگوں کے ساتھ بھی کسی بڑے گھر کی خیرلی حسینہ کا گزارا نہیں ہوگا۔ نیا تو ہر لحاظ سے فٹ ہے یہاں۔“

”ہم کریں گے بھیا گزارا۔“ آپا چمک کر بولیں۔

”ہمیں تو بس شہرین جیسی خوب صورت اور نازک سی بھابھی چاہیے۔“

”تم دیکھ تو لو اسے ایک بار ملو تو سہی اتنی خوب صورت اور کم عمر ہے وہ کہ۔۔۔“ اماں مجھے لپٹا رہی تھیں۔ میں بے بسی سے سر پکڑ کر رہ گیا۔

”اماں! آپ کیوں نہیں سمجھتیں۔ کیوں آپ کی آنکھوں پر امارت اور حسن کی پٹی پڑ گئی ہے۔ میں جس قسم کا بندہ ہوں اس لحاظ سے میں نیا جیسے مزاج کی حامل لڑکی کے ساتھ ہی ایڈ جسٹ ہو سکتا ہوں وہ مجھے سمجھتی ہے اچھی طرح۔ میرے خیالات کا پتہ ہے۔ نہ مجھے حسن کی طلب ہے نہ امارت کی، اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ مجھے اپنے مزاج کے موسموں کا سا بھی چاہیے اور وہ صرف نیا ہی ہو سکتی ہے۔“

میرے جتنی انداز نے اماں کو بھڑکا دیا۔

”مگر ہم ایسی معمولی صورتی شکل والی لڑکی کو بہو نہیں بنا سکتے۔ آخر چار بندوں میں ہمیں بھی منہ دکھانا ہے۔ شہرین تمہیں نہیں پسند تو کوئی اور دکھ لیتے ہیں مگر وہ نیا کی صورت بھی نہیں ہو سکتی۔ غضب خدا کا سارے جاننے والے لعن طعن کریں گے کہ بہو کی تو ایسی گری پڑی لاوارث ہم سے دوسروں کی باتیں نہیں سنی جاتیں۔ ہمارے بھی کچھ ارمان ہیں، آخر ہمیں ماں بہنوں کو ناراض کر کے اپنی پسند کی دہن لانا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ ہمیں چھوڑ آؤ دوبارہ اسی فلیٹ میں۔ وہاں رہ لیں گے تم یہاں اپنی دل کی ملکہ کے ہمراہ ہی خوش رہنا اور ہم سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنا۔“

اماں کا سرد مہر انداز مجھے اندر سے باہر تک بے بسی کی آگ میں جھلسا گیا۔ اسی لمحے کوئی اندر داخل ہوا۔

یہ نیا تھی۔ دھواں دھواں چہرہ لڑکھرائی ہوئی چال، بے اوسان انداز، وہ اندر داخل ہو کر گرنے کے سے انداز میں قریب پڑے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے بغور اس کے لرزتے کانپتے وجود کو دیکھا اور جیسے میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

مجھے عجیب سا احساس تو ہوا تھا جیسے کوئی دروازے کے پردے کے پیچھے کھڑا ہو کافی دیر سے، مگر پھر سے بحث و مباحثے اور گرما گرمی میں دوبارہ دھیان نہیں گیا۔ تو کیا اس نے ساری باتیں سن لی ہیں۔

”نہیں میرے خدا۔ اس کو اپنی اینار پسندی اور ہمدرد فطرت کی اتنی کڑی سزا نہیں ملنی چاہیے۔“

میرا رواں رواں قرعش تھا مگر ہونی ہو کر رہنا تھی۔ اس کا ہر ہر انداز پکار رہا تھا کہ یہی بات تھی۔

”گر می میں آئی ہوں نا تو لو گننے سے اعصاب ہی الٹ گئے میرے۔“

کتنی دیر بعد خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے وضاحت کی تھی، مگر اس کی آواز کی مخصوص کھنک کی ٹھوکلا پن اور لرزش مجھ سے پنہاں کیسے رہ سکتی تھی۔ جب سے نئے گھر میں شفٹنگ ہوئی تھی، گھر والوں اس کے ساتھ پندرہ رات کی وہ پہلے والی گرم جوشی اور والہانہ انداز نہیں رہے تھے وہ بھی شاید محسوس کر چکی تھی اس لیے بہت کم آتی تھی۔

حسب معمول وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی خود کو مصروف اور بے خبر ظاہر کرتی رہی مگر اس کے رویں میں سے پھوٹی بے چینی اور اضطراب کی موجیں بغور دیکھنے پر واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھیں۔

”اچھا آئی! اب چلتی ہوں۔“ تھوڑی دیر بعد وہ بیگ اٹھانی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیٹھ جاتیں تھوڑی دیر۔“ اماں نے رسا کہا ان کے انداز میں بڑا ٹھنڈا پن اور بے مہری تھی۔ مگر

مے نہایت محل اور اعلا درجے کی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے نظر انداز کر دیا۔

”ضرور رک جاتی آئی! لیکن کچھ کام ہے مجھے، دراصل ان دنوں میں اپنی جہلم ٹرانسفر کرانے کے

روں میں ہوں۔ وہاں کچھ جان پہچان کے عزیز موجود ہیں دعا کیجیے گا۔ میرا کام ہو جائے۔“ پھر وہ

ری طرف چلی گئی۔

”اور ہاں بھئی جناب خاور مغل! آپ شادیانے کب بجوار ہے ہیں۔ ذرا جلدی جلدی کر ڈالیے

کام تاکہ ہم بھی جاتے جاتے آپ کی خوشیوں میں شریک ہو جا میں۔“

میں نے سر اٹھا کر گہری نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔ وہی بے لوث، بے ریا مسکراہٹ آنکھوں

میں کمال درجے کا ضبط، میں کچھ کہنا چاہتا تھا اسے روکنا چاہتا تھا اس کے پیچھے آکر ساری حقیقت منکشف

کرنا چاہتا تھا مگر کسی نا دیدہ طاقت نے میرے قدموں کو زمین میں گاڑ دیا تھا وہ چلی گئی اور میں اسے

روازے تک چھوڑنے کی ہمت بھی اپنے اندر پیدا نہ کر سکا۔

کتنے بار تو قہر کر دیا تھا اماں اور آپا لوگوں کے خیالات نے اسے، کس طرح اس کی عزت نفس کو

روند ڈالا تھا۔ اس کی انا، اس کی خودداری پر کس طرح تازیانہ لگایا تھا۔ اسے خود اپنی نظروں میں کتنا گرا دیا

تھا۔ میں پوری طرح محسوس کر سکتا تھا۔ وہ جو سب کو جوڑنے والی تھی، مہر مہر رکھنے والی تھی جو ہمد و ہم راز

اور چارہ گرد و مہر ساز بھی سب کی، کس بے دردی سے اس کے خلوص اس کے ایثار کا مذاق اڑایا گیا تھا ان

زہر لگی ٹھوکی باتوں کے ڈنک کس کس طرح اس کی روح کو زخمی کر رہے ہوں گے۔

بے چینی، اضطراب اور دکھ کی لامتناہی چادر نے میرے پورے وجود کو لیٹ میں لے رکھا تھا۔

محض دو ہفتے بعد وہ رخت سفر باندھے تیار تھی۔ میں اس عرصے میں ہتھیار ڈال چکا تھا۔

”ارادہ تھا کہ تمہاری شادی تک رک جاؤں مگر ٹرانسفر آرڈر زیادہ ہی جلدی آگئے۔ بہر حال میری

طرف سے بھی بہت سارا خوش ہو لیتا۔“

جاتے سے وہ الوداعی ملاقات کے لیے آئی تو سب سے مل کر بڑے بشاش سے انداز میں مجھے چھیڑا تھا۔

مکینوں کے دلوں کی کدورتوں اور بدگمانیوں سے آشنا ہوتے ہوئے بھی ان سے اتنی لگاؤٹ اور اتنے خلوص سے ملنا بڑے دل گردے والے لوگوں کا کام ہوا کرتا ہے۔

”اماں جی! آپ لوگوں کے ہاں مجھے جو پیار محبت اور احساس تحفظ ملا میں اس کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتی آپ کو، آپ لوگوں کا بہت شکریہ کہ اتنا عرصہ مجھے غریب الوطنی کا اور بے آسرا ہونے کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ میں آپ سب لوگوں کو بہت مس کروں گی۔ مجھ سے اگر نادانستگی میں کوئی گستاخی سرزد ہوگئی ہو تو چھوٹی سمجھ کر معاف کر دیجئے گا۔“

سب سے مل کر وہ ہوا کے جھونکے کے مانند خاور ولا سے نکل گئی اور جیسے میری زندگی سے بھی خوشی اور سکون کی برکھا ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی۔ جانے سے پہلے اس نے پورے گھر کا ایک چکر لگایا تھا۔ میں کمرے میں آیا تو کھودے کا ہولناک احساس میری رگ رگ میں انگارے دوڑا رہا تھا۔ یونہی سائیڈ ٹیبل پر رکھے سفید لفافے پر نظر پڑی، کھولا۔ عزیزم خاور!

قیمت نہ لگا جذبہ ایثار طلب کی
ہر شے کو فقط چشم خریدار سے مت دیکھ
میں اور کہیں صاف دکھائی نہیں دوں گی
ہٹ کر مجھے آئینہ کردار سے مت دیکھ

تمہاری خیر اندیش

☆☆☆

وہ کب کے خاموش ہو چکے تھے مگر تانیہ ہنوز جیسے کسی طلسم کے زیر اثر خود کو اسی ماحول میں جذب پارہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح گزرا ہو وہ خود کو اس کہانی کا ایک کردار سمجھتے ہوئے شکست و ریخت کے ان جذبات کو مکمل طور پر محسوس کر رہی تھی۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر سر جھکا، خاور مغزل کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کا دل بند ہوتے ہوئے رہ گیا

ان کے چہرے اور آنکھوں میں کیا تھا؟

تانیہ سے زیادہ دیر تک دیکھا نہیں گیا۔

ملاں، حسرت، تشنہ کامی، تاسف، دل گرفتگی اور شکستہ لپائی کی دھول نے ان کے چہرے کے سارے رنگ نچوڑ لیے تھے۔ ان کی سرخ و حشت زدہ آنکھوں میں ویرانیوں کے سائے رقصاں تھے۔ اس سے وہ اتنے ٹوٹے پھوٹے اتنے شکستہ نظر آ رہے تھے کہ تانیہ کا دل شدت غم سے بیٹھنے لگا۔ ”تو یہ تھا سارا قصہ بے بی۔ اب تم جان ہی چکی ہوگی کہ میں ان لوگوں کے ساتھ اپنے روتوں میں

حق بجانب ہوں اور دیکھ لو ان کو ان کی ہوس زراور ظاہری آن بان نے کتنا بے سکون کر کے۔ اب مجھ سے شام کیوں ہوتے ہیں۔ بھکتیں اب اپنا بھکتان۔ انہوں نے خود اپنے لیے یہ اکیا ہے۔ اپنے ہی جال میں پھنس چکے ہیں۔ اب وہ جذبات مجھ سے طلب کرتے ہیں جنہیں وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی خود غرضی کی بھینٹ چڑھا چکے ہیں۔ میرے اندر کیا باقی رہا ہے ان کو لیے، دل کے سارے خزانے تو لوٹ لیے۔ جذبات کے سارے الاؤ بجا دیے۔ اب میں اندر ف کے تو دے کی صورت اختیار کر چکا ہوں۔ کوئی چیز اب مجھ نہیں پکھلانی، نہ آنسو، نہ آہیں، نہ خلوص۔ مجھے خود اپنے آپ سے محروم کر ڈالا ہے ان لوگوں نے۔“

ہاکی آنکھوں کی وحشتیں بول رہی تھیں۔ آؤ بے بی گھر چلتے ہیں۔“ پھر وہ اپنے آپ میں لوٹتے ہوئے اسٹیرنگ وہیل کی جانب متوجہ سارے راستہ دونوں کم صم سے بیٹھے رہے۔

اڑی سے اترتے ہوئے پہلے اس کی نظری سیڑھیوں کے پاس کھڑی شہرین کی جانب گئی پھر بے نی پر بندھی گھڑی پر جا بھری اور وہ اندر ہی اندر شرمندہ ہو کر رہ گئی۔ رات کے تقریباً ساڑھے دو بجے تھے۔

ماور مقل تو چابی ہاتھ میں مٹھلاتے آگے بڑھ گئے۔ وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی کچھ ہچکچا کر کے پاس سر جھکا کر مجرمانہ انداز میں کھڑی ہوگئی۔

”سوری بھابھی! کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی۔“
”دیر تمہیں نہیں سمجھے ہوئی ہے جو تمہارا کھیل نہیں سمجھ سکی۔ میں تمہیں بہت معصوم اور سادہ مزاج کی اب کرتی تھی۔“

”خبردار شہرین! مزید ایک لفظ مت کہیے گا۔ کسی کی بے غرضی کو یوں سرعام نیلام نہیں کرتے۔“

وہ اسی لمحے پلٹ آئے تھے۔ تانیہ کا جی چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔
”دوسروں کا تو آپ کو بہت خیال ہے جس کا رکھنا چاہیے اس پر تو کبھی ایک لمحہ رک کر تفصیلی نظر کی بھی رحمت نہیں کی۔“ شہرین کے سلگتے انداز اس کی اندرونی کیفیت کے غماز تھے۔

”خیال وہاں رکھا جاتا ہے جہاں دل رکھے جاتے ہیں، مان رکھے جاتے ہیں اور یہ کوئی جادو کا نہیں ہوتا کہ چھری گھمانے سے مطلوب سامنے آجائے۔ اس کے لیے بڑی تپسیا کاٹنی پڑتی ہے۔“

آپ کی تسلی کے لیے بتا دوں کہ یہ وہ نہیں ہیں جس سے آپ کو خائف ہونا چاہیے۔“
وہ کہہ کر رے نہیں تھے۔ تیز تیز قدموں سے اندر بڑھ گئے تھے اور اسی لمحے تانیہ بھی فیصلہ کر چکی تھی مائٹن زدہ بدگمان فضا میں زیادہ دیر نہیں رہ سکے گی۔ ڈیڈی پر زور دے کر وہ اپنا ترانسفر لاہور سے مائٹن بیکل کالج میں کر دے گی۔ وہ پہلے سے ویسے بھی بہت نزدیک پڑتا تھا۔

”جاری ہی ہو بے بی تم بھی۔“ جاتے سے وہ ان کو دوش کرنے آئی تو انہوں نے تھکے تھکے انداز میں اسے مسکرا کر کہا۔

وہ سوچنے لگی کیا جواب دے۔

”چلو تمہاری مرضی۔ لیکن یہ یاد رکھنا ہم تمہیں دوبارہ ضرور یہاں لائیں گے اور بہت جلد لاؤ گے۔“ انہوں نے ہلکے سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے ہلاتا تھا۔

اس وقت تو وہ ان کی بات کا مفہوم نہیں سمجھی البتہ جب تین چار ماہ بعد وہ لوگ عمر کا پود پوزل کے لیے لے کر آئے تب ان کی بات کا اصل مفہوم سمجھ میں آیا۔

عمر امریکہ سے آچکا تھا۔ اسٹڈی کمپلیٹ کر کے اور اب بزنس میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ روبرو تانیہ کی اس سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ البتہ الہم میں اس کی تازہ ترین تصاویر بغور ملاحظہ کی تھیں۔ دیکھنے میں وہ خاور مغل ہی کی طرح دلکش نقوش اور بھرپور سراپے کا مالک تھا۔ مگر اصل چیز تو بندے کا مزاج اور عادات ہوا کرتی ہیں۔ اس ضمن میں خاور مغل نے اس کی تسلی کروادی۔

”فکر نہیں کرو میں اپنے بھائی کو جانتا ہوں۔ بڑا سادہ مزاج، مخلص اور رشتوں کا احترام کرنے والا شخص ہے۔ اس کے ساتھ تمہارے جیسی نیک طور اطوار کی لڑکی ہی سوٹ کر سکتی ہے۔ ابتدائی بات چیت کے بعد جب تم مجھ پر کھل گئی تھیں اسی لمحے میں نے سوچ لیا تھا کہ میں عمر کو اپنی طرح زندگی کی تنہا کر دینے والی بھیڑ میں گم نہیں ہونے دوں گا۔ چاہے مجھے اس کے لیے اسٹینڈ ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ مگر اتفاق دیکھو کہ ایسی نوبت نہیں آئی۔ مجھ سے پہلے ہی اماں اور آبا لوگوں نے عمر کے لیے تمہارا نام لے دیا۔ وقت نے حالات نے انہیں بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ اب انہیں ٹھوٹے کھرے کی پہچان ہو چکی ہے۔ میرے معاملے میں تو دیر سے ہوئی لیکن صد شکر کہ عمر کے معاملے میں دیر نہیں ہوئی۔ کوئی ایک درجہ باڈ ہے جہاں سے تازہ ہوا اندر آ سکتی ہے، بے بی تمہیں وہاں قدم جانے کے لیے محنت تو ٹھیک ٹھاک کر پڑے گی کہ بدگمانیوں، کدورتوں اور رجش کا کوڑا سمیٹنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے لیکن میں جانتا ہوں تم نے ایک بار قدم جمالیے تو پھر ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہو جاؤ گی بشرطیکہ کوشش جاری رکھو راہ کی مشکلات سے نبٹنے کا ارادہ ٹھان لو۔“

تانیہ نے دھیرے سے سر اٹھا کر ان کے چہرے کی جانب دیکھا پھر مضبوط لہجے میں بولی۔

”میں مشکلات سے نہیں گھبراتی خاور بھائی۔ نموائی کہا کرتی ہیں اگر آپ کے اندر عزم زندہ ہے۔ چلنے کا حوصلہ موجود ہے تو پھر ہم سفری کے لیے کہیں دور ٹھناتے ایک مٹی کے دیے کی لو، کسی مہربان یاد کے جگنو ہی بہت کافی ہوا کرتے ہیں۔ کسی کا خیال، کسی کی یاد بھی تو بہترین، ہم سفر ہوا کرتی ہے۔ پھر میرے ساتھ تو آپ جیسے شفیق اور مہربان ہستی کی آشریہ باد شامل ہے۔“

”بھئی، یہ تمہاری نموائی کیا چیز ہیں جو تمہیں وہاں لاہور میں بھی اتنے فاصلے کے باوجود نہیں بھولیں۔ کبھی ملو او تا ہمیں بھی ان سے۔ اب تو سچ بڑا اشتیاق ہوتا جا رہا ہے جنہوں نے اتنی سی بچی کو اتنا شعور بخش دیا۔“

”ہاں ضرور ملو اوں گی۔ بلکہ ہاتھ لگن کو آری کیا۔ ابھی چلے چلتے ہیں۔ یہ ساتھ میں دو گھر چھوڑ کر تو ان کا بنگلہ ہے۔“

وہ دہور شوق میں یونہی ہمراہ ہو لیے۔

”ارے بے بی! یاد آیا تمہاری تو بے تکلفی ہوگی آتی جاتی رہتی ہوگی ان کے ہاں، بھلا وہ میرے

یال کریں گی۔ ان کے گھر والے بھی تو کوئی ہوں گے نا۔“ وہ بوکھلائے تھے۔

نا کے ساتھ ان کے شوہر ہوتے ہیں، آرمی میں میجر ہیں اور دو پیارے پیارے بچے ہیں۔ نا کے دونوں جڑواں ہیں۔ ان کے شوہر شام کی جائے تک آ جاتے ہیں۔ آپ ان سے بات بڑی میٹھی طبیعت کے ہیں سجاد بھائی۔ آپ بہت خوش ہوں گے ان سے مل کر، ان کی فیملی بہت لوگ، بکسیرنگ اور چار منگ۔“

زم کی ہمراہی میں گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو لان میں میجر سجاد اخبار پڑھتے مل گئے بڑے ملے۔

بڑے اچھے وقت پر آئے آپ لوگ۔ چائے بس آنے ہی والی ہے۔ بلکہ لیجیے آہی گئی۔ بھی دیکھ کر دو کپ اور پیٹیں اور منگوا لیجیے۔“

ورمغل نے بڑے تجسس سے نظریں اٹھائی تھیں اور پھر جیسے وہ پتھر کے ہو کر رہ گئے۔

بسم اللہ، مہمان تو خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔“ بڑے سجاوے ٹرے میز پر رکھ کر وہ سیدھی ہوئی لے آسانی کاٹن کے سادہ سے سوٹ میں وہی سادہ، شفاف چہرہ اور بشاش اپنائیت آمیز انداز مدد ہی تھی۔

”آئی! یہ ہیں ہمارے گیٹ خاور بھائی، جن کے متعلق میں نے آپ کو بتایا تھا۔ ان ہی کے ہاں لی تھی لاہور میں اور خاور بھائی یہ ہماری نموائی ہیں۔“

آداب میز بانی نبھاتے ہوئے اس نے ہلکے سے مسکرا کر تانیہ کے مہمان کی طرف دیکھا اور پھر وہ ٹائیپ کو دنگ رہ گئی۔

”ارے خاور تم۔۔۔ آپ۔“

”کیا آپ جانتی ہیں خاور بھائی کو۔“ تانیہ، خاور مغل کی گم صم کیفیت پر کیا کم حیران پریشان تھی جو برا میز شناخت پر حیرت سے بت نہ بنتی۔

”ارے بھئی یہ وہی خاور تو ہیں سجاد! میں نے بتایا تھا نا آپ کو ایم اے کرنے کے لیے جب میں اسے پاکستان آئی تھی تو ان ہی کے ہاں تو ٹھہری تھی بڑے عرصے تک ان کا ساتھ رہا ہے۔“

”اچھا اچھا۔“ خاور پھر تو دہری خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ نیا اکثر ذکر کیا کرتی ہیں آپ کا کہ آپ کی فیملی نے ان کا بہت خیال رکھا۔“ میجر سجاد، بیوی کی خوشی پر اس سے زیادہ مسرت کا کر رہے تھے۔

”اور کیسے ہیں سب؟ اماں جی، بلقیس آپا، عمر، اطہر، فریال وغیرہ۔“ وہ بڑی بے تابانی سے ایک کا حال پوچھ رہی تھی۔

”سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ کیسی ہیں؟ شادی کر لی اور ہمیں بتایا ہی نہیں۔“ خاور مغل بڑی نا سے اپنے پتھر کے گرداب سے باہر نکل پائے تھے۔

”بس جلدی میں ہی سب کچھ ہو گیا۔ اس لیے آپ لوگوں کو مطلع نہیں کر سکے۔“

نیا کے بجائے میجر سجاد نے معذرت خواہانہ انداز میں جواب دیا۔ ”نیا کہ اور میرے والد صاحب

کی جان پہچان ابونہبی میں ہو گئی تھی۔ یہاں آئے تو نیا کواپنے پاس بلالیا۔ ان دنوں ان کی جانب کا رہا تھا۔ جن دنوں ان کی ٹرانسفر ادھر جہلم ہوئی اس زمانے میں اباجان بہت بیمار تھے۔ وہ مرنے سے میرے سر پر سہرا دیکھنا چاہتے تھے۔ نیا کی جانب سے رضا مندی کے اظہار کے بعد سادگی سے ڈ ہو گیا۔ جو کچ پوچھیے تو میں کہوں گا کہ نیا کے روپ میں باباجان نے مجھے سب سے زیادہ قیمتی اور بابر تھوڑے دیا ہے زندگی بھر کے لیے۔“

میر سجاد کے دھیمے بخندہ انداز میں بڑی محبت تھی۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر کی بات چیت اور دوبارہ ملاقات کے وعدے کے بعد وہ لوگ بالآخر کھڑے ہوئے۔

جب وہ واپس آ رہے تھے تو مغرب کی اذان ہوئے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ سڑک پر فٹ پاتھ کے کنارے چلتے ہوئے خاور مغل کے قدموں میں بڑی سنگی تھی۔ چاروں طرف کی فضا ٹھنڈی چاندنی مگر بھیگ رہی تھی۔ خشک ہوا تانیہ کے ریشمی ملائم بالوں سے چھیر خائیاں کر رہی تھی۔

”خاور بھائی“ بالآخر ایک جگہ رک کر تانیہ نے گہری نگاہوں سے ان کا جائزہ لے کر پکارا۔

”وہ کہ محبوب مجھے تھا۔ مجھے معلوم ہے یہ۔“

”وہ کہ محبوب مجھے تھا۔ مجھے معلوم ہے یہ۔“

وہ اپنی ہی دھن میں دھیرے دھیرے گنگنا رہے تھے ارد گرد سے بے خبر، حتیٰ کہ اپنی ذات سے بے گانہ سے ہو کر۔

”ہوں۔“ اس کی پکار پر ان کے قدم ٹھکے تھے۔

انہیں پکار تو لیا تھا مگر اب تانیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہے۔ لفظ کہیں کھو سے گئے تھے۔ کئی عجیب بات ہے یا پھر دنیا بہت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

اس کی نموا آئی خاور مغل کی نیا نگلیں۔ اسے شروع سے ہی نموا آئی بہت اچھی لگا کرتی تھیں جب میر سجاد کی دلہن بن کر نئی جہلم آئی تھی۔ ان سے کئی دوستی کرنے کے بعد وہ اکثر دل میں سوچا کرتی تھی بھلا نموا آئی سے زیادہ مہربان ہمدرد اور پیاری فطرت کا اور کوئی ہو سکتا ہے؟

خاور مغل کی زبانی سازی کہانی سن کر نیا صدیقی کا روشن کردار اس کے سوچوں کے سمندر میں ایک عرصہ تک بالکل نجات دہا تھا۔ وہ سوچتی بھلا نموا آئی زیادہ اچھی ہیں یا نیا صدیقی اور جب وہ فیصلہ نہ کر پا تو جھنجھلا کر ذہن کو کسی اور سمت لگا لیتی۔ خاور مغل کو نموا آئی سے ملانے کے لیے لے جاتے ہوئے بھی اس کے دل میں یہی کشمکش تازہ تھی۔

”کہیں ایسا نہ ہو خاور بھائی ان سے مل کر کہیں۔ نیا تمہاری نموا آئی سے کہیں زیادہ اچھی تھی کیونکہ اس کی ایثار پسند فطرت کا کوئی جواب نہیں ہے۔“

اس کے دل میں کہیں آرزو تھی کہ۔۔۔ نموا آئی نیا صدیقی کے مقابلے میں اگر جیتیں تا تو کم از کم اس کے برابر ضرور ہیں۔ اور یہ تو اسے خاور مغل کا چہرہ پڑھ کر ادراک ہوا تھا کہ وہ لڑکی سر تا پا جیت ہی جیت تھی۔ نیا صدیقی کے روپ میں بھی، نموا آئی کے روپ میں بھی میر سجاد کے روپ میں بھی۔

لہ قربانیاں اور ایثار پسندی دل درود کے ساتھ ساتھ روپ کو بھی نکھار دیتی ہیں۔ اک نور کا میز ہالہ سا بنا دیتی ہیں۔

بے بی۔“ وہ جانتے تھے کہ اس نے کیا کہنے کے لیے پکارا ہے، اس لیے اس کے بولنے کا انتظار دوہی مکنے لگے۔

”تمہاری نموا آئی سے مل کر میری ایک عرصے کی ذہن میں اب بھی ہوئی تھی سلجھ گئی ہے، میں بے لاہور سے جانے کے بعد اکثر اوقات سوچا کرتا تھا کہ آخر وہ کون سی شش تھی، کون سی بات تھی پنی زندگی کا سب سے بڑا راز ایک چھوٹی سی معصوم لڑکی کے سامنے کھول بیٹھا۔ آخر اس چھوٹی آنے میرے اندر کا بید کیسے پالیا؟ کیسے میرے ماضی کے کواڑوں پر لگے رنگ آلود قتل کھول کر لیا۔ اب خبر ہوئی تمہاری باتوں میں، تمہاری گفتگو میں اس کی سوچ کی خوش بو جو شامل ہوئی تھی۔ یہ خیالوں کی اس کی ذات کی مہک مجھے تمہارے طرز و کام میں محسوس ہوئی تھی۔ اس کشش نے مجھے قریب کر دیا۔ یاد کرو ذرا تم بات بات پر نموا آئی کا حوالہ دیا کرتی تھیں۔ تم سے باتیں کر کے میں دوسے بہت قریب محسوس کرتا تھا شاید اسی لیے تم سے اتنی جلدی بے تکلفی ہو گئی۔ تمہارے مزاج اور بے اندازہ رہ کر مجھے مانوسیت کا احساس دلاتے تھے۔“

”خاور بھائی!“ ان کے خاموش ہونے پر تانیہ نے دھیرے سے انہیں دوبارہ مخاطب کیا۔

”کیا آپ انہیں بتائیں گے کہ آج بھی آپ کے دل میں ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکا۔“

”نہیں۔“ خاور مغل نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں اسے خلش میں مبتلا کیوں کروں۔

نے بہت دکھ کھیلے ہیں۔ بہت کچھ برداشت کیا ہے۔ بہت غذا بولنے سے گزرنے کے بعد کھانے اور سکون پایا نصیب ہوئی ہے اسے، میں دبی ہوئی راہ کرید کر اس کی پرسکون زندگی میں زہریلوں گھولوں؟“

”کیا آپ یہ بھی نہیں جانتا جاپیں گے کہ ان کے دل میں آپ کے لیے کیا جذبات رہے ہیں۔“

ان کے ٹونگ بدلتے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

”نہیں۔“ انہوں نے تھکے تھکے انداز میں سانس کھینچا۔ ”بے بی کچھ سوال ایسے بھی ہوتے ہیں جن

ب صورتی نوک زباں کے بجائے دل میں رہنے میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ زبان پر آجائیں تو اپنا حسن

الی کھو بیٹھتے ہیں۔ بعض اوقات اسرار بھی فرا کر ذرا رعب بن جایا کرتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔

نہ اسے اپنے شوہر اور بچوں کی محبت حاصل ہے۔ میرا دل اس بات پر بہت مطمئن ہے۔ میں کسی

روح ماضی کے کئی تذکرے سے اس کو اس کا رخ اور کرب ناک ماضی یاد نہیں دلانا چاہتا۔ اس کو خوش

تا بہت دیکھ کر میرے دل پر بڑی احساس جرم کی سل کچھ ٹھسک گئی ہے۔ بے بی وہ اتنی اچھی ہے کہ

کے ساتھ بھی جہاں بھی رہے گی پھول کھلا دے گی۔ شرط یہ کہ کوئی ان پھولوں کا قدر دان بھی ہو،

نا طرح بے قدرانہ ہو۔ اور صد شکر کہ اسے ایسا قدر دان مل گیا ہے وہ خوش ہے۔ میں اس میں خوش

ہا۔ سچی محبت کرنے والے سودر زیاں نہیں دیکھتے وہ محبوب کی خوشی میں خوش رہتے ہیں۔ آؤ چلیں۔“

گے چل پڑے تھے۔

”وہ کہ محبوب مجھے تھا۔ مجھے معلوم ہے یہ۔“

اپنا پسندیدہ مصرعہ گنگنا تے ہوئے۔
اور ست قدموں سے ان کے پیچھے چلتی ہوئی تانیہ کے ذہن میں ان کی سنائی ہوئی نظم کے فقر
چل رہے تھے۔

نمائش کی تحریر سے زندگی کی روایت نبھاتے بہت عمر گزری
بہت حوصلوں کی شکستوں کو پندارنے
خاموشی کے کفن میں لیپنا

بس اب راستوں میں، درختوں کی پرچھائیوں کا سندیہ سمجھ لو
وہ دیوار گرتی نظر آرہی ہے
قربانی لازم ہے زندگی کی غمو کے لیے

ہمدردی اور ایثار پندی لازم ہے انسانیت کا علم بلند رکھنے کے لیے۔ ہمارا پلے سے کیا جاتا ہے؟
گھڑی رک کر کسی کے دکھ سکھ سن لیں زندگی کو اس قدر خود غرض بھی نہیں بنا دینا چاہیے کہ زندگی کا ہنار
دھڑکنوں کے راگ بھی کانوں تک نہ پہنچ پائیں۔

ہوس زرا اور طلب حسن کے ماسوا بھی ایک شے ہوا کرتی ہے۔ انسان دوستی۔
انہی سوچوں میں گھر قریب آتا جا رہا تھا۔ بیرونی لائٹس کی روشنی نے ان کے قدموں کو جگمگا
تھا۔ وہ دونوں روشنی سے لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

کچھ رنگ نئے ہیں

”ایک بھائی کا اپنی بہن کے ساتھ۔۔۔“

اعشاریہ بیس بور کا سیاہ چمکتا ہوا ریوالور اس کی کنپٹی تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا چہرہ جو کبھی چمکتی ہوئی
نہ اور خوب صورت مردانہ دکائی لیے ہوا ہوتا تھا، اس قدر سفید ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کا سارا خون
لیا ہو۔

اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔
مگر مقام حیرت تھا کہ اس کا دایاں ہاتھ بالکل پرسکون اور ساکت تھا اور بڑی دلجمعی کے ساتھ کنپٹی
ریوالور کی نال رکھ کر مناسب زاد یہ تلاش کر رہا تھا پھر وہ نال کو ایک جگہ بنا کر مطمئن ہو گیا۔
اس کی انگلی دھیرے دھیرے ٹرانسنگر کی طرف بڑھی۔

گہری براؤن پیٹ اور کربیم کلر کی شرٹ میں ملبوس خدا کی ودیعت کردہ تمام تر ظاہری آرائشوں
رکش سے بھرپور وہ ادنیٰ پورا کزیل مرد چتر کا مجسمہ بن کر آخری بار اپنے گرد و پیش کو دیکھ رہا تھا۔
بابا بہت امیر یا رئیس تو نہیں تھے۔ ایک درمیانے درجے کے سرکاری آفیسر تھے۔ ٹھیک ٹھاک
لزارا ہو رہا تھا۔ گھر بھی ملا ہوا تھا اور میڈیکل کی سہولیات بھی میسر تھیں۔ انہیں آفس لانے لے جانے
کے لیے آفس وین آتی تھی۔ لہذا بچوں کو کسی چیز کی تنگی نہیں رہی تھی۔ وہ خوش تھے، مطمئن تھے، ہشاش
بشاش تھے۔

اس نے بابا کے سرکاری گھر کی مہربان اور مانوس دیواروں کو آخری بار دیکھا۔ ٹریگر پر رکھی انگلی کا
دباؤ بڑھتا چلا گیا۔

اسی دقت کسی نے بہت عجلت میں دروازہ کھولا تھا۔

اور پھر ایک زرد دروازہ کا ہوا۔

ریوالور چلنے کی آواز نے پورے گھر کے درد دیوار کو ہلا کر رکھ دیا۔

”کیا عذاب ہے، یہ بچن کا مین آج پھر بند ہو گیا ہے۔ ہر دوسرے ہفتے یہی بیماری پڑی ہوتی ہے۔ اس گھر میں پائپ لائن ڈالنے والا کسی دن میرے ہاتھ آ جائے ذرا۔ آدھے آدھے اچ کے پائپ فٹ کر رکھے ہیں۔ چار دن نہیں گزرتے اور کٹر بند ہو جاتا ہے۔ میرا تو خیال ہے، میں بچری چھوڑ کر پلمبری ہی سیکھ لوں اور اوپر سے یہ سزا احسن۔۔۔ بے انگ گیسٹ کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ اسے کم دے کر دوبارہ اس کی خبر ہی نہ لو۔ ایک تو محترمہ چھ ماہ تک لندن میں رہتی ہیں وہاں سے واپس آئیں، کبھی فلا نے فیٹیول کے لیے فرانس جا رہی ہیں اور ابھی ڈھکانے یونٹ کے لیے دہلی کے ٹکٹ بک کر بیٹھی ہیں۔ مزا تو جب آئے کہ ہر ماہ کرایہ لینا بھی بھول جایا کریں مگر کہاں وہ تو پکا یاد رہتا ہے۔ ہر ماہ پہلی کو ملازمہ دروازہ بجا رہی ہوتی ہیں۔“

شکا کا پارہ بری طرح چڑھا ہوا تھا۔ وہ برتن دھو کر رہی تھی، انہیں شیخ زیادہ رہی تھی۔

”مس مزنہ! ماہر سائیکا لو جسٹ، اسٹوڈنٹس آف ہوٹلنگ میڈیسن اسپیشلائز کورس، ہوٹلنگ میڈیکل سینٹر کے چیف ضار حسن کی چیتی کسٹنٹ۔ آپ ذرا اٹھ کر تھوڑی سی زحمت کریں گی، کہیں یہ ایک عدو پلمبر بلوائیجیے۔“

اب اس کی مخاطب کیس کی فائل میں سرویے بیٹھی مزنہ تھی۔

”اس سلسلے میں میری معلومات نہایت محدود ہیں۔ بہتر ہو گا تم غزل سے بات کرو۔“

”وہ اس وقت کسی گوشہ آرام و عیش میں خلوت میں کسی کے ساتھ ”غزل سرا“ ہوں گی۔ ان کا ڈسٹرب کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔“ شا کے لہجے میں طنز چل گیا۔

”ویسے مزنہ! ایسی لڑکیوں کے بارے میں تمہاری نفسیات اور روحانی طریقہ علاج کیا کہتا ہے؟ اپنی روح کو ایسی گندگی میں تھپڑ لیتی ہیں۔“ وہ اس کے پاس بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔

”بہت ساری وجوہات ہوتی ہیں اس کی۔ کہیں نسکین نفس، کہیں پیسے کی کشش، کہیں اپنے وابستہ رشتوں کی مجبوریاں اور کہیں مناسب ذریعہ روزگار حاصل ہونے میں ناکامی پر فزیشن مڈ لڑکیوں کے قدم اس طرف آنکلتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے ہمارے ہاں اس کی شرح دوسرے ممالک کی نسبت بہت کم ہے۔“

”کبھی ہوتی ہوگی کم مگر اب تو میسے اور چمک دمک کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک پار سا خوشی خود کو پیش کر رہی ہیں۔“ شاخنی سے گویا تھی۔

”جب میں اسٹار بن جاؤں گی تو کوئی نہیں پوچھے گا کہ میں نے کسیرہ مین، ڈائریکٹر یا ایکٹر کے ساتھ کتنے رنگین لمحات کیش کرائے ہیں۔“ سرخ کام والی دکتی ہوئی چولی اور گھاگھرے میں ملبوس اپنے قاتل بدن کے تمام شرسامان زاویے نمایاں کرتی غزل ابھی ابھی پچھلے گیسٹ سے کسی فوٹو گرافر کی گاڑی سے اتر کر اندر آئی تھی۔

”تو یہ۔۔۔ اس قدر بے ہودہ کپڑے زیب تن کر کے باہر جاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔“ اسے دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئی تھی۔

”ہمیں اخلاقیات کے سبق نہ پڑھاؤ۔ ہماری دنیا میں اخلاقیات نہیں ہوتی۔“ غزل تلخی سے

کراتے ہوئے اپنے بیڈ پر ڈھیر ہو گئی تھی۔

یہ ایک بہت بڑا ہال نما کمر تھا، جہاں تین بیڈ فاصلے سے سیٹ کیے گئے تھے۔ ہر بیڈ کے دونوں ریف سائیڈ ٹیبل تھے۔ کارپٹ گہرے نیلے رنگ کا تھا۔ ہال کمرے کے دائیں جانب چکن تھا اور بائیں ریف ہاتھ روم۔

وہ ایف ٹین کی شاندار کونھی کے پچھلے جانب بنے اس لکڑی گیسٹ روم میں مقیم تھیں۔ ظاہر ہے بچن اور ہاتھ دونوں دیسٹرن اسٹائل کے اور تمام تر تشریش سہولیات سے مزین تھے۔ گیسٹ روم میں اگلے کاراستہ پچھلے گیسٹ سے بنایا گیا تھا تاکہ مالک اور گریہ دار دونوں کی پرائیویسی برقرار رہے۔

گیسٹ روم کا ماہانہ کرایہ آٹھ ہزار تھا جسے پچھلے ڈیڑھ سال سے تینوں شیئر کر رہی تھیں۔ ”کیوں کرنی ہو ایسا تم؟“ مزنہ نے افسوس سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ تو پتا ہے کہ تمہارا بیک گراؤنڈ ایسا ویسا نہیں ہے کہ ”خون کا تقاضا“ سمجھ کر تمہیں تمہارے حال چھوڑ دیا جائے پھر خود کو کیوں گراتی ہوتا۔ کیا تم نے اللہ کو جان نہیں دینی؟“

”کون جانے ہم کہاں سے آگے اور کدھر جا کر پھیلیں پھولیں گے۔“ غزل نے اونچا سا قہقہہ لگایا۔ ”اور رہی بات جان کی تو اللہ تو تو ایک ہی بارویں گے مگر جب تک زندہ ہیں، اس پر دوسروں کا بھی تو

حق بنتا ہے۔“ غزل بڑے سکون سے مسکرائی۔ ”اے نیک سیبیو! وہ فریج کھول کر بوتل نکالنے لگی۔

”ویسے ایک لحاظ سے تو اچھا ہے تاکہ میرے جیسے مزاج کی لڑکی تم لوگوں کے ساتھ رہتی ہے۔ مجھے دیکھ دیکھ کے اور میری حرکتوں پر توبہ توبہ کرتے ہوئے میرے مقابلے میں تمہیں اپنا آپ بہت معتبر،

نیک اور شریف لگتا ہے۔ بے نا؟“ وہ پھر اونچے سروں میں ہنسی۔ ”دیکھ لو، میں نے مفت میں تمہیں اعلا درجے کا ذہنی سکون اور روحانی فخر عطا کر رکھا ہے۔“ وہ بچن کے سا کچ کا مخصوص ساخت کا خوب صورت سا گلاس لے کر آئی تھی اور اب اپنا پسندیدہ مشروب اینڈیل کر برف ملا رہی تھی۔

☆☆☆

”دیکھیے میڈم! ہم ٹریٹ منٹ کے لیے آئے ہیں، پیسے دیے ہیں، اپنے مسئلے کا حل چاہتے ہیں۔ ہم آپ سے وعظ سننے نہیں آئے۔“ گرے پیٹ شرٹ اور بلیک ٹائی میں ملبوس مرد نے تیز اور چبھتے ہوئے لہجے میں مزنہ کو مخاطب کیا تھا۔

”میں بھی مسئلے کا حل ہی بتا رہی ہوں مسٹر سفیان! تقریر کرنے کا شوق تو مجھے بھی کبھی نہیں رہا۔“ وہ نہایت پرسکون آواز میں گویا ہوئی۔

”اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ کے پیسے ضائع ہو رہے ہیں تو آپ کسی اور سائیکا لو جسٹ سے رجوع کر سکتے ہیں۔ وہ رہا ہا ہر جانے کا راستہ۔“ مزنہ کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ سفیان قدرے کھسیا گیا اور سر کے بالوں میں انگلیاں گھمانے لگا۔

”بات یہ ہے میڈم! کہ ہمیں یہاں ملک کے ایک بہت معروف سرجن نے آپ کی طرف ریفر کیا

ہی پھر کسی نے بہت آہستگی سے ریسیور رکھ دیا۔ مرنہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

”کون تھا فون پر؟“ اس نے ریسیور کرڈیل پر رکھتے ہوئے نظر ملائے بنا بظاہر بے نیازی سے پوچھا۔

”کوئی حمزہ علی تھے۔ آپ کی خیر خیریت دریافت کر رہے تھے۔ میں نے کہا آپ ہولڈ کریں، میں بلا دیتی ہوں۔ ہو سکتا ہے انتظار کرنے کے بعد لائن کاٹ دی ہو۔“ رضوانہ نے خیال ظاہر کیا۔

”لائن ہی تو نہیں کاٹی۔“ مرنہ نے دل میں سوچا تھا۔ پچھلے پانچ سال سے یہ تاہم، یہ انجانا سارا رابطہ اور رشتہ برقرار تھا۔

پانچ سال ہو گئے تھے اسے خوار ہوتے ہوئے زیت کے جنگل میں تنہا بھٹکتے ہوئے مگر وہ جہاں بھی رہی بغیر کسی براہ راست ملاقات یا بات چیت کے وہ اس کی خبر گیری کرتا رہا تھا۔

وہ جانتی تھی وہ اس کی پروا کیے بغیر رہی نہیں سکتا۔ وہ اسے بھول ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ بھی اس پانچ برس طویل اور صبر آزمائیت میں اسے ایک پل نہیں بھولی تھی۔ وہ بھول سکتی ہی نہیں تھی۔ ان کا اتنا غمیر ایسا نہ ختم ہونے والا رشتہ تھا کہ دونوں ہی نہیں بھلا سکتے تھے۔

”سز کہہ رہے ہیں، اگر آپ فارغ ہیں تو ان کے روم میں آجائیں۔“ ضرار حسن کے بلانے پر وہ کاؤنٹر سے سیدھی ان ہی کی طرف چلی گئی۔

”آئیے بی بی۔“ ضرار حسن ساٹھ سال کے بارش خوش وضع، نہایت دین دار اور اپنے پیشے سے عشق کی حد تک مخلص تھے۔ انہوں نے ہی ہولسٹک میڈیسن میں فرانس سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد

سید پور روڈ پر اپنا یہ چھوٹا سا ہسپتال کھولا تھا، جہاں دماغی و ذہنی امراض کے ماہرین کے ساتھ ساتھ روحانی اور نفسیاتی امراض کے ماہر ڈاکٹر تعینات کیے گئے تھے۔ ادارہ اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ تھا جس کے کچھ نئی مدت میں اپنی بہت اچھی ساکھ بنائی تھی۔

”ایک کیس ہے مرنہ بی بی! ایک انڈسٹریلسٹ کی بیوی شدید فرسٹریشن کا شکار ہیں، ان کی ذہنی حالت اس درجہ خندوش ہے کہ وہ گھر سے باہر نکلتا چھوڑ چکی ہیں وہ علاج کے لیے بھی ہسپتال آنے پر رضامند نہیں۔ آپ ذاتی طور پر ان کے گھر جا کر ان کے ساتھ سیشن کریں۔ ان کے شوہر میرے کلائنٹ رہ چکے ہیں اور انہوں نے مجھ سے خصوصی درخواست کی ہے۔ آپ اس ایڈرلین پر جانا پسند کریں گی؟“

”اگر آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے سر۔“ گاڑی تو اس کے پاس تھی ہی۔ سو خاموشی سے کارڈ اٹھا کر ان سے اجازت لے کر نکل آئی۔ یوں بھی اس کے ڈیوٹی اور زپورے ہو چکے تھے۔

☆☆☆

”اتنی لیٹ آئی ہو آج؟“ مرنہ کے ہارن بجانے پر شاگیت کھولنے آئی تھی۔ وہ گاڑی لاک کر کے پلٹی تو شانے فکر مندی سے استفسار کیا۔

”ہاں یار! وہ سر نے ایک ایسی ایپنٹ ڈم لگا دی تھی جسے اس کے گھر جا کر ڈیل کرنا تھا۔“

”مگر تم تو اس قسم کے کیس نہیں لیتیں۔“ دونوں باتیں کرتے ہوئے اندر آ گئیں۔

”لیٹی تو نہیں ہوں مگر سر نے کہا تو مجھ سے انکار نہیں ہوا۔ وہ میرے استاد بھی ہیں اور ایک لحاظ سے

ہے اور ہم اسی توقع پر آپ کے بلانے پر تیسرے سیشن کے لیے بھی آ گئے ہیں لیکن۔۔۔“

”ایک منٹ۔ سائیکالوجیکل ٹریٹ منٹ میں بعض اوقات ایک ایک ماہ تک سیشن کیے جاتے ہیں۔ یہ کوئی جسمانی عارضہ نہیں ہے کہ زخم بھر گیا تو ڈاکٹر صاحب ہاتھ جھاڑ کے فارغ ہو گئے۔ احساسات کو فرو کرنا اتنا آسان اور تیز رفتار نہیں ہوا کرتا۔ اب یہی مثال لے لیجئے سسٹمک ڈی سینس ٹائزیشن کا

پروکس بعض اوقات مہینوں لے لیتا ہے کیونکہ جتنے میں صرف دو یا تین بار آدھے گھنٹے کا سیشن کیا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ مریض کے فو بیایا اینزائی کو کم کیا جاتا ہے۔ اب ایک دم سے تو کچھ نہیں ہوا کرتا۔“

”میری سسٹر کا پراہلم یہ ہے کہ اسے بند جگہوں سے ڈر لگتا ہے۔ لفٹ میں سفر نہیں کر سکتیں۔ ٹیلی فون بوتھ ایمر جیسی میں بھی استعمال نہیں کریں گی۔ حتیٰ کہ ہاتھ روم جاتے ہوئے بھی خوف زدہ رہتی ہیں۔“

”اسے Clustro phobia کہا جاتا ہے اور اسی کو ختم کرنے کے لیے میں ڈی سینس ٹائزیشن کی ٹیکنیک استعمال کر رہی ہوں۔“

”تو پھر آپ صرف ٹیلیفون ڈیل کیجیے انہیں۔ ادھر ادھر کے لمبے چوڑے لیکچر نہ پلائیے۔ ان کے مسئلے کا حل نمازیں پڑھنے سے نہیں ملنے والا۔“ وہ بے پروائی سے گویا تھا۔ مرنہ نے بہت گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”نماز دل کا سکون ہے۔ بے شک دلوں کو سکون اللہ کو یاد کرنے سے ملتا ہے اور یاد کا سب سے اچھا ذریعہ نماز ہے۔ غالباً اسلام کی یہ تعلیمات اور احادیث آپ کی نظر سے بھی نہیں گزریں۔ خیر میں سچ

”چ“ ”واعظ“ بن کر آخرت کا ڈراوا دے کر آپ کے مزاج کو بگاڑنا نہیں چاہتی کیونکہ یہ باتیں آپ کی دلچسپی کی نہیں ہیں، البتہ آپ کی سسٹر کو یہ مشورہ ضرور دوں گی کہ بھلے مذہبی فریضے کے لیے نہ بھی ٹریٹ منٹ کی خاطر ہی سہی نماز پڑھ کے دیکھیں۔ ان کے منتشر خیالات، بکھرے ہوئے دل و دماغ اور بھٹی

سوچوں کو کنارہ مل جائے گا۔ جب اندر کا خوف نکل جائے تو باہر خود بخود عافیت دکھائی دینے لگتی ہے پھر بندہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ اس نے قلم بند کر کے فائل کے پیپرز کے سچ رکھا اور کرسی کی پشت سے سر نکالیا۔

”جی میں کوشش کروں گی، میں دوبارہ کب آؤں؟“ مریض خاتون نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ لیجیے اپنا کارڈ، میں نے تاریخ لکھ دی ہے۔“

”اوکے میڈم!“ سفیان کارڈ بہن سے لے کر دیکھتا ہوا آفس سے باہر نکل گیا۔ مرنہ نے ایک گہری سانس لے کر سر کو آگے پیچھے ہلایا اور پھر تھیلی پر ٹھوڑی رکھ کر کہنی میز پر نکالے کچھ سوچنے لگی۔

”میڈم! آپ کے لیے پھر فون ہے۔“ چپڑا سی نے دروازہ بجا کر اندر آ کر پیغام سنایا۔ وہ باہر کاؤنٹر پر آ گئی، جہاں ٹیلی فون آپریٹر رضوانہ اپنی خوش اخلاقی مسکراہٹ سمیت اس کی منتظر تھی۔

”ہیلو۔“ مرنہ نے میز پر رکھے ریسیور کو کان سے لگا کر اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے پرسکون انداز میں مخاطب کیا۔

”ہیلو۔“ اس کے لہجے میں استفہام تھا۔

”ہے۔۔۔ لو۔۔۔“ اب کی بار اس نے زور دے کر پوچھا مگر دوسری جانب بدستور خاموشی طاری

جائیں۔ نمود و نمائش کے لیے تو این جی او اور دیگر سماجی تنظیموں کے میلے ٹھیلے بہت ہیں، میں نے سمجھایا ہے کہ دولت کے اس بوجھ کو بہت تھوڑا سا اللہ کی مخلوق میں بانٹ کے دیکھیے، آپ کی بوجھل خود بخود ہلکی ہو جائے گی مگر شرط یہ ہے کہ یہ تقسیم اس طرح ہو کہ دامن میں ہاتھ سے دیں تو بائیں کو خبر نہ رود سری بات یہ کہ جو نعمتیں اللہ نے دے رکھی ہیں، ان کا شکر ادا کریں اور شکر ادا کرنے کا بہترین یتہ نماز ہے۔ لہذا نماز قائم کریں۔“

”جواب میں انہوں نے بڑبڑائیں کی؟“ ثناء نے پوچھا۔
”میرے سامنے تو نہیں کی البتہ دل میں ضرور کی ہوگی۔“

”ضرر احسن نے بہت پہلے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں تذکرہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ بچپن نماز اس طرح قائم کرتے تھے کہ ان کے والدین نے ان کے ذہن میں ڈال دیا تھا، اگر کوئی نماز چھوڑے تو ضرور تہہ ہارے ساتھ کچھ برا ہوگا یا امتحان میں فیل ہو جاوے گا یا استاد سے کسی بات پر ڈانٹ کھاؤ یا دوست تم سے ردھ جائیں گے۔ اس لالچ اور خوف کی بنا پر وہ نماز کی پابندی کیا کرتے تھے پھر جوں بڑے ہوتے گئے ان کی یہ سوچ پختہ ہوتی گئی۔ وہ آج بھی اپنے ساتھ ہونے والے ناپسندیدہ نئے کو اس بات سے جوڑتے ہیں کہ آج فلاں نماز نہیں پڑھی یا بے دلی سے پڑھی تھی، اس لیے میرے ساتھ ایسا ہوا۔ اس طرح انسان لاشعوری طور پر اپنے فائدے اور بہتری کے لیے نمازوں کی پابندی رکھتا ہے۔ میں بھی کئی برسوں سے یہی کر رہی ہوں۔“ وہ ہنس پڑی تھی۔

☆☆☆

گرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ پارکنگ ایریا میں آکر گاڑی کھول کر اندر بیٹھی تو ایک دم پیش کا احساس واقعہ۔

”مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ وہ پارکنگ سے گاڑی نکال چکی تھی۔

”اس کو فون کرنا چاہیے، یہ کہنے کے لیے کہ میرا یہ خاموش خیال کرنا چھوڑ دے۔ سمجھ لے کہ ہم میں کوئی رشتہ نہیں تھا۔ یوں بھی رشتہ کہاں ثابت ہوتا ہے۔ جو سمجھا تھا، وہ سراب نکلا، جھوٹ اور فریب نکلا پھر یہ بے وجہ کا تعاقب اور خبر گیری کیوں؟“

وہ خود سے الجھتے ہوئے بے دھیانی کے عالم میں اسلام آباد ہائی وے پر گاڑی دوڑا رہی تھی۔ عصر کے بعد کا ٹائم تھا۔ بڑا ٹھہرا ٹھہرا، دھیمسا سا اجالا اور نرم و لطیف ہوا بحر طاری کر رہی تھی۔

”وقت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میرے اطراف میں جلوہ گر ہے پھر مجھ میں صحرا جیسی پیاس اور سناٹا کیوں اتر آیا ہے۔“

اس نے کچھ سوچ کر آئی ایٹ تھری کی طرف گاڑی موڑ دی۔

”علی انکل گھر پر ہیں؟“ اس کے تیل بجانے پر ان کا نوکر باہر آیا تھا۔

”جی اسٹڈی میں ہیں۔“ وہ ان کے اسٹڈی روم ہی چلی آئی۔

”میں بہت پریشان ہوں علی انکل۔“ وہ بغیر کسی تمہید کے سلام دعا کے بعد بولی۔

علی انکل، بابا مرحوم کے گھر سے دوستوں میں شمار ہوتے تھے اور ان کے تمام تر رازوں کے امین

محسن بھی کہ انہوں نے چار سال پہلے ایک قطعی انٹری لڑی کو اپنے ہاں جاب دی جس کا ایم ایس سی سائیکالوجی کا ابھی رزلٹ بھی نہیں نکلا تھا۔ آج چار سال بعد میں اپنے شےجے میں کتنا تجربہ حاصل کر چکی ہوں۔

اسپشلائز کرنے اور ایم فل مکمل کرنے میں بھی ان ہی کا ہاتھ تھا۔ یہ ان ہی کی مشفقانہ حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ آج نہ صرف تعلیم اور اچھی پوسٹ حاصل کر چکی ہوں بلکہ ایک عدد گاڑی کی بھی مالک بن چکی ہوں۔“

”ارے بھئی! اتنے برسوں سے کما رہی ہو، کوئی آگے پیچھے تو ہے نہیں جس پہ لگاؤ۔ رقم کو جمع ہی ہونا تھا پھر تم نے جمع شدہ رقم کو گاڑی میں تبدیل کر دیا۔“

”کھانا کیا پکایا ہے۔ سخت بھوک لگ رہی ہے۔“ مزہ خلاف مزاج بے صبری کا مظاہرہ کر گئی تھی۔
ثنا جلدی آجاتی تھی اسکول سے، اس لیے رات کے کھانے کی ذمہ داری اسی نے اٹھا رکھی تھی۔
رہی غزل تو اس کا موڈ ہوتا تو کھانے میں ہاتھ بٹا دیتی، نہیں تو اپنے اوٹ پٹانگ مشغلوں میں مست رہتی۔ شا کو ویسے بھی گھر کے کام کاج کا شوق رہا تھا، اس لیے غزل کے عدم تعاون کا گلہ یا غصہ نہیں کرتی تھی۔

”مسالے والی بھنڈی بنائی ہے۔“

ویسے محترمہ کو عارضہ کیا ہے؟“ ثنا اس کے کیمز میں ہمیشہ گہری دلچسپی رکھتی تھی۔

”ڈپریشن۔“ اس نے اختصار سے کام لیا۔

”کس چیز کا۔۔۔؟“

”کچھ نہ کرنے کا ڈپریشن۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ ثناء نے آنکھیں پٹیائیں۔

”اپنے Worth less (بے کار) ہونے کا ڈپریشن۔ ثنا! کام کرتے رہنا ہماری مادی ضرورت

ہی نہیں ہے، ذہنی ضرورت بھی بن چکا ہے۔ انسان جب کوئی کام کر رہا ہوتا ہے تو اسے اپنی اہمیت اور ذات پر اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہنر پر بھروسہ کرنا سیکھتا ہے۔ سچ پوچھو تو مصروفیت اور ہلکی چھلکی پریشانیوں زندگی کو بھرپور طریقے سے گزارنے کے لیے بہت ضروری ہوا کرتی ہیں کیونکہ مسائل سے لڑ کر ہم میں اپنی ذات کا فخر اور مضبوطی جاگتی ہے۔ کام کی ذمہ داری ہو تو ہمیں اپنا آپ معتبر اور کارآمد محسوس ہوتا ہے۔ مسز دیم کو سب کچھ حاصل ہے۔ بے پناہ دولت، پرنسپل محل نما گھر، بے شمار نوکر چاکر اور ہر آسائش پھیلی کے نیچے منتظر پڑی رہتی ہے۔ شوہر دن رات برس برس بڑھانے میں لگا رہتا ہے۔ بچے آئیے پال پوس کے اس قابل کر دیے کہ انہیں بورڈنگ میں ڈالا جاسکے۔ سو یہ موصوفہ فارغ کی فارغ۔ اتنی فراغت رہے گی تو ذہن تو اچھے گا۔ تم نے سنا نہیں خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ وہ بھی فضول اور بے کار سوچوں میں الجھ کر ذہنی مریض بن گئی ہیں، جیسے سائیکالوجی میں ڈپریشن کہا جاتا ہے۔“

”تم نے ان کو کیا مشورہ دیا؟“ ثناء نے ٹھوڑی پھٹیلی پہ ناکا کے اشتیاق سے پوچھا۔
”کچھ ایسے کام کرنے کو جو صرف اور صرف اللہ کو خوش کرنے اور اس کی مخلوق کی بھلائی کے لیے

بھی رہے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی کے باپ تھے۔ تینوں شادی شدہ تھے لڑکے امریکہ میں سیٹل تھے اور بیٹی کراچی بیابانی گئی تھی۔ بیوی کو چند سال پہلے فالج ہو گیا تھا، سو وہ بستر اور اپنی خادمہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔

”کمال ہے، ایک روحانی نفسیات کا معالج بھی پریشان ہو سکتا ہے۔“ وہ ازراہ تفنن چھیڑ خانی کر رہے تھے۔

”جی ہاں کیونکہ وہ بھی انسان ہوتا ہے۔“ وہ خفگی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”اچھا۔۔۔ یہ آج کی تازہ خبر ہے۔ ویسے اس پریشانی کا نام حزنہ علی تو نہیں ہے؟“

”بڑی گہرائی تک پہنچ کر کھوج لگایا تھا۔ حزنہ اضطرابی انداز میں ابھر اُدھر دیکھنے لگی۔

”مجھے بھی فون کرتا رہتا ہے وہ۔“ چند لمحوں کے مکمل سکوت کو علی انکل کی سنجیدہ آواز نے توڑا تھا۔

”کیوں؟“ بے اختیار اس نے سزا اٹھایا۔

”تمہارے بارے میں ہدایات نشر کرنے اور تم سے باخبر رہنے کے لیے۔“ انہوں نے سگار منہ

میں دباتے ہوئے کہا۔

”اور میں پوچھتا ہوں برخوردار! جب کوئی رشتہ نہیں رہا تو کیوں اتنی دور بیٹھ کے بے تاب رہتے

ہو۔ ویسے تم نے بھی حماقت کی مزہ؟“

”نہیں انکل!“ اس نے تڑپ کر کہا۔

”میں مرکز بھی تصور نہیں کر سکتی تھی کہ۔۔۔“ وہ چپ ہو گئی۔

”وہ بات مرینے کی نہیں جینے کی تھی، زندگی گزارنے کا ڈھنگ تھا۔ کسی طرح کی کوئی قانونی و

معاشرتی رکاوٹ نہیں تھی۔ رکاوٹ تمہارے جذبات بنے تھے۔ تم دونوں کے غیر عملی نظریات نے یہ دن

دکھائے۔ کیا کچھ انوکھا ہونے چلا تھا؟ سب کچھ ایسا ہی تھا جو ایسے کیسز میں ہوا کرتا ہے۔ ہو جاتا ہے۔“

”میں آپ سے اپنی پریشانی شیئر کرنے آئی تھی، ڈانٹ کھانے نہیں آئی تھی۔“ وہ بسورتے ہوئے

بولی۔

”دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلیں گی۔ اس وقت میرے ساتھ کچن تک چلو، میں نے ایک بڑی

مزے دار دُش بنائی ہے۔ یہ نہایت خوش گوار اتفاق ہے کہ تم ادھر چلی آئیں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

کھانا بنانے اور اس میں درائی لانے میں علی انکل کو کمال حاصل تھا۔ آئے دن نت نئے تجربے

کرتے رہتے تھے۔

”بات یہ ہے بیٹا جانی کہ!

یہ زندگی ہے تو پھر اس کو بسر بھی کرنا ہے

قیام کرنے سے پہلے سفر بھی کرنا ہے

کچھ احترام بھی کرنا ہے اس گلی سے ہمیں

کسی بہانے ادھر سے گزر بھی کرنا ہے

وہ بھی جی کر رہا ہے اور تم بھی۔ حالانکہ دونوں ہی یہ بات سمجھتے ہو کہ یہ تعلق ٹوٹنے والا نہیں ہے۔

س کا کوئی انجام ہونا چاہیے۔“ وہ ششے کا باؤل فریج سے نکال رہے تھے۔

”یہ کیا ملغوبہ ہے؟“ اس نے پنک کریمی سے آمیزے کو شوق سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”بد ذوق لڑکی! یہ فروٹ ٹرائفل ہے اور میری ہاتھ کی وہ اسپیشل چیز ہے جسے ہر کوئی پسند کرتا ہے اور

مان آتے ہیں، ضرور اس کی فرمائش کرتے ہیں۔“

وہ چھوٹی سی ششے کی خوب صورت پیالی میں ٹرائفل نکالنے لگے۔

”بیٹا کیا کیسے ہے؟“ اس نے چکھا تو بے اختیار پوچھ لیا۔

”تمہیں پسند آیا؟“ وہ خوش ہو گئے۔

”بہت بڑی لذیذ چیز ہے۔ اس میں سیب، کیلا اور انار ڈالے ہیں نا۔“

”ہاں۔“ پھر وہ اسے مکمل ترکیب سمجھانے لگے۔

”یہ تو بہت آسان ترکیب ہے۔ میں بھی ٹرائفی کروں گی۔“ شاکو بتاؤں گی۔ اسے فارغ وقت میں

ربات کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔“

”یہ شادی لڑکی ہے نا جس کی اپنے خاوند سے علیحدگی ہو گئی ہے؟“ وہ علی انکل سے ہر بات ڈسکس

ر لیتی تھی۔ یہ بھی اسی نے بتایا تھا۔

”جی انکل! آگے پیچھے تو کوئی تھا نہیں جس کے پاس جاتی یا رہتی۔ زندگی گزارنے کے لیے کوئی

مکان نہ تو چاہیے تھا۔ کیا آنٹی نے ٹرائفل چکھا ہے؟“

”نہیں، ابھی تک تو نہیں۔“

”ٹھیک ہے، میں انہیں دے آتی ہوں اور مل بھی لیتی ہوں۔ اس کے بعد واپس چلوں گی۔“

”ذرا دیر تو رکو۔۔۔“

”نہیں، شاکا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس نے اسکول سے بھی چھٹی کی ہے آج۔ غزل تورات کو دیر

سے آئے گی۔ شاکا کی ہوگی۔“ وہ اس کی تیارواری کے خیال سے غلٹ میں وہاں سے نکلی تھی۔ گھر آئی تو

شاکا بخار سے تپ رہی تھی۔

”ارے، تمہیں تو اچھا خاصا مہر پچر ہو رہا ہے۔“ وہ تھرما میٹر چیک کرنے کے بعد پریشان ہو کر شاکا

کو دیکھنے لگی۔

”ہم جیسوں کو نزلہ بخار کیا کہتا ہے حزنہ بی بی!“ شاکا ہمت کر کے بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا

کے بیٹھ گئی۔

”دوپینا ڈول کھائی ہیں، چائے تم پلا دو۔ دو تین گھنٹوں میں پسینہ آجائے گا تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔

ہم تو عادی ہیں ایسی معمولی بیماریوں کے۔“ وہ نقاہت سے بولی۔

”تمہیں پتا ہے حزنہ! جب میری اور ایاز کی شادی ہوئی تو اس وقت میرے کیا خواب تھے؟ ایک

برسکون اور نیار بھرا گھر، مناسب سہولتیں، ذمہ داری نبھا کر سکون کی بے فکر نیندیں اور رشتوں کا تحفظ۔ تم

تو جانتی ہو میری اور ایاز کی لومیرج تھی۔ اچھا یہ ہوا کہ والدین بھی مان گئے۔ یوں شادی ہو گئی۔ بے انتہا

خوشیوں اور خواہشوں کے جھرمٹ میں۔“

دہ ماضی کے مرغزاروں میں اترنے لگی۔

”جانتی ہو پھر کیا ہوا؟“

”ہاں ہاں جانتی ہوں۔ تم خواخوہ اپنا دماغ نہ الجھاؤ۔ چلو شایاش لیٹ جاؤ۔۔۔“ مرنہ چاہتی تھی دہ ماضی کی نیخیاں یاد کر کے خود کو دکھی نہ کرے لیکن دہ نہیں اور جا بچتی تھی۔ اس کی نظریں خلا میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ بکھرے ہوئے بالوں کی لٹیں گلے کے اطراف میں جھول رہی تھیں۔ دہ ملگجے سے سبز شلوار قمیص میں بلبوس تھی۔ سانولا چہرہ اس دقت بڑا پھیکا اور بے رنگ ہو رہا تھا۔

”پھر یہ ہوا کہ ایک ایک کر کے ایاز کے چہرے کے سارے نقاب اتر گئے۔ میں سمجھتی تھی دہ بہت حساس، مختی اور ذمہ دار مرد ہے۔ ایک عورت ایسے ہی بھرپور مرد کے خواب دیکھتی ہے۔ لیکن دہ تو کچھ اور ہی نکلا۔ دنوں میں اس کی حساسیت بے حس میں بدل گئی۔ اس کا مختی پن، کاہلی و آرام طلبی کے روپ میں ڈھل گئی۔ تب مجھے پتا چلا کہ مرد عورت کے دل شکار کرنے کے لیے بڑی ہوشیاری سے اس کی پسند کا چولا پہنتا ہے۔

پھر جب اس عورت کو حاصل کر لیتا ہے تو اپنے اصلی رنگ ڈھنگ میں آجاتا ہے۔ عورت سمجھتی ہے مرد بدل گیا ہے۔ حالانکہ وہ بدلتا نہیں ہے۔ اپنے اصل یہ داپس لوٹتا ہے۔“ دہ خنکی سے ہنسی۔

”سسرال والوں نے اس پر دباؤ ڈالا تمہاری نوکری تو چھٹ گئی ہے مگر تمہاری یہ ایم اے پاس بیوی کس دن کام آئے گی۔ اس سے کہو نوکری کرے۔ سو میں نے نوکری کر لی۔ کیونکہ ایاز پر ماں باپ کے علاوہ تین جوان بہنوں اور چار بھائیوں کی ذمہ داری تھی۔ میں نے اس اسکول میں نوکری کی جہاں دو شفٹیں لگتی تھیں۔ صبح اور شام کی۔ زیادہ کمائے کے چکر میں میں نے دونوں شفٹوں میں جاب کر لی۔ تنخواہ دینی ہو گئی۔ ایاز جو عارضی طور پر چھوٹی موٹی نوکری کر رہا تھا دہ مزید ریلیکس ہو گیا۔ بس ہوا یوں کہ میری جان شکنجے میں آ گئی۔ ایسی حالت میں عورت کا جی اور سا ہو جاتا ہے۔ خواخوہ کھلتی ہے۔ ذہنی و جسمانی طور پر کمزور پڑ جاتی ہے۔ ایک طرف دد شفتوں کی لمبی ڈیوٹی پھر گھر آ کر ایاز کی جلی جلی اور سسرالیوں کے طعنے کہ صبح سات بجے نکلتی ہے رات کے سات بجے گھر میں قدم رکھتی ہے۔ گھر کا کچھ ہوش ہی نہیں ہے۔ حالانکہ میں داپس آ کر جتنا مجھ سے ہوتا تھا گھر کے کام نبھاتی تھی۔ اکثر رات کو ویر تک ڈسٹنک، واشنگ اور برتن جھاڑ دغیرہ کے کام نبھانے کے بستر پہ آتی تھی۔

چلو سسرالی نہیں تو دکھ نہیں ہوتا، مگر اپنا خاندان ہی اپنی ذمہ داریاں نہ سمجھے تو کس کو کہیں۔ بعض اوقات پوری پوری رات ہماری بحث دسبائے میں گزر جاتی تھی۔ تنخواہ آتی تو میں اسے سو نکھے بغیر ایاز کی ہتھیلی پہ رکھ دیتی تھی۔ مگر پھر بھی میرا مقام اس گھر میں ایسا تھا جیسے کوئی بے کار استعمال شدہ ہوا کپڑا، خاندان کھتا تھا گویا میں عیاشی کر کے آئی ہوں باہر سے۔ نتیجہ اس ٹینشن کا یہ ہوا کہ دقت سے پہلے میرے ہاں بچے کی ولادت ہو گئی مگر دہ زندہ نہ بچ۔ کا اور پھر کچھ ایسی پیچیدگی ہوئی کہ میں دوبارہ ماں بننے کے قابل نہ رہی۔“

”ہاں، ہاں سب جانتی ہوں میں۔ کیوں یاد کر کر کے اپنے زخم کریدتی ہو۔ اچھا کہو تو تو دی لگا دوں؟“ مرنہ اس کا دھیان بٹانا چاہتی تھی۔

”ڈیڑھ سال مزید گزرا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایاز کا دہی کا دیز الگ گیا۔ میں نے سارا زور بچ

کے ٹکٹ دیزے کے پیسے پورے کیے۔ دہ دہی چلا گیا۔ میں پیچھے اپنے سسرال کو پالتی رہی۔ ایاز کا کام جم گیا اور گھر میں پیسے آنے لگے تو میں نے ارادہ کیا کہ اب یہ ڈبل شفٹ کا کام چھوڑ دے۔ ساس سسرنا راض ہونے لگے۔ لیکن سچ تو یہ تھا کہ اب مجھ سے اتنی مشقت نہیں ہوتی تھی۔ ایاز اچھی خاصی رقم بھیجتا تھا جو گزارہ کرنے کے لیے بہت کافی تھی اس لیے میں نے دوسری لی جاب چھوڑ دی۔“ دہ سانس لینے کو رکھی۔

مرنہ متاسفانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کچھ ہی عرصہ بعد اطلاع آ گئی کہ ایاز نے دہی میں کسی پاکستانی فیملی میں شادی کر لی تھی۔ دہ پس آ یا تو اس حسینہ کو ساتھ لے کے آیا اور اپنے والدین کے کہنے پر مجھے طلاق دے کر فارغ کر دیا۔ اب میری ضرورت نہیں رہی تھی۔ انہوں نے کہا ”تم بانجھ ہو۔ اولاد تو تم سے ہو نہیں سکتی پھر اہ باندھنے کا فائدہ۔ یوں میں چار سال بعد طلاق کا ٹیکہ مانتے پہنچائے اس گھر سے نکل آئی۔ ماں با انتقال ہو چکا تھا۔ گھر کرائے کا تھا۔ کس کے پاس جاتی سوا دھر چلی آئی۔ نوکری تو شکر ہے جاری۔ ہاں دوبارہ سے سیکنڈ شفٹ بھی جوائن کرنی۔ جتنی فرصت ملتی دکھاتے ہی دل کو چھیدتے تھے اس۔۔۔“ شاتھک کر چپ ہو گئی۔

مرنہ نے ٹی دی لگا دیا تھا۔ کوئی دلچسپ سا ڈرامہ آرہا تھا جسے دنوں عدم دلچسپی سے دیکھنے لگیں۔ ”بعض اوقات کسی بھی چیز میں دل نہیں لگتا۔ ہے نا؟“ تنائے نے دوبارہ مرنہ کو مخاطب کیا۔ ”کوئی اہ کوئی منظر دل پہ چھائی یا سیت اور مایوسی کو دور نہیں کر پاتا۔“

”اگر تم پسند کر دو تو میں تمہارے لیے گرم گرم سویا بنادوں؟ تمہاری طبیعت ایک دم سنبھل جائے۔“ دہ جان بوجھ کر اس موضوع پر دھیان نہیں دے رہی تھی تاکہ شامزید بددلی اور رنجیدگی کا شکار نہ

”مرضی ہے تمہاری، میرے نزدیک تو یہ خواخوہ کا تکلف ہوگا۔ میرا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔“ ”میرے ہاتھ کی بنی سوتیاں کھاؤ گی تو خود بخود جی چاہنے لگے گا۔“ مرنہ اٹھ کے کچن میں چلی گئی۔ سویا بنانے لائی تو غزل بھی آچکی تھی۔ اس کی اور ثنا کی نوک جھونک حسب معمول عروج پر تھی۔ ”کیوں خواخوہ ٹکے ٹکے کے لوگوں کے آگے اپنا آپ گردی رکھتی ہو۔ اپنی عزت نفس کو ان کے زور قدموں کے نیچے پکڑاؤ گی۔“ مرنہ نے غزل سے کہا۔

غزل کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

”سال ڈیڑھ سال ہونے لگا ہے، تمہیں ایک اسٹوڈیو سے دوسرے اسٹوڈیو میں رولتے اور بے

دل ہوتے ہوئے۔ کیا حاصل ہوا ہے بھلا۔“ ثنا آج اسے کھری کھری سنانے پر تلی ہوئی تھی۔

”تم دونوں مل کر کیوں مجھے ذہنی تیار کر رہی ہو۔“ دہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھنے لگی۔

میک اپ کی تہوں کے پیچھے کچھ چھ رہا تھا۔

”ہونہہ خلیس۔۔۔ خواخوہ چڑیلوں کی طرح میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں دونوں۔“ دہ بڑبڑاتے

ہوئے ٹیپ آن کرنے لگی۔
”ہر کام کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔“ مزہ نہایت غور سے غزل کو تیز میوزک پر قہقہہ پرکیش کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”میرے کسی فعل کی کوئی وجہ نہیں ہوا کرتی۔“
غزل تھک گئی تو کیسٹ بند کر کے وہم سے اس کے پاس آگری۔
”تم اپنے سوتیلے باپ کی مذموم حرکت کا انتقام خود سے لے رہی ہو۔“ مزہ نے آہستگی سے کہا۔
غزل کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے کانپتے ہاتھوں کے ناخن چبانے لگی۔

”مت یاد دلاؤ مجھے کچھ بھی۔“ اس کی آواز مرتعش تھی۔
”مجھے بھی نہیں پتا تھا، مجھے تمہاری زبانی پتا چلا سب کچھ۔“
”کب۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا پتا چلا۔۔۔“ وہ اس سے رخ پھیر کر پوچھنے لگی۔
”کل تم رات کو اپنے لاشعور میں بھٹک گئی تھیں۔ اسی دوران تم نے اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں انکشافات کیے۔“

”کیا انکشافات کیے میں نے؟“ وہ بری طرح گھبرا گئی۔
حیرت کی بات یہ تھی کہ اپنے غیر شرعی اور غیر اخلاقی افعال پر فخر اور ڈھٹائی سے ہنسنے والی لڑکی اپنے ماضی کے اس شرم ناک حادثے پر نظر نہیں ملتا رہی تھی۔ جس میں اس کا کوئی دوش نہیں تھا۔

”تم نے بتایا کہ تمہاری ماں نے دوسری شادی جس آدمی سے کی تھی وہ پرلے درجے کا عیاش اور شرابی انسان تھا۔ تمہاری امی کو بھی شادی کے بعد ہی پتا چلا۔ پھر ایک حادثے میں تمہاری امی کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت تم سینکڑا ایریز میں تھیں۔ تمہارے سوتیلے باپ نے ایک دن شراب کے نشے میں دھت کر تمہیں اپنی ہوس کا نشانہ بنالیا۔ اس حادثے نے تمہیں وہی دور وحانی طور پر تباہ کر دیا تم کئی ہفتے ہسپتال میں رہیں پھر صحت یاب ہوتے ہی سوتیلے باپ کا گھر چھوڑ کر دارالامان چلی گئیں اور وہاں جا کر مجھ پر ایسے بہت سے سوتیلے باپ ٹکرائے جن کو ادارے کے مالکان کے حکم اور زور و زورستی پر تمہیں خوش کر پڑا۔ پھر کافی جدوجہد کے بعد ایک ٹریولنگ ایجنسی میں نوکری حاصل کی اور پھر دارالامان چھوڑ دیا۔ یہاں کرایہ پر رہنے لگیں۔ پھر جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا تم نے اس کا انتقام خود سے لینا شروع کر دیا۔

غزل! پہلی بار ظلم معاشرے کے افراد نے تم پر کیا اور اس کے بعد متواتر ظلم تم خود اپنے وجود اور روح پر کر رہی ہو۔ ماضی کے بھانک اور افیت ناک پرچھائیوں سے پیچھا چھڑانے کا یہ طریقہ سراسر اور گناہ ہے۔ ہم نے بھی اپنا ماضی پھولوں کے بستر پر نہیں گزارا۔ جانے کون کون سے بل صراط عبور کے یہاں تک پہنچے ہیں۔ راستے کی مشکلات کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ انہیں دور کرنے کی بجائے راہ ہی بدل لیا جائے۔ سیدھی پٹری چھوڑ کے پچھتاوے کی ٹرین پکڑ لی جائے۔

”تمہارا مطلب ہے وہاں رہ کر ان کی مرضی سے اپنا آپ فروخت کرتی رہتی؟“ وہ سرخ چہرہ آگ برساتا لہجہ لیے مزہ کی طرف پلٹی تھی۔

نہیں۔۔۔ تم ان کے چنگل سے آزاد ہو کر یہاں رہ کر ایک شریفانہ اور باوقار زندگی کا آغاز اس غلاظت میں نہ دھنستیں۔“

مگر کس برتے پر؟“ استہزاء بولی۔
”ٹریولنگ ایجنسی میں مجھے نوکری میری اعلیٰ تعلیمی اسناد کی بنا پر نہیں ملی تھی، مالکان کو بھانپنے اور ادائیں دکھانے پر ملی۔ وگرنہ ایف اے پاس لڑکی جاب کے میدان میں کس جگہ فٹ بیٹھتی بی جانتی ہو۔“

”یہ ضروری تو نہیں تھا کہ تم کسی آفس میں ہی جاب کرتیں۔ کوئی اسکول دیکھ لیتیں۔“
”ہاں اور وہاں سے ملنے والے اٹھارہ سو یا زیادہ سے زیادہ دو ہزار میرے لیے بہت کافی رہتے۔“
خیز انداز میں سر ہلانے لگی۔

”ڈھاکا ہزار تو اس جگہ رہنے کا کرایہ ہے۔ پھر کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، اور ہزار ضروریات زندگی یہاں سے پوری ہوتیں۔“

”تم اپنے گناہ کو جائز فعل قرار دینے کے لیے فضول دلیلیں دے رہے ہو۔ اگر خواہ کم ملتی تو تم کسی نے موٹے علاقے میں رہائش پذیر ہو جاتیں۔ جہاں کرایہ بھی کم ہوتا پھر بتدریج بی اے کر کے کسی سکول میں ایلائی کر دیتیں۔“

”ہاں تمہاری جیسی مصلح اعظم کے لیے یہ کہنا بہت آسان ہے۔۔۔“ وہ تلخی سے بولی۔
”خود پوچھتی ہوئی تو پتا چلتا۔“

”خود پوچھنا تو جانے کیا کیا بیت چکی ہے۔ اب میں تم سے کیا بحث کروں۔“ مزہ کے چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ جھلک دکھا کر معدوم ہو گئی۔

”بہر حال تو بے کادر آنکھ بند ہونے سے پہلے تک ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ اب بھی وقت ہے۔“
”کون سا وقت؟ میرے لیے اب کوئی وقت نہیں ہے۔“ وہ یاسیت سے گویا ہوئی۔

”بے عصمت اور بے نام و نشان لڑکی ہوں۔ مشہور زمانہ ہو چکی ہوں۔ اپنا قیمتی سرمایہ پانی کی بے دریغ بہا چکی ہوں۔ اب اس معاشرے میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں بچی۔ مجھے خواہ وہ کسے نہ دو۔۔۔“ اس کے لہجے کی شکست اس کے اندر کی توڑ پھوڑ عیاں کر رہی تھی۔

”مگر جگہ تو وہ بھی تمہارے لیے نہیں ہے، جہاں جا کر تم اپنا آپ خوار کرتی ہو۔ اس اندھیر نگری کا پھوڑو۔ اس میں تمہارے بھلائی ہے۔“

مزہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اسے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔
”میری بھلائی تو کسی چیز میں بھی نہیں رہی بھولی لڑکی۔“ وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی تھی۔

”میری فلاح کے راستے تو کب کے بند ہو چکے۔ بہر حال اس لا حاصل بحث کو جانے دو۔ ثابتاہم کی گروسی کا سامان لانا ہے۔ گاڑی تو ہے تمہارے پاس چلو چلتے ہیں۔ مجھے اپنے لیے کچھ ڈریسز دیکھنے ہیں، بلکہ تم لوگوں پہ کچھ فیاضی کرتے ہوئے میں ”ٹریپیڈ“ سے ہلکا پھلکا ڈز بھی پیک کرالوں۔“

رحماد میری دو شریٹیں ہیں۔ ایک تو وہ صرف چند دنوں یا ہفتوں کا ہو۔ دوسرا جس کے بارے
یقین ہو کہ وہ شریف ماں باپ کا خون ہے، اور اس کے ماں باپ یا والی وارث اس دنیا میں
ہے ہوں مجھے وہی بچہ چاہیے جو میری شرائط پر پورا اترتا ہو۔“

ایک ہے۔ میں علی سے بھی مشورہ کروں گا۔ اسی نے مجھے یہ حل بتایا تھا۔“

بالآخر ایدھی ہوم میں انہیں مطلوبہ بچہ مل گیا۔ مگر وہ چھوٹی سی تھی سی پری تھی۔
ایک سینڈ میں ماں باپ ہلاک ہو گئے، بچی معجزانہ طور پر بچ گئی تھی۔ دس دن تک ماں باپ
سر خانے میں پڑی رہیں اخبار میں ان کے آئی ڈی کارڈ بھی چھاپے گئے مگر کوئی پوچھے نہیں آیا
نہ سمجھ کر دفن دیے گئے۔ کچی کچھ دن پہلے ہمارے پاس آئی ہے۔ اس کی عمر اندازاً تین مہینے
ظامیہ کے سربراہ نے آگاہ کیا۔

رئی نے نازک سے نقش و نگار والی اس گلابی گل گوتھنا سی بچی کو دیکھا تو اس کا جی قابو میں نہ رہا۔
وہیں اٹھا کے سینے سے لگا لیا۔

سریہ بچہ کسی طرح نہیں بہل رہا۔ “آیا ڈھائی سالہ دکش صورت اور سنجیدہ تاثرات کے حامل ایک
وہ تھا سے عاجز ہو کر اندر آئی تھی۔ بچے کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔
’ہر طرح سے کوشش کر لی ہے مگر اس کا ردنا ختم نہیں ہو رہا۔“ آیا تفصیل سے اپنا دکھنا سنا رہی

’کون ہے یہ۔۔۔“ حماد بہت غور سے اس کو دیکھ رہے تھے۔

’جناب پچھلے ہفتے پنڈی میں بم دھماکا ہوا تھا۔ بچہ کار میں تھا۔ جو کہ اس شاپنگ ایریا سے کافی دور
ن گئی تھی۔ اس لیے بچہ گیا۔ اس کا باپ اور ایک دو مزید لوگ اس دھماکے میں ختم ہو گئے۔ ماں تو

اب ہی انتقال کر گئی تھی۔ باپ بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ یہ بہت سہا ہوا ہے۔“
’اسرئی غور سے دیکھتو ذرا۔“ حماد جیسے خواب میں بول رہے تھے۔ “کتنا پیارا اور من موہنا چہرہ

”اس کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں حماد!“ اسرئی ان کی بیوی تھی کیسے خاوند کی سوچ نہ پڑھتی۔ بے
وہ بھی ہو گئی تھی۔

”ٹھیک تو ہے نا ایک بیٹا، ایک بیٹی۔ ہمارے دو بچے ہو جائیں گے، فیملی مکمل ہو جائے گی۔“ وہ
ناتھی۔

”اللہ آپ کو آپ کے نیک ارادوں کی جزا دے۔“

انتظامی سربراہ نے مختلف پیپر پرسائن لینے کے بعد انہیں رخصت کر دیا۔
گھر میں بچے کیا آئے جیسے درو دیوار سے رونقیں، چہکریں اور زندگی کے ترم رنگ پھوٹے

ان کو ذرا سی تکلیف ہوتی تو وہ ہلکان ہو جاتی تھی۔
کبھی تھک جاتی تو حماد سے شکایتیں کرتی۔

مزنہ سر ہلاتے ہوئے گاڑی کی چابیاں ڈھونڈنے لگی۔

غزل بیگم جو شاپنگ کے لیے لور لور پھرنا شروع ہوئی تھیں تو مزنہ کو بری طرح تھکا مارا۔

”یار خدا کا واسطہ ہے جلدی میٹھو جو لینا ہے کرنا ہے جلدی کرو۔ کون سی خاص چیز ڈھونڈ رہی ہو؟

مل کے نہیں وے رہی۔“

وہ آخر میں تقریباً برس پڑی۔ غزل کسی اور طرف متوجہ تھی۔

”اے مزنہ! ذرا اس ہینڈ کم کی طرف دیکھو۔ یار یہ کیا غضب کا آدمی ہے۔ کیا ڈرینک ہے۔ او

چہرے پہ کیسی بے نیازی اور رعب دار ہے۔ میں تو گئی مزنہ۔۔۔!“

وہ اتنی دیر سے ایک ٹک ویکھ رہی تھی تو مجبوراً مزنہ کو بھی دیکھنا پڑا۔

دیکھتے ہی اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے۔

”مزنہ علی!“ اس کے لب بے آواز تھرک ہوئے تھے۔ وہ بھی اسے دیکھ چکا تھا۔

پھر وہ اچانک مڑا اور تیز تیز چلتا ہوا دوسرے بلازے میں کہیں غائب ہو گیا۔

غزل اپنی دنیا میں گم تھی وہ اس کے چہرے کا تغیر محسوس نہیں کر سکی تھی۔ مگر مزنہ کے لیے ایک قد

آگے اٹھنا دشوار ہو گیا تھا۔ وہ بمشکل ٹھہرتے ہوئے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔

اس کے قدم آگے اور ذہن پیچھے بہت پیچھے جا رہا تھا۔ وہاں جہاں ایک حماد اور ایک اسرئی

کرتے تھے۔

☆☆☆

”تمہاری خوشی کے لیے میں کیا کروں میری جان! کہو تو جان دے دوں۔“

حماد بہت دھکی ہو کر اسرئی کے گلابی رخساروں پر چپکتے موتی جیسے آنسوؤں کو پونچھ رہے تھے۔

”خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔“ اسرئی نے تڑپ کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔

”بس کہیں سے مجھے صبر لاؤں حماد! بہت بڑا خسارہ ہوا ہے میرا۔ مجھے قرآن نہیں آرہا ہے۔ دل کہ

بھی چہرے سے نہیں بہلتا حماد! میں کیا کروں۔ بتائیں کہاں جاؤں۔ یہ سونا آنگن، یہ دل وہلا دینے وا

خاموشی، یہ سرد و ساٹ دیواریں، یہ تنہائی، یہ سب مل کر میری جان لے لیں گے ایک دن۔ زندگی ہر را

ایک جیسی لگتی ہے۔ پھر ایک سی شائیں، ایک سی رائیں، میرا دل گھٹ جائے گا اس گہری کالی تنہائی میں۔

حماد اسے روتا دیکھ کر بری طرح بے چین ہو رہے تھے۔ وہ بہت محبت کرنے والے صابر و قانع

کے شوہر واقع ہوئے تھے، شادی کو نو سال بیت چکے تھے مگر آنگن ہنوز خالی تھا، اب تو امیدیں بھی

توڑتی جا رہی تھیں۔

”پھر اس کا ایک ہی حل نکلتا ہے اگر تم آمادہ ہو تو۔۔۔“ بہت سوچ سمجھ کر حماد نے اسرئی سے

موضوع پر بات کرنے کی ٹھانی تھی۔

”ہم کوئی بچہ گود لے لیتے ہیں۔“

”لے پاؤں۔۔۔“ ایک لمحے کو اسرئی کی سونی ممتا کی کوکھ سے ہوک سی اٹھی لیکن پھر اس نے خوا

سنیبال لیا۔

”افوہ، تھکا مارا ہے آپ کے لاڈلوں نے۔ حمزہ اپنا ہوم ورک نہیں کر رہا۔ اور مزہ صلحہ بعد کہ وہ ان کی کاپی پر اپنے گل بوٹے بنائیں گی۔ ابھی صرف دس ماہ کی ہیں اور کھٹنوں کے بل سسکتی ہیں حمزہ کے پاس پہنچ جاتی ہیں اور وہ کام چھوڑ کر اس سے کھیلنے میں مگن ہو جاتا ہے۔“

”ماشاء اللہ بہت پیار کرتا ہے اپنی بہن سے۔“ حماد محبت سے کہتے۔

”کس ماں کا بیٹا ہے۔“ اسری فخریہ کہتی اور حماد بے ساختہ قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

دونوں میاں بیوی نے بچوں کی تربیت اتنی اچھی کی تھی کہ لوگ رشک کرتے تھے۔ مزہ، حماد، تین کلاس پیچھے تھی مگر پڑھے دونوں ایک ہی اسکول سے تھے۔ دونوں نے ہمیشہ فرسٹ کلاس فر پوزیشن لی۔

بچوں کے باشعور ہونے پر اسری اور حماد نے انہیں یہ بتانے میں حرج نہیں سمجھا تھا کہ وہ ان حقیقی اولاد نہیں تھے بلکہ ایک ادارے سے لائے گئے تھے مگر تب تک مزہ اور حمزہ کی شخصیات اتنی مضبوط اور پراعتماد بنیادوں پر کھڑی ہو چکی تھیں کہ انہیں کوئی خاص جذباتی دھچکا نہیں لگا۔ تھوڑا سا دکھ اور جھو فطری تھی مگر بہر حال انہیں کسی شدید ذہنی توڑ پھوڑ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

”امی! حمزہ ایم ایس سی میں آگئی ہے۔ اب آپ اس کی شادی کی فکر کریں۔“ حمزہ کے انداز میں بڑے بھائیوں والی فکر مندی اور احساس ذمہ داری تھا۔ وہ ماسٹر مکمل کرنے کے بعد دو سال پہلے ایک بہت اچھی جگہ جاب حاصل کر چکا تھا۔ دونوں بچے جوان ہو کر ایسے گھرے تھے کہ دونوں میاں بیوی کی نظر اتار تے نہیں تھکتے تھے۔

”سچ پوچھو تو بیٹے! میرا دل ہی نہیں چاہتا اسے خود سے دور کرنے کو۔“ انہوں نے مزہ کے دلچسپ سراپے کو دیکھتے ہوئے اداسی سے کہا۔

”خبردار بھائی! چیننگ کرنے یا لگائی بھجائی کرنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ آپ مجھ سے تین سال بڑے ہیں اس لیے پہلے آپ کی ہوگی۔“

”خوانخواہ۔۔۔“ حمزہ نے ہمیشہ کی طرح اسے ستایا۔

”پہلے میں اپنی ہونے والی کے لیے میدان صاف کروں گا پھر لاؤں گا اس بیوٹی کو مین کو۔۔۔“

”اچھا امی! ایک کام کرتے ہیں۔ میرے ”ہونے والے“ کو آپ اس گھر میں رکھ لیں۔ اس طرح مجھے آپ سے دور بھی نہیں جانا پڑے گا اور۔۔۔“ حمزہ نے شرارت سے حمزہ کو دیکھا، ”اور لوگوں کی کوئی کے سینے پر مونگ ورنے کا موقع بھی مل جائے گا۔“

”شرم کرو، مشرقی لڑکیاں اپنے منہ سے اپنے ہونے والے کا نام نہیں لیتی ہیں۔“ حمزہ نے بہر کے لائے خوب صورت بالوں کو کھینچا تھا۔

”بھائی! پہلے بھابھی آئے گی سن لیجیے۔“ وہ لاڈ سے پیچھے سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے جگا ہوئی تھی کہ مسرعلی چلی آئیں۔

انہوں نے قدرے ناگواری سے یہ نظارہ دیکھا تھا مگر اس وقت کچھ نہیں بولیں۔

وہ ادھر ادھر ہوئے تو بہت حقیقی سے اسری کا گھبراؤ کیا۔ یہ کیا ماچس اور تیلی کا کھیل شروع کر رہا

نے اپنے گھر میں۔ اسری! میں تمہیں اتنا بے وقوف نہیں سمجھتی تھی۔“

”کیا ہوا بھابھی؟“ اسری خاک بھی نہ سمجھی تھی۔

”ابھی کیا کچھ اور ہونا باقی رہتا ہے؟ دیکھو تو دونوں کس طرح ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تھے۔ اؤ بیکی حال ہوتا ہے اور یہ لڑکی تو ہر وقت حمزہ کے کندھوں پر سوار رہتی ہے۔“ وہ برہمی سے بولیں۔

”تو کیا ہوا، وہ اس کا بھائی ہے۔ دونوں بھائی بہنوں والے لاڈ کرتے ہیں ایک دوسرے سے۔“

”خواتواہ خود کو اور دوسروں کو قریب نہ دو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ یہ دونوں حقیقی بہن بھائی نہیں۔“ وہ جھٹکا نہیں ہے۔“ وہ جھٹکا نہیں۔

”مگر یہ بات وہ نہیں جانتے۔ ان کے جذبات میں وہی پاکیزگی اور شدت ہے جو حقیقی بہنوں میں ہوتی ہے۔ پھر ہم بتا کر ان کے ذہن تباہ کیوں کریں۔“

”تمہیں چاہیے تھا شروع سے بتا دیتیں، بچے ذہنی طور پر تیار ہو جاتے۔ نہ بتا کر تم نے بہت ظلم کمایا۔“

”کچھ بھی سہی وہ ہیں تو ایک دوسرے کے نامحرم، شرعی اور اخلاقی طور پر ان میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔“

”احساسات کی بنیاد پر تم نے دونوں کو ایک رشتے میں باندھ دیا ہے۔“

”احساسات ہی تو سب کچھ ہوتے ہیں۔ جب احساسات پاکیزہ ہیں تو ہم ان میں آلودگی کیوں میں۔“

”بہر حال یہ بات غلط ہے۔ آج تو میں کہہ رہی ہوں کل کو پوری دنیا کہے گی جب انہیں حقیقت کا چلے گا۔“

وہ برہمی سے گویا تھیں۔

اسری کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔

اس کا رد عمل دیکھ کر مسرعلی کچھ نرم پڑ گئیں۔

”دیکھو اسری! میں تمہارے بھلے کوئی کہہ رہی ہوں۔ یہ بات میں بھی جانتی ہوں کہ دونوں میں

ایک بہنوں جیسا پیار ہے میں ان پر کوئی بہتان نہیں باندھ رہی، مگر یہ بھی ایک اہل حقیقت ہے کہ وہ بہن ایکی نہیں ہیں۔ کل کو جب ان کے رشتے کروڑوں اور ان لوگوں پر کبھی نہ کبھی یہ کھلے گا کہ یہ دونوں حقیقی بہن ایکی نہ ہوتے ہوئے بھی ایک ہی گھر میں اکٹھے لیے بڑھے اور ان میں آپس میں کوئی دیوار یا تکلف نہیں ہا تو ان کے ذہن کہاں کہاں تک نہیں پہنچیں گے۔ کوئی تسلیم کرے گا کہ وہ گئے بہن بھائی بن کر ساتھ ہے ہیں تمہیں یہ حقیقت بہت پہلے انہیں بتا دینی چاہیے تھی۔“

اسری سر اسیسکی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”مجھے تو یہ سوچ کے بھی تکلیف ہو رہی ہے کہ کل کلاں کو لوگ میرے اتنے نیک اور سیدھے ماوے بچوں کے بارے میں ایسی باتیں کریں گے۔ میں نے اس طرف تو وہاں تو نہیں دیا تھا۔ نہ کبھی مجھے خیال آیا نہ حماد کو کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ہم اپنی جگہ مطمئن تھے اور باخدا ہم نے تو انہیں بیٹا بیٹی سمجھ کے ہی پالا ہے۔ کبھی ایسے دیسے خیال نے ذہن کو نہیں چھوا۔“

یہ مل رہی ہیں جیسے سچ کچ کے بہن بھائی ہوں۔“
 پیچھے کھڑے حمزہ اور مزینہ کو جیسے سکتے ہو گیا تھا اور دو گرو کھڑے ان دونوں کو مشکوک نظروں سے
 دیکھتے تھے والے، حماد کی پیشانی پر چمکتے پسینے کے قطرے ان کی شدید گھبراہٹ اور بے بسی کی علامت
 تھے۔

☆☆☆

حمزہ تین دن سے لا پتا تھا۔
 مزینہ تین دن سے اپنے کمرے میں بند تھی۔
 حماد تین دن سے آفس نہیں گئے تھے۔

اور اسرئی تین دن سے جیل پیر کی لمبی کی طرح گھر میں یہاں سے وہاں چمک کاٹ رہی تھی۔
 ”پہلے ہم سمجھتے رہے ہم آپ کی اولاد ہیں، باشعور ہوئے تو پتا چلا ہم تو لے پا لک ہیں۔ ہم نے
 ن بات کو نظر انداز کر دیا کہ اس سے رشتے میں فرق نہیں پڑتا۔ پھر آج انکشاف ہو رہا ہے کہ ہم تو ایک
 ن باپ کی اولاد ہی نہیں ہیں۔ آپ دھوکا دیتے رہے ہمیں؟ تماشا دیکھتے رہے ہمارا۔ مجھے بتائیے آخر وہ
 لون سی مصلحت تھی جس نے آپ کو حقیقت بتانے سے روک رکھا؟“
 ”ہم تم دونوں کو دھکی نہیں دیکھ سکتے تھے بیٹا!“ اسرئی عاجز انداز میں گویا تھی۔

”دکھی۔۔۔ ہونہ۔۔۔“ وہ طنز اُبول۔ ”اور اب۔۔۔ اب تو جیسے ہم بہت سکون اور سکھ میں آگئے
 ہیں؟“ وہ پیر پختا جنونی انداز میں باہر نکل گیا۔
 تین دن بعد آیا مگر ایسے جیسے وہ کسی سرانے میں آیا ہو۔

اور جس دن وہ آیا اسی شام اسرئی کو دل کا شدید دورہ پڑا۔ وہ جانبر نہ ہو سکی اور اگلے تین دن بعد اس
 کی میت گھر میں پڑی تھی۔
 حماد آفس میں تھے جب انہیں اسرئی کے انتقال کی خبر ملی۔ گزشتہ دو دنوں سے وہ گھر میں رہے
 تھے۔ صرف آج کچھ ضروری فائلز دینے کے لیے آفس آئے تھے اور ان کے پیچھے موت کا فرشتہ اسرئی
 تک پہنچ گیا۔

وہ دیوانوں کی طرح گرتے پڑتے آفس سے نکلے تھے اور پھر کبھی گھر واپس نہ آ سکے۔ ایک بس تیز
 رفتاری کے عالم میں انہیں چلتی ہوئی زندگی سے بہت دور کر کے خود آگے بڑھ گئی تھی۔
 یوں وہ دونوں نئے سرے سے ”یتیم“ ہو گئے۔

”آپ کی وجہ سے ہوا یہ سب کچھ، صرف آپ کی وجہ سے۔“ مزینہ پاگلوں کی طرح حمزہ کو
 جھنجھوڑنے لگی۔

”میری، میری وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئیں۔“ حمزہ نے اسے زخمی نظروں سے
 دیکھا۔

”نہیں۔ کچھ میری بھی غلطی ہے کہ تین دن ان سے منہ موڑے ان کا دل توڑتی رہی اور بہت بڑا
 گناہ آپ سے سرزد ہوا ہے، آپ انہیں دھتکار کے ان کے جذبوں کو پٹل کے تین دن تک گھر سے غائب

”اسے حماقت ہی قرار دیا جاسکتا ہے کہ آپ ایک ساتھ دو مختلف گھرانوں کے بچے بہن بھائی بنا
 کراڈ اپٹ کر لیں۔ بہر حال ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم اور حماد بھائی طریقے سے دونوں بچوں کو حقیقت بتا دو
 تاکہ وہ احتیاط اور فاصلہ برقرار رکھیں۔“ اسرئی تڑپ کر رہ گئی۔
 ”میں مرنے جاؤں گی اس سے پہلے۔“ وہ تو یہ سوچ کے ہی لرز رہی تھی کہ وہ مزینہ اور حمزہ کو اس تلخ
 حقیقت سے کیسے آشنا کرے گی۔

”نہ صرف بتاؤ بلکہ دنیاوی مسائل سے حل کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم دونوں کی آپس میں شادی
 کر دو۔ نہ بیٹی کی جدائی برداشت کرنی پڑے گی نہ بیٹا کسی دوسری عورت کو سونپنا پڑے گا۔“
 ”خدا کے لیے، خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔“ اسرئی ہول کر رہ گئی۔

”بچے اپنی جان دے دیں گے۔ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اور حمزہ، حمزہ کو میں جانتی ہوں وہ بطور
 بھائی کے مزینہ سے اس قدر رانچے اور اتنا جذباتی ہے کہ یہ تجویز سننے ہی وہ خود کو گولی مار لے گا۔ میرے
 منہ میں خاک۔۔۔“ وہ کانپ کر رہ گئی تھی۔

”بہر حال اس مسئلے کا کوئی حل سوچو اس سے پہلے کہ بات باہر نکلے تم یہ قصہ بننا دو۔“ مسز علی مخلصانہ
 مشورہ دے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

محلے میں شادی تھی۔ سارا اہل محلہ مدعو تھا۔ اسرئی کی طبیعت پیچھے دو دنوں سے سخت خراب تھی اس
 لیے صرف حماد، حمزہ اور حمزہ وہاں گئے تھے۔ حسب معمول مزینہ اور حمزہ میں ملکی پھلکی چھیڑ چھاڑ ہو رہی
 تھی۔ دونوں میں اتنی ذہنی قربت اور یگانگت تھی کہ اپنا ہر احساس ایک دوسرے سے شیئر کیے بنا چین نہیں
 پڑتا تھا۔

”السلام علیکم۔۔۔ حضرت پہنچنا مجھے؟“
 ”شلوار قمیص پر و اسکت پہنے ایک باریش اور معزز شخص نے لوگوں کی بھیڑ میں حماد تک رسائی
 حاصل کی تھی۔

”اوہ معاف کیجیے گا، مجھے صحیح سے یاد نہیں آ رہا۔“
 ”کوئی بات نہیں۔ ہم صرف ایک دفعہ ملے ہیں اب تک، آپ کو ضرور میری صورت بھول گئی
 ہوگی، مگر حضرت میں آپ کو ہزاروں کے جمع میں بھی الگ پہچان سکتا ہوں۔ میں اس ادارے کا منتظم
 ہوں جہاں سے آپ دو بچے لائے تھے۔ یہ وہی بچے ہیں نا؟“

”جی۔ جی۔۔۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے۔“ حماد نے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے آہستگی سے
 سر ہلایا تھا۔

”بالکل ٹھیک۔۔۔ جناب میں تو اکثر آپ کی مثال دیتا ہوں کہ ایسے خدا ترس اور نیک نفس
 انسان بھی ہوتے ہیں۔ آئے تھے ایک بچہ لینے مگر دوسرا بچہ روتا ہوا دیکھا تو اس کا خاندان یا حیثیت پوچھے
 بغیر اس کو بھی ساتھ ہی گولے لیا۔ دونوں بچوں کے والدین کی روحمیں آپ سے بے پناہ خوش ہوں گی کہ
 آپ نے ان کے بچوں کو اتنے پیار سے رکھا۔ ویسے حیرت کی بات ہے دونوں بچوں کی شکلیں آپ میں

گھنے لگا ہے۔ میں باہر نکلتا ہوں تو لگتا ہے ہر آنکھ مجھ پر ہنس رہی ہے کہ یہ دیکھو جس نے اپنی بہن سے نکاح کر لیا۔ میں تم سے بہت دور چلا جانا چاہتا ہوں کیونکہ میں اس رشتے کے ساتھ تمہارا سامنا نہیں کر سکتا نہ ہی تم ایسا کر سکو گی۔ مجھے نہیں پتا میں کج کر رہا ہوں یا غلط، مگر میں فی الوقت فرار چاہتا ہوں۔ ان سب لوگوں سے اور جگہوں سے جو مجھ سے آشنا ہیں۔ شاید بھی لوٹ آؤں یا شاید کبھی نہ لوٹوں۔“

یہ وہ خط تھا جو مزنہ کو اس کے امریکہ فلائی کر جانے کے بعد ملا تھا۔

اس کے بعد پانچ سال تک ان میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

”جو کچھ ہوا اس میں قصور یا خواہش تو بہر حال میری بھی نہیں تھی۔ پھر تم حل نکالنے کی بجائے بیچ منجد ہار میں مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ بے سہارا کر کے یوں غائب ہوئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ یہ بھی نہ سوچا کہ ایک کمزور لڑکی معاشرے کے ان بے رحمانہ پیٹھروں سے کیونکر لڑے گی۔“

مزنہ آنسوؤں سے رو رہی تھی۔

رات کا چھلکا پھر تھا۔ گھور سا نا اور تاریکی، فقط اس کے آنسوؤں کے چراغ روشن تھے۔

”میں نے بھی تم سے یہ بندھن نہیں باندھنا چاہا تھا۔ میرے لیے بھی یہ موت سے برتر سزا تھی۔ تم نے تو اس سزا سے فرار کے لیے ملک بدل لیا۔ مگر میں کیا کرتی۔ میں تو کہیں کی بھی نہ رہی تھی۔ تم بزدل تھے حمزہ علی! اتنی جرات ہوتی تو ڈٹ کر یہ رشتہ جوڑنے سے انکار کر دیتے۔ معاشرہ بھلے جو مرضی کہتا رہتا۔ مگر تم ایسا نہ کر سکے۔ مجھے کاغذی چھت تو فراہم کر دی مگر عملی میدان میں میرا ساتھ دینے اور میری حفاظت کرنے کے بجائے آرام سے فرار ہو گئے۔ میرا کیا قصور تھا اس میں؟ میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ احساسات صرف تمہارے ہی مجروح نہیں ہوئے تھے۔ مجھ پر بھی اتنی ہی قیامت ٹوٹی تھی میں بھی نکاح کے فارم پہ سائن کر کے بارہا خود سے نفرت کی تھی۔ تمہارا سامنا کرنے کا سوچ کر ہزار مرتبہ جیتی مرتی تھی۔ مگر میں نے تو بہر حال میدان نہیں چھوڑا۔“

صبح کی اذانیں ہونا شروع ہوئیں تو وہ اپنے پراگندہ خیالات سمیٹ کر ہمتیں جوڑتے ہوئے وضو کے ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

علی انکل پر بڑا ستم ٹوٹا تھا۔

ان کی بہو اور پوتا سمندر کی سیر کے دوران بوٹ الٹ جانے کے باعث ڈوب کر ہلاک ہو گئے تھے۔

ان کا بیٹا عباس بیوی اور بیٹے کی لاش کے ساتھ دو بیٹیوں سمیت لٹا پٹا وطن واپس آیا تھا۔

مزنہ کو اطلاع ملی تو وہ ان کے دکھ کے احساس سے آبدیدہ ہو گئی۔

وہ دس دن تک باقاعدہ ان کے ہاں افسوس کے لیے جاتی رہی۔ بیٹے اور بیوی کی حادثاتی موت نے عباس بھائی کو پتھر بنادیا تھا۔ مزنہ ان کی دونوں بیٹیوں کو سہا ڈرا ہوا اور افسردہ دیکھتی تو اس کا دل کٹ کے رہ جاتا۔ بڑی بیٹی کی عمر چار سال اور چھوٹی کی تین سال تھی۔

علی انکل سے پتا چلا تھا کہ حمزہ بھی باقاعدگی سے آ رہا تھا۔ وہ پاکستان آچکا تھا اور انکل سے ملا بھی

تھا مگر ان کے اصرار کے باوجود وہ مزنہ کے گھر نہیں گیا تھا۔ اتفاق ایسا تھا کہ دونوں کا آئنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اور مزنہ نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا۔

☆☆☆

”میں کیا کروں۔۔۔؟“ بہت عرصے بعد غزل اپنا مصنوعی روپ اتار کر بے بسی وسادگی سے اس کے سامنے اپنا آپ کھولے بیٹھی تھی۔

”مجھے سکون نہیں ملتا، میرا ضمیر، میرے احساسات میری روح کا ہر تار مجھ پر کوڑے برساتا ہے۔ میں کتنی غلط ہو چکی ہوں، شاید میں بھی نہیں جانتی اس کی گہرائی کو۔ مجھے پاک ہونے کا طریقہ بتا دو مزنہ۔“ وہ ہار کر رو پڑی تھی۔

”اللہ سے رجوع کرو غزل! اس سے مانگو، وہ تمہیں سب کچھ دے گا دل کا سکون بھی اور روحانی پاکیزگی بھی۔“

”میں بہت دور جا چکی ہوں مزنہ! میں کیسے اس پاکیزگی تک پہنچ سکتی ہوں۔“ پچھتاوے کے ناگ اسے بری طرح ڈس رہے تھے۔ وہ بہت دنوں سے بڑی طرح بے چین تھی۔ اس کے اندر کوئی الاؤ بھڑک رہا تھا۔

پھر کچھ دن گزرے اور غزل اچانک لپٹا ہو گئی۔

”میرا خیال ہے وہ گیسٹ ہاؤس چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا چکی ہے کیونکہ وہ اپنی چیزیں بھی ساتھ لے جا چکی ہے۔“ ثنائے خیال ظاہر کیا تھا اور وہ کہاں گئی تھی یہ کبھی کچھ عرصے بعد معلوم ہو گیا۔

اس نے جسمانی طور پر معذور لاوارث بچوں کے ادارے میں جاب کر لی تھی۔ رہائش کی سہولت اسی ادارے میں موجود تھی اس لیے وہ خاموشی سے گیسٹ روم چھوڑ گئی تھی۔

☆☆☆

اس دن وہ علی انکل کے ہاں گئی تو انہیں کسی گہری سوچ میں ڈوبے پایا۔

”انکل! خیریت ہے۔ کس سوچ میں گم ہیں آپ؟“

اس نے ان کی نزدیکی کر سی سنبھالتے ہوئے دریافت کیا۔

”عباس کی چھوٹی چھوٹی بچیاں، ان کی دیکھ بھال، بچوں کو ماں چاہیے اور اس کے لیے عباس کو دوسری شادی بہر حال کرنی ہی پڑے گی۔ اس سلسلے میں تم کوئی مشورہ دو۔“

”میں کیا مشورہ دے سکتی ہوں انکل!“ وہ ہیکلی سی مسکراہٹ لیے گویا ہوئی۔

”کوئی مناسب رشتہ تلاش کرو۔ میرا خیال ہے تم یہ کام بہت اچھے طریقے سے کر سکتی ہو، تمہاری آئی کو تم جانتی ہو مسلسل بیماری کے باعث زیادہ کہیں آئی جانی نہیں۔“

”اور عباس بھائی، ان کی بھی تو کوئی مرضی ہوگی۔ وہ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟“

”اللہ کا شکر ہے، میرے بچے ماں باپ کے کہے کو مان دیتے ہیں۔ وہ ہمارا کہا نہیں ٹال سکے گا۔ تم بس اپنا کام کرو۔“ مزنہ نے سر ہلا دیا۔

اس کے ذہن میں ایک چہرہ آیا تھا۔

نے جان بوجھ کر دخل اندازی کی تھی۔

”نہ دور جاپاتا ہوں، نہ قریب آنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔“ وہ پیشانی مسلنے لگا۔

”خود بخود سمجھ میں آجائے گا۔ کچھ وقت دو ایک دوسرے کو اور فی الوقت یہ کرو کہ مزہ کو اس کے لیسٹ ہاؤس تک چھوڑ دو، اس کی گاڑی کی مجھے ضرورت ہے۔ میری کار کی بیٹری ڈاؤن ہے اسے کون ہلکے لگا کے اشارت کرے گا۔ میں شام کو تمہاری کار گیسٹ ہاؤس پہنچا دوں گا۔“ وہ مزہ سے مخاطب دے۔

کیا زبردست بہانہ ڈھونڈا تھا انہوں نے ان دونوں کی یکجائی کا۔

”آؤ بیٹھو۔۔۔“ حمزہ خاموشی سے اسے لے کر گاڑی تک آیا اور فرنٹ ڈور کھولا اس نے مزہ کی ریف ہیلی بار سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

اور جگر کے سفید کڑھائی والے سوٹ میں اس کی رنگت دمک رہی تھی۔ حسین تو وہ پہلے بھی بہت نمی مگر اب جیسے اس کے حسن کے سارے ہی رنگ کھل چکے تھے۔ ایک باوقار حسین عورت کے روپ میں وہ اس کے مقابل تھی۔

”کس طرف کو ہے گھر۔۔۔؟“ وہ گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔

”جب آپ ٹھکانہ جانتے ہیں تو پوچھ کیوں رہے ہیں؟“ وہ قدرے طنز سے جواب دے کر باہر نکلنے لگی۔

”آپ نے خواجہ زحمت کی۔ آپ کی خبر گیری یا بے خبری سے میری ذات پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔“

”مگر مجھ پر تو پڑتا تھا۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

مزہ نچلا ہونٹ واٹوں تلے پکڑتے ہوئے خاموشی سے باہر دیکھتی رہی۔

”پچھلے سال سے پاکستان میں ہوں، مگر ابھی تم سے سامنا کرنے اور حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے مجھے کچھ وقت چاہیے تھا اس لیے کتر اتار رہا۔“

وہ بہت آہستگی سے بول رہا تھا۔ نظریں وڈا اسکرین پر جمی ہوئی تھی۔

”تم کیسی ہو، کتنا عرصہ ہو گیا ہے تم سے کوئی بات کیے۔ کیا کیا اتنے سال؟“ اس کے لہجے میں نرمی اور اپنائیت تھی۔

مزہ کی آنکھوں میں آنسوؤں بڑبانے لگے۔

”جانے دیجیے، جو بیت گیا سو بیت گیا۔“ اس کا لہجہ گلو گیر تھا۔

”آپ نے ساتھ چھوڑ دیا تو کیا ہوا۔ اللہ نے مجھے آسرا دینا تھا سو وہ مشکل راستے آسان بناتا گیا۔“

”مجھے اب اپنے اس جذباتی فیصلے پر سخت شرمندگی ہو رہی ہے۔ کچھ بھی تھا مجھے تمہیں یوں تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ جو دمیر تھا، مجھ سے بڑھ کر تمہارا بھی تو تھا۔ امی اور بابا کی رحمتیں کتنا ترپتی ہوں گی تمہیں تنہا پا کر۔“ وہ کرب سے بولا۔

شنا کا چہرہ۔ اس میں ہر خوبی تھی۔ ماسوائے اس کے کہ وہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔ مگر عباس بھائی پہلے ہی صاحب اولاد تھے انہیں اولاد کی ضرورت نہیں تھی۔ ثنائان کے لیے بہترین جیون سٹائلی ثابت ہو سکتی تھی۔

”میں چلتی ہوں انکل!“ مزہ پرس سنبھال کر ابھی پلٹی، مگر پھر ٹھٹک کر وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔

گرے سفاری سوٹ میں ملبوس ہاتھ میں بریف کیس پکڑے آنکھوں میں عجیب سے کرب آمیز تاثرات لیے وہ حمزہ علی ہی تھا۔

”رک جاؤ دونوں یہیں۔ کیوں چوروں کی طرح صحنہ چھپا رہے ہو۔ کیا پڑا کے بھاگے ہو ایک دوسرے کا۔“ علی انکل اٹھ کر دونوں کے بیچ میں کھڑے ہو گئے اور سختی سے دونوں سے مخاطب ہوئے۔

دونوں کے سر جھکے ہوئے تھے اور نظریں اپنے جوتوں پر تھیں۔

”بلی چو ہے کا یہ کھیل آخر کب تک جاری رہے گا؟“ علی انکل کی سنجیدگی بدستور تھی۔

”برخوردار ہمارے زمانے میں ایک حویلی میں چار چار خاندان آباد ہوتے تھے۔ سب کے بچے بھی اکٹھے پل کے جوان ہوتے تھے۔ سب ایک دوسرے کے بہن بھائی ہی کہلاتے تھے اور وہی عزت اور محبت ہوتی تھی دل میں۔ بعد میں بزرگ پکڑ کے کسی کا جوڑ کسی سے ملا دیتے اور یوں وہ عزت و محبت از دو ابی رشتے میں بدل جاتی تھی۔ میں مانتا ہوں تمہارے معاملے میں کافی کچھ مختلف ہوا۔ جو بیس سال تک تم لوگ خود کو بہن بھائی سمجھتے رہے۔ پھر انکشاف ہوا کہ خون کا کوئی رشتہ بیچ میں کبھی تھا ہی نہیں۔

تم دونوں کا رد عمل قدرتی تھا۔ تمہارے بابا نے اور امی نے تمہیں معاشرتی دباؤ اور مسائل سے بچانے کے لیے مجبور کیا یہ تجویز کیا تھا کہ تمہیں ایک شرعی رشتے میں جوڑ دیا جائے تاکہ تم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہو۔ اس میں ایسا کیا غلط تھا جو اتنا شدید رد عمل ظاہر کیا کہ پانچ سال گوا دیے اور اس کے بعد بھی کوئی احساس نہیں جاگا؟“

حمزہ پیر کے انگوٹھے سے لان کی گھاس کر پید رہا تھا۔ مزہ بت بنی کھڑی تھی۔

”اور حمزہ! میں تمہیں اتنی فیصد تصور دار ٹھہراؤں گا کہ تم بجائے رشتے کو مضبوطی اور تحفظ فراہم کرنے کے یہاں سے فرار ہو گئے۔ اس بے چاری لڑکی کو معاشرے کے مسائل سے نپٹنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا۔ نیا رشتہ نہ بھاتے، پرانے رشتے کے ناتے جو تم پر اس کی معاشرتی و معاشی ضروریات اور تحفظ کا حق بننا تھا وہ تو پورا کرتے۔“

”میں شرمندہ ہوں۔۔۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

پانچ سال بعد مزہ نے اس کی آواز سنی تھی۔

”اگر شرمندہ ہو تو پھر باز آ جاؤ مزید وقت برباد کرنے سے اور یوں ذہنی عذاب سے گزرتے رہنے سے کیا حاصل ہے۔ نارمل انسانوں والی زندگی چو۔“

”مجھے اتنا عرصہ گزار کر بھی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں تمہارے ساتھ کس طرح زندگی کا آغاز کروں۔“ وہ بہت بھجا بھجا اور شکست خوردہ تھا۔

”تم کچھ مت کرو۔۔۔ زندگی کو خود موقوف دو کہ وہ تمہیں آغاز و انجام سے آگاہ کرے۔“ علی انکل

”چھوڑے، یہ بتائیے آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟“
 ”پہلے تو ہول میں وقت گزارتا رہا۔ پھر کچھ ماہ پہلے ایک گھر خریدا ہے۔ اپنے اور تمہارے لیے۔“
 ”مجھے ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس انتظام ہے گھر کا۔“ مزنہ نے فوری ردِ عمل ظاہر کیا۔
 ”یہ تو مجھے بھی پتا ہے، مگر تمہارا اصل ٹھکانہ تو وہ گھر ہی ہے جو میں تمہیں دوں گا۔ بہت کرلیئر
 حماقتیں۔ اب زندگی منطقی انداز میں گزرے گی۔ اور مزنہ! مجھے یقین ہے ہم ساتھ رہیں گے تو خود بخو
 سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہمارے درمیان نارمل رشتہ قائم ہو جائے گا۔ مگر مجھے
 یقین ہے ایک دن ہم نارمل لوگوں کی طرح جینا ضرور سیکھ لیں گے۔ بات تو ساری احساس کی ہوتی ہے۔“
 تا۔

اس نے آہستگی سے اس کی جانب مڑتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
 مزنہ کا جی بھرا آیا۔ بہت مدت بعد کسی کے شانے پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے کو دل چا
 تھا۔
 ”قصور نہ تمہارا تھا نہ میرا۔ قصور ہمارے والدین کا بھی نہیں تھا کہ انہوں نے نیک نیتی کے جذ
 کے تحت ہمیں ہمارے رشتے کی اصلیت سے آگاہ نہیں کیا۔ لیکن ایک بات اس سے ثابت ہو جاتی ہے کہ
 کسی بے اولاد میاں بیوی کو اپنے لے مالک بچوں پہ یہ ستم نہیں کرنا چاہیے۔ یا تو ایک ہی گھر کے دو ب
 لیں یا پھر صرف ایک بچہ لیں۔ دو مختلف گھرانوں کے بچوں کو بہن بھائی بنا کر یکجا کرنا اور دنیا کے سائے
 پیش کرنا بہت گہیہ اور بھیانک مسائل کا باعث بن جاتا ہے۔“
 حمزہ آہستگی سے کہہ رہا تھا۔

”کیا تم اب بھی مجھ سے ناراض ہو؟ رشتہ ضرور بدلا ہے مگر میں آج بھی تمہاری بہت کیئر کر
 ہوں۔ تم سے جو محبت اور وابستگی ہے اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ تم کیا کہتی ہو؟“ حمزہ نے اب
 ہاتھ کا دباؤ اس کے کندھے پر بڑھا دیا۔
 جواب میں مزنہ نے خاموشی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

